کودرا
پارسی فال کے اساطیری قلعہ میں گیارہ دن
شیعہ سنی مفاہمہ پر ایک تقلیب انگیز روداد
راشد شاز

گیارہ دنوں کا یہ سفرنامہ ہماری گیارہ صدیوں کی تاریخ سے مملو ہے۔
تیسری، چوتھی صدی ہجری میں امتِ واحدہ کی باقاعدہ تقسیم کا سانحہ پیش آیا۔ مسلمان شیعہ سنّی اسماعیلی اباضی جیسے طائفوں میں بٹ گئے۔ تب سے اب تک صدیاں گذریں، نہ جانے کیوں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اب قیامت تک اسی نظری خانہ جنگی کے ساتھ جینا ہے۔

یہ محض ایک خدائی انتظام ہے کہ بورل کے اساطیری قلعہ میں راوی کی ملاقات علی کودرا سے ہوتی ہے۔ کودرا ایک غیر معمولی شخصیت ہیں، انتہائی بیدار مغز اور دلِ پرسوز کے حامل۔ وہ بیک وقت شیعہ بھی ہیں اور سنّی بھی۔ ان کی اسکٹز وفرینک (schizophrenic) ذات میں بیک وقت مختلف شخصیتیں رہتی ہیں۔ وہ کبھی سنّی نقطۂ نظر کے وکیل بن جاتے ہیں اور کبھی 'اہلِ بیت' کی محبت میں سنّیوں کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات انہیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ان کی بائی پولر بلکہ ملٹی پولر شخصیت مختلف فرقہ وارانہ شناختوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ کودرا گہرے آدمی ہیں، بلا تکان سوچتے ہیں اور سچ پوچھئے تو اسی فکرِ مسلسل نے انھیں اسکٹز وفرینیا کے عارضے میں مبتلا کر دیا ہے۔

یہاں آپ کی ملاقات ان اصحاب سے بھی ہوتی ہے جو فی الاصل قلعہ میں موجود نہیں ہیں۔ شیعہ عالم شیخ حسن فولادی اور سنّی عالم شیخ الخذیفی کی نوک جھوک اور مناظرانہ گفتگو سے قاری کے قلب ونظر پر حیرت واستعجاب کے جھٹکے لگتے ہیں۔

بورل کی مجلسوں میں کبھی دل ڈوبتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب اصلاحِ احوال کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور کبھی تابناک مستقبل کی شاہراہ روشن دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ وتعبیر کی اتباع میں گیارہ صدیاں ضایع ہو گئیں اب تجربے نے بتا دیا ہے کہ وحی کی مشایعت کے بغیر ہم کامران نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران فرقہ وارانہ منافرت کی دیواریں گرتی معلوم ہوتی ہیں۔ شاید یہ پہلی تصنیف ہے جو شیعہ یا سنّی موقف کو احق ثابت کرنے کے بجائے دونوں ہی کو پوری شدت سے مسترد کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ فرقوں کی بقا دراصل اسلام کی موت ہے۔

راشد شاز ان چند مفکرین میں سے ہیں جنھیں مشرقی اور مغربی علوم کے راست مطالعہ کی توفیق اور مختلف تہذیبوں سے تعامل کا وافر موقع ملا ہے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عربی اور اسلامی علوم کے مطالعہ کے لیے وہ سوڈان گئے جہاں انھوں نے مرکز اسلامی افریقی (موجودہ بین الاقوامی افریقی یونیورسٹی) اور عربی زبان و ادب کی تعلیم کے عالمی ادارے المعہد العالی، خرطوم سے اکتساب فیض کیا۔

۱۹۸۷ء میں، اپنے ایامِ طالب علمی کے دوران، آپ نے ہندوستان میں احیائے اسلام کا منشور شائع کیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے منجمد فکری سمندر میں ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی۔ ۱۹۹۱ء میں عملی اقدام کے طور پر نئی دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کا ملک گیر کنونشن منعقد ہوا۔ ۱۹۹۳ء میں آپ نے ملی پارلیامنٹ کی بنا ڈالی جس کے مختلف اجلاس اور عوامی اجتماعات نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئے سیاسی رویے اور خود اعتمادی سے سرفراز کیا۔ ۱۹۹۴ء میں نئی دہلی سے ''ملی ٹائمز انٹرنیشنل'' کے اجراء کے بعد آپ مسلسل اس کی نگرانی کرتے رہے۔ ۲۰۰۴ء میں فکرِ اسلامی کے احیاء کے لیے آپ نے دو ماہی علمی مجلّہ فیوچر اسلام کا اجراء کیا جو بیک وقت انگریزی، اردو اور عربی زبانوں میں انٹرنیٹ پر شائع ہوتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں آپ نے بدلتی عالمی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کے لیے لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں انقلابی گروہوں کو خود احتسابی اور ایک نئی ابتداء کی دعوت دی۔ ۲۰۱۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر شپ کی پیشکش کی جسے آپ نے قبول کر لیا۔ اسی سال ایسیسکو نے انہیں اپنا خصوصی سفیر بھی نامزد کیا۔

ایک نئی مبنی برانصاف دنیا کے قیام کے لیے عالمی سطح پر ہونے والی مختلف جدوجہد اور بین الملی فورموں پر بھی آپ متحرک رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں آپ کے قلم سے اردو، عربی، انگریزی، ترکی اور ملائی زبانوں میں سیکڑوں چھوٹے بڑے مضامین اور کوئی چار درجن سے زائد کتابیں دہلی، لاہور، بیروت، لندن اور ریاض سے شائع ہو چکی ہیں۔

www.rashidshaz.com

سانحۂ قتل عثمان سے امت پر جس شبِ تاریک کی ابتداء ہوئی تھی شہادتِ حسین نے اس کی سیاہی میں مزید اضافہ کردیا۔ رہی سہی کسر تاریخی بیانیوں نے پوری کردی۔ تاریخ وتعبیر کی کتابوں میں گمراہ کن بیانات اس طرح سمودیئے گئے ہیں گویا یہ مذہبی کتابیں نہ ہوں بارود بھرے ہوئے خودکش اسلحے ہوں۔ جب تک دونوں فرقے زہریلے بیانات کو اپنے مذہبی ڈسکورس سے خارج نہیں کرتے اور جب تک خدا کی منزل کتاب متبعینِ محمدؐ کے لیے واحد حوالہ نہیں بنتی، اس امت پر ایک نئی صبح طلوع نہیں ہوسکتی۔

ISBN 978-93-81461-23-5

9 789381 461235

milli publications

کودرا

پارسی فال کے اساطیری قلعہ میں گیارہ دن

شیعہ - سنّی مفاہمہ کی ایک تقلیب انگیز روداد

شیعہ-سنّی مفاہمہ کی ایک تقلیب انگیز روداد

کودرا

پارسی فال کے اساطیری قلعہ میں گیارہ دن

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی

سال اشاعت ۲۰۱۸ء

Kodra (A Travelogue)
by
Rashid Shaz

نام کتاب : کودرا (شیعہ-سنّی مفاہمہ کی ایک تقلیب انگیز روداد)
مصنف : راشد شاز
صنف : سفرنامہ
قیمت : ۳۰۰ روپے
مطبع : گلوریس پرنٹرس، نئی دہلی

ISBN: 978-93-81461-23-5

ناشر
ملی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵
Tel:+91-11-26946246, 26945499
Fax: +91-11-26946246
Email: millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com
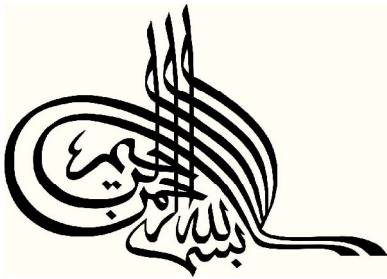
اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش!

تاکہ سند رہے

لستم پوخ کی طرح یہ سفرنامہ بھی حقیقی مشاہدات پر مبنی ہے البتہ طوالت سے بچنے کی خاطر بعض کرداروں کو بعض دوسرے کرداروں میں ضم کر دیا گیا ہے تا کہ ایک طویل بیانیے میں قاری کی توجہ محورِ گفتگو پر مرکوز رہ سکے، اور اس طرح بعض حقیقی شخصیات کی اصل شناخت کی پردہ داری کا راستہ بھی نکل آئے۔ میں نے اپنی بساط بھر اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اپنے مشاہدے کا لب لباب کچھ اس طرح بلا کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دوں کہ نہ حقائق مجروح ہوں اور نہ ہی کسی کی دل آزاری ہو۔

اس بیانیہ کا راوی نہ تو سنّی موقف کا ترجمان ہے اور نہ ہی شیعہ نقطۂ نظر کا وکیل۔ یہی وجہ ہے کہ اصحابِ نبیؐ کے ناموں کے ساتھ (رضی اللہ عنہ)ؓ یا (علیہ السلام)ؑ کی علامتوں کے استعمال سے قصداً احتراز کیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک علامت اظہارِ احترام سے کہیں زیادہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کا علامیہ بن کر رہ گئی ہے۔ ویسے بھی صدرِ اول میں اصحابِ رسولؐ کی عظمت ان کے شخصی ناموں سے ہی قائم تھی۔

۱

الاؤ

دریائے ڈراوا سے کوئی دوسوفٹ کی بلندی پر کاسل بورل کی فصیلوں تلے شام ڈھل چکی تھی۔ صدر دروازے کے عقب میں ایک عظیم الشان الاؤ روشن تھا۔ الاؤ کے چاروں طرف پتھر کے بڑے بڑے بنچ کچھ اس طرح ایستادہ تھے کہ ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ کوئی سوسوا سو لوگ جن میں خواتین بھی تھیں اور حضرات بھی، کالے بھی تھے اور گورے بھی، خداشناس بھی تھے اور دہریے بھی، گویا ایک مجموعۂ اضداد تھا جو الاؤ کے گرد جمع تھا۔ شام کی تاریکی اور خوشگوار ٹھنڈک میں ویران قلعہ کے اس پراسرار ماحول میں الاؤ کی روشنی جب حاضرین کے چہروں پر پڑتی اور ہوا کے کسی لطیف جھونکے کے سبب سنہری روشنی کی شعاعیں اچانک بڑھ جاتیں تو ایسا لگتا کہ ان کے چہروں پر کوئی آسمانی نور سایہ فگن ہو گیا ہو۔ گوشت پوست کے یہ عام انسان گویا تقدس کے ہالے میں گھِر گئے ہوں۔ شرکاء کی شان بھی نرالی تھی۔ کوئی سازندوں اور ڈھول باجے کے ساتھ آیا تھا بعض لوگوں کے ہاتھوں میں مائکروفون تھے بعضوں نے اپنی بغلوں میں کتابیں دبا رکھی تھیں، کوئی اس خیال سے کمبل اٹھالا یا تھا کہ مبادا شام ڈھلے ٹھنڈک میں اضافہ ہو جائے۔ خبر گرم تھی کہ آج الاؤ کے گرد وہ کہانیاں سنی جائیں گی جن کو موجودہ نظام جبر نے ہماری زندگیوں سے بے دخل کر دیا ہے اور جس کے سبب آج ہم خود کو ایک بے کیف زندگی کے عذاب میں مبتلا پاتے ہیں۔

وہ بھی کیا دن تھے جب زندگی لطف وانبساط سے معمور تھی۔ ایسا لگتا جیسے زندگی کسی تقریب مسلسل کا نام ہو۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا اس کے مختلف پڑاؤ ہوں جہاں زندگی دم لینے اور ستانے کو ایک لمحہ کے لیے رکتی ہو اور پھر اس کی جلوہ نمائیوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو جاتا ہو۔ تب بچپن کے سفاکانہ قتل کے لیے جدید طرز کے اسکولوں کی ترکیب ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ فطرت خود ایک درسگاہ تھی جہاں تعلیم وتعلم کا سلسلہ کیف وانبساط سے

معمور تھا۔ جوانی کریئر کی فکر میں روندی نہیں جاتی تھی اور نہ ہی بڑھاپا اس عذاب سے عبارت تھا کہ اس کے خاتمے کے لیے اولڈ ہوم میں زندگی کے دن گنے جائیں۔ تب ٹیکس کی جبری مشین اور یوٹیلیٹی بل کی ادائیگی کا لامتناہی سلسلہ فرد کے لیے وظیفۂ حیات قرار نہیں پایا تھا۔ رزق کا حصول ہمہ وقتی وظیفۂ زندگی نہیں بنا تھا اور نہ ہی عالمی سرمایہ داروں کا وہ طبقہ پیدا ہوا تھا جو فرد کی معصوم زندگی کو پرفریب ترغیب و ترہیب کے ذریعہ محض چند ملین ڈالر میں خرید لے اور یہ سب کچھ اتنی ماہرانہ عیاری کے ساتھ انجام پائے کہ فرد کو اس بات کا احساس بھی نہ ہو کہ چند ملین ڈالر اور مختلف قسم کی انشورنس کی ضمانت کے عوض اس نے جس چیز کا سودا کیا ہے وہ ایک انمول زندگی تھی جو اسے صرف ایک بار جینے کو ملی تھی۔ کتنی سفاک ہے یہ سوداگری جس نے دنیا کے باسیوں سے ان کی زندگی کی معنویت اور لطف و انبساط چھین کر انہیں ایک تعذیب مسلسل سے دوچار کر رکھا ہے۔

آج جب سرِ شام الاؤ روشن ہوا اور آبادی سے دور فطرت کی خاموشی میں نظامِ جبر کے باغی الاؤ کے گرد جمع ہونے لگے تو ایک لمحہ کو ایسا لگا جیسے زندگی اپنی تمام تر فطری معنویت کے ساتھ ایک بار پھر سے جی اٹھی ہو اور اسی دوران جب بربط سے اٹھنے والی موسیقی کی ترنگ کے ساتھ مغنیہ نے انقلاب انگیز نغموں کی لے چھیڑی اور پس منظر میں کہنے والے نے یہ صدا بلند کی کہ لوگو! نوکری کی امید میں طویل قطاروں میں لگے رہنا یا ترقی پانے کی موہوم امیدوں میں انتظار کیے جانا نظام جبر کا پرفریب ہتھکنڈہ ہے۔ جب تک تم ان قطاروں کو توڑ کر باہر نہیں نکلتے تمہاری دنیا تمہیں واپس نہیں مل سکتی۔

Poor people gonna rise up
And get their share
Poor people gonna rise up
And take what's theirs

آج اس نغمۂ انقلاب کو سن کر ساٹھ کی دہائی کا وہ مشہور انقلابی نغمہ بے ساختہ یاد آیا جس میں شاعر مضطرب بار بار یہ کہتا ہے کہ

Stop the world I want to get off

تب بھی اہل فکر کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جو لوگ موجودہ دنیا کے طور طریقوں سے نالاں ہیں وہ اگر اسے روک کر اتر بھی جائیں تو جائیں کہاں؟

مغرب کی یہ بے کیف زندگی نظام جبر کے ہاتھوں فرد کی یہ بے بسی اور زندگی جینے کے دوسرے تمام

تر متبادل کے غیاب کا عمل، یہ سب کچھ ابھی اس شدت کے ساتھ مشرق اور خاص طور پر عالم اسلام کے شہروں میں محسوس نہیں ہوتا۔ تیل کی دولت کے سبب ہمارے ہاں بے کیف زندگی کے کچھ جزیرے تو ضرور ابھرے ہیں مثلاً دبئی کے چھوٹے سے شہر کو لیجئے جہاں فلک بوس عمارتوں کی مصنوعی چمک دمک کے ذریعہ ہمارے ملی زوال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بے کیف زندگی کے یہ فلک بوس مظاہر عالم اسلام کے دوسرے علاقوں میں بھی طلوع ہوئے ہیں۔ البتہ عمومی طور پر ابھی مشرق کے وسیع تر علاقوں میں ٹیکس کی جبری مشین کا شکنجہ اس قدر سخت نہیں ہوا ہے۔ گویا بے کیف میکانیکی زندگی ابھی ہم مشرقیوں پر اس طرح مسلط نہیں ہوئی ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ مشرق میں اس اسپیس کا احساس ہونے کے باوجود گذشتہ تیس چالیس سالوں میں مسلم علماء ودانشور مغربی ممالک کی طرف ہجرت کرتے رہے ہیں۔ اور آخر کیا وجہ ہے کہ عالم اسلام کے مختلف شہروں میں وسائل کی فراوانی اور جدید سہولتوں کی فراہمی کے باوجود زندگی کی وہ ترنگ دل و دماغ کی وہ بلندی اور عزائم کی وہ رفعت صدیوں سے غائب ہے۔ اہل مشرق نئے خیالات، نئی ایجادات، نئی ٹیکنالوجی اور نئے آئیڈیالوجی کے حصول کے لیے ایک عرصہ سے مسلسل مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خلاقانہ غور وفکر، ایجاد واختراع اور تسخیر و اکتشاف کا سوتا جو کبھی ہمارے باطن سے پھوٹتا تھا، مدت سے خشک چلا آتا ہے۔

میں نے علی کودرا سے پوچھا: آخر ہماری اس بے کیفی کا سبب کیا ہے؟ مغرب اگر آج سرمایہ داری کے خرابے میں تبدیل ہو گیا ہے تو ہمارے ہاں تو کم از کم ایسا نہیں ہے۔ پھر عالم اسلام کے شہروں میں زندگی کسی قدر بے سمت اور خوابیدہ سی کیوں لگتی ہے؟ حریت فکر ونظر کا ماحول کیوں مفقود ہے؟ ستاون ملکوں پر مشتمل عالم اسلام ایک مجموعۂ اضداد کیوں ہے؟ قومی شناختیں اور قومی سرحدیں باہم برسرِ پیکار کیوں ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فطری اور افرادی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود عالم اسلام مسلسل روبہ زوال کیوں ہے؟

علی کودرا نے الاؤ کی طرف دیکھا، پھر ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کیں، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں، پھر کسی قدر مولویانہ اعتماد کے ساتھ بولے: 'ہم کبھی نہیں اٹھ سکتے، بخدا ہم کبھی نہیں اٹھ سکتے۔ یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا۔ تم دیکھنا مغرب اپنے تمام تر تضادات کے ساتھ روشن رہے گا اور عالم اسلام ایک خلفشار کی زد میں ہوگا۔ لوگ موہوم سکون کی تلاش میں مغرب کی طرف دیکھیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ سرمایہ داری کے زوال کے سبب مغرب اب زیادہ دنوں تک جائے پناہ نہیں رہ سکے گا، لیکن یہ جو تمہارا خیال ہے کہ اس عالمی بحران میں عالم اسلام کوئی اہم رول ادا کر سکتا ہے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے'۔

'آخر اس مایوسی کا سبب کیا ہے؟' میں نے علی کودرا سے وضاحت چاہی۔
کہنے لگے ہماری ملی شخصیت دیمک زدہ ہے۔ ایک وہن ہے جو صدیوں سے ہمیں اندر سے اس طرح چاٹتا رہا ہے کہ ہم اب ایک خالی ڈھانچہ رہ گئے ہیں۔ ظاہری آرائش وزیبائش کی کوئی کوشش اس لیے کارگر نہیں ہوتی کہ یہ وہن جو صدیوں سے ہمارے اندرون میں پرورش پاتا رہا ہے اب اس قدر توانا ہوگیا ہے کہ ایک غیر روایتی طریقۂ علاج کے بغیر اس سے نجات ممکن نہیں۔ اور بدقسمتی سے اس غیر روایتی علاج کے لیے ہم عقلی، علمی اور نفسیاتی طور پر خود کو آمادہ نہیں پاتے۔

علی کودرا کا اشارہ تو میں سمجھ گیا لیکن مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا کہ زوال امت مسلمہ کا دائمی مقدر ہے جس سے نجات کی تمام راہیں مسدود کردی گئی ہیں سو میں نے گفتگو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھی۔

الاؤ کی روشنی اب مدھم ہوتی جارہی تھی۔ جابجا مشعلیں روشن کردی گئی تھیں۔ ڈنر شروع ہو چکا تھا۔ میں سوپ کا پیالہ لیے بنچ پر بیٹھا ہی چاہتا تھا کہ میہا یوجنک نے مجھے آلیا۔ میہا یوں تو موسیقی کے آدمی ہیں، وہ جب اپنی نے کو کام پر لگاتے ہیں تو ایک دنیا ان کے ساتھ حرکت کرتی ہے، سامعین کے قلوب ان کی مٹھی میں ہوتے ہیں۔ البتہ موسیقی کے علاوہ سماجی مسائل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ ہر تاریخی حادثہ کو علامت اور استعارہ کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی موسیقی مغرب کی بے کیف زندگی میں لطف وانبساط کی آخری امید ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو انسان اپنے باطن میں دم توڑ دے۔

چھوٹتے ہی کہنے لگے: 'میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ مشرق کی انبساط انگیز زندگی مغربیوں کے ہاتھوں انیسویں صدی میں اچانک اس طرح کیسے روندی گئی'۔ پھر بولے: میں جب بھی سلطنت مغلیہ کے زوال پر غور کرتا ہوں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں کے ہاتھوں اس عظیم الشان سلطنت کا چراغ کیسے گُل ہوا؟ صفوی سلطنت کیسے پارہ پارہ ہوئی اور عثمانی ترک جو سترہویں صدی کے آخر تک ویانا کا محاصرہ کرلیا کرتے تھے، اچانک ایک عبرتناک انتشار کا شکار کیسے ہوگئے؟

'بلقان کا یہ علاقہ بھی تو کبھی ترک ریاست کا حصہ رہا ہے گویا آپ بھی اس تاریخی رزمیہ کا تسلسل ہیں، عروج وزوال کی اس داستانِ عبرت کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟'

کہنے لگے: میں نے معاشی تاریخ کا جتنا بھی مطالعہ کیا مجھ پر یہ بات واضح ہوتی گئی کہ دہلی سے استنبول تک عالم اسلام کا بیک جنبش دھڑام سے نیچے آرہنا محض اقتصادی بحران کے سبب نہیں تھا۔ گو کہ یورپ

میں صنعتی انقلاب کے سبب مصنوعات کی ریل پیل ہورہی تھی لیکن مشرق میں اقتصادی سرگرمیاں ٹھنڈی نہ ہوئی تھیں۔ پھر خام مال بھی مشرق ہی میں موجود تھا۔ اب ہوا یہ کہ عالم اسلام کی یہ تمام ریاستیں اپنے داخلی نفاق کے سبب معمولی وقتی منفعت کے لالچ میں غیرملکی تاجروں کو قبول کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ اگر محض اقتصادی اعتبار سے دیکھا جائے تو عالم اسلام کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس معاشی یلغار کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ یہاں ٹکنالوجی موجود تھی، مشینیں بھی بن سکتی تھیں لیکن اس عمل سے بہت سے ہاتھ کام سے محروم رہ جاتے، سو یوروپ کے صنعتی انقلاب کے مقابلے کے لیے یورپی ماڈل کے اتباع کی ضرورت نہ تھی۔ فارس ہو یا ہندوستان یا خلافت عثمانی کا وسیع وعریض علاقہ، زندگی یہاں باغ و بہار تھی۔ ہاں ایک چیز محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ایجاد واختراع اور تسخیر واکتشاف کی سرگرمی سولھویں صدی کے بعد کچھ سرد پڑ گئی تھی۔ دوسری طرف یوروپ ہر لحظہ تسخیر واکتشاف کی نئی تجلیوں کی زد میں تھا لیکن مٹھی بھر قوم ایک بھری پُری تہذیب کو اچانک اس طرح روند دے کہ اس کا تار و پود بکھر جائے، اس شکست کی جڑیں کہیں اور بہت گہری ہوں گی۔ میں تخصیص کے ساتھ تو یہ نہیں بتا سکتا کہ پانی مرتا کہاں ہے لیکن کہیں نہ کہیں کوئی بات ہے ضرور۔

الاؤ کی تپش اب خاصی مدھم ہوچکی تھی، لوگ منتشر ہونے لگے تھے، میرے پیالے کا سوپ بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے میہا یوجنک سے اجازت لی اور اپنی قیام گاہ کی طرف چل پڑا۔ سوچتا رہا کہیں کچھ تو ہے جس کے سبب صدیوں سے آخری نبیؐ کی امت کا شیرازہ منتشر ہے، اصلاحِ احوال کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ کوئی نئی تحریک برگ وبار لانے سے پہلے ہی، ایسا لگتا ہے جیسے اپنے آپ میں ٹھٹھر کے رہ جاتی ہو۔ میں ہندوستان میں اپنے مطالعے کی میز پر ادراک کی تیسری جلد کا مسودہ ادھورا چھوڑ کر آیا تھا۔ وہاں بھی میرے سامنے یہی مسئلہ درپیش رہا تھا کہ اس حادثہ فاجعہ کو کیا نام دیا جائے۔ کوئی گڑبڑی، کہیں کچھ کھوئے جانے کا احساس، اس کتاب کی تصنیف کے دوران، بار بار ایسا لگتا جیسے گرفت میں آنے سے رہ جاتی ہو۔ میہا کی گفتگو بھی اسی حادثے کی طرف اشارہ کررہی تھی جسے گرفت میں لانا میرے لئے گو کہ مشکل تھا البتہ ہمارے واعظین اسے بڑی آسانی اور بڑے وثوق سے بیان کر دیتے ہیں اور ان کی باتیں صداقت سے یکسر خالی بھی نہیں ہوتیں۔

'یہ سب کچھ دین سے ہماری دوری کے سبب ہے۔' میں نے بارہا درس وارشاد کی مجلسوں میں اور مسجد کے منبروں سے اس قسم کے بیانات سنے، لیکن جب اس کی مزید تفصیلات میں نکلا تو میرے نتائج روایتی

علماء اور سکّہ بند دانشوروں سے الگ ہو گئے۔ روایتی علماء کے نزدیک ہمارے زوال کا علاج یہ ہے کہ رسومِ دینداری پر سختی کے ساتھ کاربند ہوا جائے، سنت کے مظاہر ہماری زندگی میں چلتے پھرتے نظر آئیں، مذہبی جلسے، دعوت وتبلیغ کی سرگرمیاں اور وعظ وارشاد کی مجلسوں کا احیاء ہو۔ بیسویں صدی میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو ایک حیاتِ نو سے سرفراز کیا ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ کھوئے جانے کا احساس ہلکا نہیں ہوتا۔

ان ہی خیالات کا ہجوم لیے میں کاسل بورل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ قلعہ کے اندرونی احاطے میں جابجا طاقوں میں قدیم انداز کی شمعیں روشن تھیں۔ تاریک رات میں شمع کی جھلملاتی روشنی ایک طرح کی سریت لیے ہوئی تھی۔ میرا قیام بالائی منزل پر تھا۔ راہدری سے گزرتے اور زینہ سے اوپر چڑھتے ہوئے کبھی کسی خوابیدہ پرندے کے جاگ جانے اور اس کے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سے ماحول میں وحشت پیدا ہو جاتی تھی اور پھر اچانک ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہو۔ کاسل کے مختلف کمروں میں میری ہی طرح دوسرے مہمان بھی قیام پذیر تھے جن کی آمدورفت سے کاسل کی خاموش فضا میں ایک وقتی ارتعاش سا پیدا ہوتا اور پھر اگلے لمحہ ماحول پر مکمل سکوت طاری ہو جاتا۔ میں نے اپنی خواب گاہ میں شمع روشن کی۔ دریائے ڈراوا کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے پردہ ہٹایا لیکن باہر سخت تاریکی کے سبب کچھ نظر نہ آیا۔ جی چاہا کہ کھڑکی کے پٹ کھول دوں لیکن اس خیال سے کہ مبادا اس کھٹ پٹ سے پرندے جاگ اٹھیں اور کمرے میں ان کی یلغار کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دے، تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونے کے خیال کو ترک کر دیا۔ بستر پر لیٹے ہوئے بار بار یہ خیال آیا کہ پارسی فال کے اس ہزار سالہ پرانے قلعہ میں زندگی کتنی پراسرار لگتی ہے، فطرت سے مربوط اور کیف وانبساط سے معمور۔ جب سے زندگی کی سریت جاتی رہی زندگی جینا فی نفسہٖ ایک کام بن گیا بلکہ بہتوں کے لیے اس کی حیثیت ایک بے گار سے کم نہیں البتہ وہ سرالاسرار جس کی طرف میہا نے اشارہ کیا اور جو خود میرے اپنے تحلیل وتجزے کے دوران ہاتھ آتے آتے رہ جاتا ہے اسے میں علمی زبان میں کیسے بیان کروں۔ مبادا کسی over simplification کا شکار ہو جاؤں یا ایک reductionist منہج میں گرفتار ہو کر اپنی منزل کھوٹی کر لوں۔ خیال آیا کہ میہا یوجنک تو ہمارے نظری اور فکری سرمایے سے ناواقف ہیں، ان کا تجزیہ تاریخی اور معاشی امور تک محدود ہے لیکن علی کودرا کیوں امت مسلمہ کے مستقبل سے اس قدر مایوس بلکہ حواس باختہ دکھائی دیتے ہیں۔

۲

اللہ کی رسّی

دوسرے دن میرے ذمہ کوئی پروگرام نہ تھا کہ آج مختلف قسم کے متبادل workshops منعقد ہونے تھے۔ میں نے اپنی نوٹ بک اور ضروری کاغذات اٹھائے اور غور وفکر کے خیال سے صدر دروازے کے باہر قلعہ کی فصیلوں سے قدرے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے ایستادہ پتھر پر جا بیٹھا۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کچھ دیر دور خلا میں گھورتا رہا۔ وہ سرالاسرار میرے تعاقب میں تھا۔ ہمارا زوال کیونکر ہوا، جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو کوئی علاج کارگر نہیں ہوسکتا۔ ابھی میں اسی سوال کے تعاقب میں حیرتی بنا دور فضا میں دیکھ رہا تھا کہ اچانک کلک کی سی آواز آئی اور میرا ارتکاز درہم برہم ہو گیا۔

وہ مارلن وارنر تھی جس نے ہاتھوں میں کیمرہ تھام رکھا تھا، مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ معاف کیجئے گا میں آپ کے غور وفکر میں مخل ہوئی، آپ کو اس طرح تنہا غور وفکر میں ڈوبا دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس نیچرل پوز کو کیمرے میں محفوظ کر لیا جائے۔ کیمرے کے سامنے عمداً آپ خود کو خواہ کتنے ہی نیچرل طریقے سے کیوں نہ پیش کریں، وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ میں آپ کو یہ تصویر ضرور بھیجوں گی۔ اور ہاں آج آپ ورک شاپ میں نہیں گئے، میں وہیں سے آ رہی ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ستاروں کی گردش، ان کے مختلف خیالی برجوں میں داخلے کی ساعت اور مختلف قسم کے زائچوں اور Tarrot card کی مدد سے کائنات کی کوئی واقعی تفہیم ممکن ہے، میں نے ایلن کا بہت نام سن رکھا تھا، اسکینڈے نیویائی ممالک میں ان کا بڑا شہرہ ہے، امید تھی کہ کائنات کی سریت سے کوئی پرت یہاں اٹھے گی، معانی کی کوئی نئی دنیا منکشف ہوگی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، لوگ ایک دائرے میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا، آنکھیں بند کر لیں، پھر ان سے یہ کہا گیا کہ وہ تصور کریں کہ آسمان سے ایک رسی رفتہ رفتہ زمین کی طرف اتر رہی ہے۔ اس کا ایک سرا

آسمان میں اور دوسرا سرا ان کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ اب وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ چند لمحے میں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خدائی رابطے میں آ گئے ہوں۔ خبردار! ہوشیار! کہ کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے۔ آنکھیں بظاہر بند اور بباطن ملائے اعلیٰ میں کھلی ہوں۔ تصور کیجیے کہ ایک آسمانی نور نے آپ کو ایک حصار میں لے رکھا ہے۔ اب اس رسی کو اسی طرح تھامے رہیں۔ چند لمحے تک ہال میں مکمل خاموشی رہی۔ پھر ٹیرٹ ماسٹر نے ایک عارفانہ صدا بلند کی: connected۔ پتا نہیں یہ سوال تھا یا حاضرین کے آسمانی رابطے کی توثیق۔ لوگوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے تو یہ سب کچھ ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوا لیکن بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ ان کے باطن میں ایک لمحہ کے لیے کوئی چیز اتری تھی۔ وہ بالکل رابطے میں آ گئے تھے۔ یہ کہتے ہوئے مارلن نے قہقہہ بلند کیا اور میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

مارلن ایک آئرش نژاد کینیڈین شہری ہیں جو ریڈیو فری یوروپ کے لیے کام کرتی ہیں۔ قیام امن کی تحریکوں سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ بوسینیا میں مسلمانوں کے قتل عام کے موقع پر بھی یہ بڑی متحرک رہی ہیں اور میری ان سے پہلی ملاقات بھی ہیگ میں کسی ایسے ہی جلسے میں ہوئی تھی۔ ان کی آواز میں بلا کا ارتعاش ہے۔ ایک مسحور کن بلکہ مرعوب کن لہجہ میں الفاظ کے خاص زیر و بم کے ساتھ جب وہ گفتگو کرتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ ریڈیو پر پروگرام دے رہی ہوں۔ اب جو انہوں نے ورک شاپ کی رپورٹ اپنے خاص انداز سے سنائی تو اندازہ ہو گیا کہ ٹیرٹ ماسٹر نے مضطرب روحوں کی تسکین کے لیے کیسے کیسے نسخے آزمائے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ قبالائی تصوف ہو یا ٹیرٹ کارڈ کے ذریعہ مستقبل شناسی کی کوشش یا آسمان سے نازل ہونے والی اس مفروضہ رسی کو تھام لینے کی باتیں، یہ سب دراصل ہم انسانوں کے اضطراب کا غماض ہے۔ بے کیف زندگی کے ویرانے میں اگر سمت اور معنویت کا احساس جاتا رہے تو انسان کے لیے تصوف ایک آخری پناہ گاہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ مختلف ناموں سے تو ہم کا یہ کاروبار جاری ہے۔

کہنے لگی کہ میں جن دنوں بوسنیائی جنگ کو کور کر رہی تھی بوسنیائی مہاجرین کے مختلف کیمپوں میں میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہاں ریلیف کے اسباب کے ساتھ عرب ملکوں سے جو ٹیم آتی ان میں بعض مشائخ بھی ہوتے جو مہاجرین کے کیمپ میں ان کی ہمت بندھانے کے خیال سے تقریریں کرتے۔ اسلام پر عمل پیرا رہنے کی ترغیب دلاتے اور خاص طور پر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی تلقین کرتے۔ تو کیا ٹیرٹ ماسٹر کی اس خیالی رسی کا اللہ کی رسی سے بھی کوئی تعلق ہے؟

مارلن کے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے کہاں کی بات کہاں سے ملا دی۔ کہاں حبل اللہ المتین اور کہاں روحانیوں کی خیالی رسی جس کے نزول کا تجربہ صرف ان کے حصے میں آتا ہے جو ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔

مارلن! ہمارے علماء اپنی تقریروں میں جس خدا کی رسی کا تذکرہ کرتے ہیں اور جس کے تھامے رہنے کی ہمیں تلقین کی گئی ہے اس سے مراد خدا کا لازوال پیغام ہے، توحید خالص کی دعوت ہے جو شرق وغرب اور شمال وجنوب کے انسانوں کو ایک عالمی برادری میں مربوط کر دیتی ہے۔ انسانوں کے مابین رنگ ونسل کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور پھر ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے، یا کم از کم آ سکتا ہے، جہاں تمام خلقِ خدا بلا کسی تفریقِ رنگ ونسل خود کو عیال اللہ محسوس کر سکے۔ بس یوں سمجھو کہ کتاب اللہ هو حبل الممدود من السماء الی الارض۔

میرا جواب سن کر مارلن کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک پیدا ہوئی۔ کہنے لگی: ''اوہ! آئی سی'' اب میں سمجھی کہ اللہ کی رسی قرآن کی اصطلاح ہے، یہ ایک unifying force ہے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی، حالانکہ میں مسلمانوں کے درمیان خاصی چلی پھری ہوں۔ میرا بچپن لبنان میں گذرا۔ میں نے جنگ بلقان کو سمجھنے کے لیے ترکوں کی تاریخ کا کسی قدر تفصیلی مطالعہ بھی کیا، کل آپ کی گفتگو میں بھی یہ بات بڑی تفصیل سے آئی کہ اسلام نے اپنی آمد کے بعد کس طرح ملیشیا سے لے کر مراقش تک بلکہ ساحل کے اس پار اندلس اور اس کے زیر اثر یوروپی خطے کو ایک عالمی تہذیب میں مربوط کر دیا تھا۔ اس طرح مختلف تہذیبوں کی جمع پونجی بنی نوع انسان کا مشترکہ تجربہ بنی۔ ہند وفارس کے علوم وفنون اور ٹکنالوجی حتی کہ پھل اور باغات بھی سسلی اور اندلس کے علاقوں میں پہنچ گئے۔ اور تہذیب کی یہ نموفطرت کی تباہی اور ماحولیات کی خرابی کے بغیر جاری رہی۔ میں آج بھی جب دریائے دجلہ پہ لگی آبی اور ہوائی پن چکیوں کو متصور کرتی ہوں کہ کس طرح پانی کے فطری بہاؤ سے نوریہ کی تکنیک کے ذریعہ دریا کا پانی میل ہا میل کی بالائی زمینوں کو مستقل سیراب کرتا رہتا تھا تو مجھے اس تہذیب کی تابانی پر بے پناہ پیار آتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تہذیب کا اتنا توانا ماڈل جو نظامِ کائنات کے فطری نظام سے ہم آہنگی پر تشکیل دیا گیا تھا، آخر اچانک کیوں انتشار کا شکار ہو گیا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ مسلمانوں کے ہاں بھی خدا کی وہ رسی بس ہاتھ آتے آتے رہ گئی ہے؟' یہ کہتے ہوئے مارلن اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ٹیرٹ ماسٹر کی خیالی رسی پر جو قہقہہ بلند کیا تھا اس کی زد میں ہم مسلمانوں کی حبل اللہ المتین بھی آ گئی ہو جو بقول مارلن ہمارے ہاتھ آتے آتے بس رہ گئی

ہے۔

شام کا کھانا بالعموم قلعہ کے پائیں باغ میں ہوا کرتا تھا۔ باغ تو یہاں کوئی ایسا نہ تھا ہاں ایک سرسبز وشاداب لان ضرور تھا جس کے کنارے بڑے بڑے مستطیل نما پتھروں سے گھرے تھے۔ ان پتھروں کے آگے کسی قدر گہرائی لیے ہوئے چھوٹا سا چبوترہ تھا اور پھر بالکل دیوار کی طرح کوئی دوسو فیٹ گہرا ڈھلان، سامنے دریائے ڈراوا اور اس کے کنارے سے گزرتی ہوئی ایک سڑک دکھائی دیتی تھی جس پر کبھی کبھی کوئی گاڑی گزر جاتی۔ پائیں باغ سے دریا کا نظارہ اور فطرت کی نیرنگیاں قابل دید تھیں۔ خاص طور پر شام ڈھلے جب تاریکی کی چادر رفتہ رفتہ دبیز ہوتی جاتی، پرندے آشیانوں میں لوٹ رہے ہوتے تو یہ احساس شدت اختیار کر جاتا کہ ہمارے آشیانے کیوں کر تباہ ہوئے، زندگی لطف وانبساط سے کیونکر محروم ہوگئی، تہذیب کا وہ تناور ماڈل، جسے ہم نے فطرت سے ہم آہنگی پر تشکیل دیا تھا، وہ سب کچھ کیسے پارہ پارہ ہوگیا، اب عالم یہ ہے کہ دنیائے اسلام کا کوئی بھی خطہّ اور مسلم اکثریت واقلیت کا کوئی بھی علاقہ نشیمن کا سا تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب مغل ہند، صفوی ایران اور عثمانی ترک دنیا کے سیاہ وسفید کے مالک تھے پھر یہ حکومتیں کیا تاراج ہوئیں کہ ہر جگہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوگیا۔ استعمار کی بظاہر رخصتی کے بعد بھی عالم اسلام ایک خلفشارِ مسلسل کی زد میں ہے۔ گھٹن کا یہ عالم ہے کہ اہل ایمان کی ایک بڑی آبادی بلادِ غیر میں پناہ گزینی پر مجبور ہے۔ نہ جانے کیوں آج ان لوٹتے پرندوں کو دیکھ کر اپنے نشیمن کی تباہی کا شدت سے احساس ہوا۔

ابھی میں ان ہی خیالات میں کھویا تھا کہ شام کے کھانے کا اعلان ہوگیا۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قریبی بنچ پر علی کودرا انواع واقسام کے کھانے سجائے بیٹھے ہیں بلکہ ابھی پوری طرح ان کا سجنا باقی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے، فرمایا اگر مناسب خیال کریں تو اسی بینچ پر تشریف لے آئیں۔ ابھی بفے کی قطار خاصی طویل تھی سو میں نے ان کی پلیٹ سے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ علی کودرا کو میں نے جب بھی دیکھا کچھ گم سم، لیے دیئے، خاموش دیکھا۔ وہ اکثر آخر میں آتے، لوگوں سے الگ تھلگ کسی گوشے میں بیٹھ جاتے، عام طور پر گفتگو سے احتراز کرتے اور کبھی کچھ کہتے بھی تو اس طرح جیسے فتویٰ دے رہے ہوں یا وعید سنا رہے ہوں۔ ایک بار میرے ساتھ کھانے کی میز پر پہلے بھی بیٹھے تھے لیکن اچانک خاموش ہوگئے، کچھ دیر خلا میں گھورتے رہے اور پھر بغیر کچھ کہے سنے اچانک رخصت ہوگئے۔ علی کودرا اکثر شارکین کے لیے ایک معمہ تھے۔ ان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں۔ کوئی کہتا کہ ان کے کندھے سے جو تھیلا لٹک رہا ہے

یہی ان کا کل اثاثہ ہے جس میں دو چار کتابیں، کچھ مڑے تڑے اوراق ایک آدھ کپڑا اور ایک مختصر سا کمبل ہے۔ عرصے سے یہ شہر کو خیر باد کہہ کر جنگل میں رہ رہے ہیں۔ حکومتوں کے زیر سایہ نہیں رہنا چاہتے تاکہ مختلف قسم کے بل اور جبری ٹیکس سے آزاد زندگی کا لطف لے سکیں۔ پہلے دن جب میں نے انہیں دیکھا، ان کی شخصیت منتشر لباسی کا شکار تھی۔ بالوں کو تو وہ اپنے بوسیدہ ہیٹ میں چھپائے رکھتے البتہ مونچھ اور داڑھی کی بے ترتیبی سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ ان امور پر مدت سے انہیں توجہ دینے کا موقع نہیں ملا ہے۔ پھر وہ اچانک کل الاؤ پر صاف ستھرے اور مرصّع سے دِکھے البتہ گفتگو میں وہی مولویانہ قطعیت۔ میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ جس طرح ہمارے ہاں جوگیوں اور راہبوں کی روایت ہے اسی طرح وہ مغرب کے کوئی سنیاسی ہوں گے یا کوئی مجذوب۔ پہلے تو مجھے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ حضرت خیر سے مسلمان بھی ہیں کہ کاسل بورل کے شرکاء انہیں محض کودرا کہہ کر مخاطب کرتے۔ لیکن کل ڈاکٹر پیا، جو اس کانفرنس کی روح رواں ہیں، نے بتایا کہ یہ پراسرار شخص جو بظاہر اول جلول سا آدمی لگتا ہے، کوسووو کا رہنے والا ہے، مسلمان ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اہل فکر میں سے ہے۔ البتہ اس کے رویے میں ایک دانشورانہ شدت ہے یا شاید وہ کسی نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ کہنے لگیں کہ بوسنیا میں مسلمانوں پر اعلانِ آزادی کے بعد جو قیامت گزری ہے اس نے بڑے بڑوں کے اعصاب مجروح کر دیئے ہیں۔ مجھے اس آدمی سے ہمدردی ہے۔

اب جو یہ حضرت بالوں کی تراش خراش اور داڑھی کی تزئین کے بعد صاف ستھرے کپڑوں میں جلوہ گر ہوئے تو بالکل ہی ایک نئی صورت سامنے آئی۔ شاید پیا کے اشارے پر ہی انہوں نے الاؤ کے دوران مجھ سے ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی اور آج شام کے کھانے پر باضابطہ اپنی میز پر مدعو کر ڈالا اور اکرام ضیف کے طور پر پہلے سے ہی انواع واقسام کے کھانے لا کر رکھ دیئے۔

کھانے کی میز پر علی کودرا ابتداً کچھ ایسے سوالات کرتے رہے جیسے وہ مجھے ٹٹولنا چاہتے ہوں، انہیں میرے مبلغ علم کا اندازہ مقصود ہو۔ فرمایا: ''یہ جو آپ اپنی تقریروں میں عظمتِ رفتہ کا نوحہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بار پھر ایک خدا شناس تہذیب کو برپا کرنا ممکن ہے، تو کیا واقعی آپ اس بارے میں سنجیدہ ہیں؟ آپ کو اپنے نقطۂ نظر کی صلابت پر یقین ہے یا یہ سب ایک طرح کی demagogy ہے، جس کے آپ بھی، دوسرے بہت سے مبلغین کی طرح شکار ہیں۔''

مجھے اندازہ نہ تھا کہ علی کودرا اس پایے کے عالم ہوں گے اور اس طرح کے مرصّع سوالات سے

مخاطب کو مجروح کرنے کے ہنر سے واقف ہوں گے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا کہ آپ کے فیملی نام سے تو اب تک میں آپ کو غیر مسلم سمجھتا رہا تھا۔ وہ تو کل مجھے پیا نے بتایا تو معلوم ہوا کہ آپ کا پورا نام علی کودرا ہے اور اب ان سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی قنوطیت کے اسباب گہرے ہیں۔

'کودرا تو معروف مسلم فیملی ہے۔ کیا آپ ابراہیم کودرا سے واقف نہیں، جو بڑے آرٹسٹ گزرے ہیں؟' میری لاعلمی پر وہ سخت متعجب ہوئے۔

پکاسو کا نام سنا ہے؟

میں نے کہا: ادب اور آرٹ کے طالب علم کی حیثیت سے پکاسو کی مصوری سے کسی قدر واقفیت فطری ہے۔

فرمایا: 'حیرت ہے پکاسو کو تو تم جانتے ہو اور ابراہیم کودرا کو نہیں جانتے۔ جب پکاسو شہرت کے بامِ عروج پر تھا اس کی عمر ڈھل چکی تھی اس وقت ابراہیم کودرا کے برش نے روم اور ملان کے آرٹ ایگزیبیشنز میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نے پکاسو، روآولڈ، ڈوفی، ڈالی اور متا جیسے فنکاروں کے ساتھ دسیوں اجتماعی نمائشیں منعقد کیں۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ تمام اعزازات و اکرام کے باوجود ابراہیم کودرا کی شہرت ایک البانی آرٹسٹ کی ہی رہی اور پکاسو جدید دنیائے فن کا امام بن گیا۔' یہ کہتے ہوئے علی کودرا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انہوں نے رومال سے آنسو خشک کیے۔ اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہّ کو کسی قدر قابو میں کیا، بولے: یہ کسی کودرا کی توہین نہیں، شخصی اور خاندانی وقار کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق اس امت کی بے توقیری سے ہے جس کے لعل و گہر، جس کی قیمتی صلاحیتیں اقوامِ عالم کی نگاہوں میں آج کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ ابراہیم کودرا کو چھوڑیئے، آپ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے مہم جو سیاحوں سے واقف ہوں گے اور علوم البحر پر عہد وسطیٰ کی اتھارٹی ابن ماجد کی انسائیکلو پیڈک نوعیت کی کتابیں بھی شاید آپ کی نگاہوں سے گزری ہوں گی اور یقیناً آپ مارکوپولو کی سیاحی اور واسکوڈی گاما کے بحری سفر سے بھی واقف ہوں گے۔ کہاں ابن بطوطہ اور کہاں مارکوپولو، کہاں ابن ماجد جیسا تجربہ کار سیاح اور کہاں ڈی گاما اور کولمبس جیسا مسکین سا مسافر۔ لیکن ان مغربیوں کی بے حیائی کی داد دیجئے کہ وہ ابن بطوطہ کو عالم عرب کا مارکوپولو کہتے ہیں اور ابن ماجد کو مشرق کا کولمبس گردانتے ہیں۔ اگر ان میں ذرا سی بھی انصاف کی خو بو ہوتی تو وہ مارکوپولو کو یوروپ کا ابن بطوطہ اور کولمبس کو یوروپ کا ابن ماجد بتانے میں فخر محسوس کرتے۔ لیکن کیا کیجیئے گا جب کسی قوم کا ملی وجود اس کے اپنے اندر منہدم ہو جاتا ہے تو ایک عمومی بے توقیری اس

کا مقدر بن جاتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ بوسنیائی جنگ کے ایام میں ہیگ کی کسی کانفرنس میں، جو پیس پیلس میں منعقد ہو رہی تھی، میں ایک شام چند احباب کے ساتھ چہل قدمی کو نکلا تھا، ایک صاحب جو نسبتاً بزرگ تھے وہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے۔ میں ان سے واقف نہ تھا وہ خود بھی خاموش طبع اور منکسر المزاج شخص تھے۔ اب جو ان سے باضابطہ تعارف ہوا تو یہ پتہ چلا کہ وہ کوسووو کے آدم دماچی صاحب ہیں، البانیائی مسلمانوں کی تحریک مزاحمت میں پیش پیش رہے ہیں۔ اٹھائیس سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اٹھائیس سال کا ذکر سن کر جب میں ایک لمحہ کو چونکا تو ان کی ایک شاگردہ نے مداخلت کی۔ بولی: تم انہیں نہیں جانتے، He is our Nelson Mandela۔ اس وقت بھی یہ جملہ سن کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی خوبصورت کانچ کا برتن کسی نے اچانک زمین پر دے مارا ہو۔ کوئی چیز میرے اندرون میں منہدم ہو گئی ہو۔ آج علی کودرا کے ساتھ بیٹھ کر میرے لیے یہ سمجھنا کسی قدر آسان ہو گیا کہ وہ عزت نفس، وہ غیرت، اپنے آپ میں ہونے کا عمل بلکہ کہہ لیجئے کہ عرفانِ ذات اگر نہ ہو اور فرد اپنے آپ کو دوسروں کے عکس میں دیکھنے کا عادی ہو جائے تو پھر اسے اپنی اصل حیثیت کا احساس نہیں رہتا۔

٣

لاتحزن

بفے کی قطار اب ہلکی ہوچکی تھی۔ میں نے سوچا شوربے کا ایک اور پیالہ بھر لاؤں۔ کاسل بورل کے ویجیٹبل سوپ میں نہ جانے کیا بات ہے کہ دوسرا پیالہ پیئے بغیر سیری نہیں ہوتی۔ مجھے دنیا کے مختلف ملکوں میں طرح طرح کے دسترخوان سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا لیکن جو لذت بورل کے شوربے اور سلووینیا کے شہد میں ملی وہ بات نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کہیں اور دیکھنے میں آئی۔ کہتے ہیں کہ اس میں طباخی کا دخل کم ہے، فرحت کا یہ احساس ان تازہ اور خالص سبزیوں کے سبب ہے جو بلقان کے ہرے بھرے خطے میں کثرت سے ہوتی ہیں۔ درخت پھلوں سے لدے ہیں اور راہ گیر چلتے چلاتے دو چار پھل توڑ لینا اپنا حق سمجھتے ہیں اور باغ والا اس کا برا بھی نہیں مانتا۔ یہی حال بلقان کے شہد کا ہے کہ دو چار چمچے بھی کھالیں تو دن بھر مشام جاں اس کی فرحت بخش خوشبو سے معطر رہیں۔ میں نے سوچا علی کو درا اسکٹسو فرینک (schizophrenic) طبیعت کے حامل ہیں۔ بیٹھے بیٹھے اچانک ڈپریشن میں چلے جاتے ہیں سو ایسی باتوں سے احتراز کیا جائے جو ان کی جھنجھلاہٹ اور غصہ کا سبب بنے۔

''یہ جو آپ اتنے یقین سے کہتے ہیں کہ سرمایہ داری کے چنگل سے نجات نہیں مل سکتی یہ دنیا اب قابل اصلاح نہیں رہی تو اس سخت مایوسی کا آخر سبب کیا ہے؟' میرے اس سوال پر انھوں نے ایک لمحہ کو توقف کیا پھر دریائے ڈراوا کی سمت دور خلا میں گھورتے ہوئے بولے: کیا بتاؤں، کہاں سے شروع کروں؟ میں خود ایک مخمصہ میں گرفتار ہوں۔ میں دنیا کو چھوڑنا چاہتا ہوں اور دنیا مجھے چھوڑتی نہیں۔ معاملات بڑے پیچیدہ ہیں۔ سرمایہ داری اب ایک ایسی منزل پر آگئی ہے جب اس کی بڑھتی بھوک اسے خود اپنے وجود کو نوالہ بنانے پر مجبور کر رہی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسے زیادہ دنوں تک مصنوعی ترکیبوں سے زندہ نہیں رکھا جاسکتا لیکن

مصیبت یہ ہے کہ اس کے مقابلے کے لیے کسی موثر متبادل کا فقدان ہے۔ حدتو یہ ہے کہ اب کمیونسٹ ممالک بھی اسی راہ پر چل نکلے ہیں۔ عرب شیوخ بھی اسی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں حتیٰ کہ اسلامی معیشت اور بینکنگ کے تصورات بھی اسی نظام کو سامنے رکھ کر تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ پھر آپ کسی بڑی تبدیلی کی بات کیسے سوچ سکتے ہیں اور ہاں ایک بات بتاؤں شاید آپ اس سے اتفاق نہ کریں، یہ جو آپ کا دعویٰ ہے کہ مسلمان حالات کا رخ موڑ سکتے ہیں، وہ دوبارہ عالمی اسٹیج پر فیصلہ کن رول ادا کر سکتے ہیں تو یہ اس لیے ممکن نہیں کہ مسلمان نظری اور فکری طور پر ایک امت اضداد میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان بے چاروں کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ وہ جن اوہام ورسومات کو اسلام کے نام پر ڈھو رہے ہیں، ان کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ صدیوں سے ان کی باہمی خانہ جنگی میں ان کی بیشتر فکری اور ملی توانائی ضائع ہو رہی ہے۔ ان کے اندرون میں جو خوں ریز محشر بپا ہے وہ کسی طرح رو کے نہیں رکتا۔ میں ذرا کھل کر اور بے لاگ انداز سے بات کرنا چاہتا ہوں مگر اس سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ شیعہ ہیں یا سنّی؟ ان کی متجسّس نگاہیں میری آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا میری زبان سے بلا ساختہ نکلا، بس مسلمان۔ انہوں نے میز پر ہلکی سی ایک دھپ لگائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ناممکن! میری آج تک کسی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں حرمین شریفین میں بھی رہا، مدینہ اور قم میں بھی تعلیم پائی، ریاض اور تہران کے چکر بھی لگا تا رہا لیکن مجھے دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ملا جو صرف اور صرف مسلمان ہو۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کو انگلیوں سے کھرچتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولے کہ ہماری اسلامی شناخت is not even skin-deep، یعنی جلد جتنی گہری بھی نہیں ہے۔ ذرا اس پرت کو ہٹا کر دیکھو یہ تکلیف دہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ مسلمان ہونے کے یہ دعویدار دراصل شیعہ ہیں یا سنی، اسمٰعیلی ہیں یا اباضی۔ اور پھر اگر اگلی پرت اور ہٹائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا یہ دعویدار دراصل حنفی ہے یا شافعی، مالکی ہے یا حنبلی یا پھر بعض ائمہ اہل بیت کے حوالے سے اپنی شناخت کو صیقل کئے ہوئے ہے۔

ان کی زبان سے بیک وقت مدینہ اور قم، ریاض اور تہران کا ذکر سن کر اب مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ یہ حضرت کوئی گہری شخصیت ہیں جو بآسانی کھل کر نہیں دیتے۔ میں نے کہا معاف کیجئے گا آپ کی زبان سے ایک ہی سانس میں مدینہ کی جامعہ اسلامیہ اور قم کے حوضۂ علمیہ کا ذکر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آپ کو ان دونوں درسگاہوں سے اکتساب فیض کا موقع ملا ہے؟ میرے اس راست سوال پر وہ مسکرائے۔ کہنے لگے لگتا ہے تم بات

کی تہہ تک پہنچ گئے ہو۔ میں نے وہابی اور شیعہ دونوں مدرسوں میں وقت گزارا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا وجود باہم ایک دوسرے کی نفی سے عبارت ہے اور شاید اسی لیے میں اپنے اندر ایک نظری شناخت کا خلا محسوس کرتا ہوں۔ پچھلے پندرہ برسوں میں، تمہیں کیا بتاؤں، میں ایک بڑے ذہنی عذاب سے گزرا ہوں۔ وہابی بنا تو شیعوں کو کافر سمجھتا رہا اور جب حالات کے ہاتھوں تہران کا چکر لگانے پر مجبور ہوا اور اسلام کے شیعی قالب کے زیر اثر مستقبل کے ایک مبلغ کی حیثیت سے قم کے حوضۂ علمیہ میں پہنچا تو پتہ چلا کہ اصل مسلمان تو محبانِ اہل بیت ہیں، بقیہ لوگ تو غاصبینِ خلافت کے ٹولے سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کو خیر باد کہہ دیا، میں نے اپنے طور پر حقیقتِ حال تک پہنچنے کی بہت کوشش کی۔ اب عالم یہ ہے کہ ان بحثوں سے میرا جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ میں جب قرآن کی تلاوت کرتا ہوں تو بسا اوقات سکینت کی ایک کیفیت سے لطف اندوز ہوتا ہوں لگتا ہے جیسے میرے اندر سے آواز آتی ہو کہ یہ کلام برحق ہے۔ قرآن میری آخری پناہ گاہ ہے میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں باہم تکفیر کے اس ماحول میں خود کو مسلمانوں کے کس گروپ سے وابستہ کروں؟

علی کودرا کی شخصیت مجھے اب پراسرار سے کہیں زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ میری نگاہوں میں ان کا علمی قد وکاٹھ کافی بڑھ چکا تھا۔ میں اب تک ایسے اصحابِ علم سے تو ملا تھا جو بیک وقت مختلف فرق وملل کی امہات الکتب پر گہری نظر رکھتے ہوں، جنہیں شیعی، سنی، اباضی، اسمٰعیلی ماخذ سے کما حقہ واقفیت ہو، میں ایسے اصحاب فن کو بھی جانتا تھا جن کی نظر بیک وقت مشرقی اور مغربی علوم پر تھی لیکن علی کودرا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھے۔ جامعۃ مدینہ میں وہابی اسلام کے اسرار و رموز سے واقفیت کے بعد وہ قم کے شیعی مدرسے میں پہنچ گئے۔ ان دو متحارب دنیاؤں کو انہوں نے کس طرح انگیز کیا، میرے اندر یہ سب کچھ جاننے کا شوق جاگ اٹھا۔ میرے اشتیاق کو شاید وہ بھانپ گئے۔ بولے: مجلّہ صف کے لیے میں کبھی کبھی کوئی چھوٹی موٹی تحریر لکھتا تھا لیکن اب بہت دنوں سے کچھ لکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ ذہن پراگندہ اور انتشار کا شکار ہے۔ جب خود یہ بات سمجھ میں نہ آتی ہو کہ جانا کدھر ہے تو مضامین اور کتابیں لکھنا قارئین کو گمراہ کرنا ہے۔

میں نے پوچھا: آپ کی گفتگو میں جو ایک طرح کا resignation دکھتا ہے، علائق دنیا سے کنارہ کشی کی جو تلقین ملتی ہے اس کا واقعی سبب کیا ہے؟

بولے: یہ سب ذاتی نوعیت کی باتیں ہیں انھیں رہنے دو۔ لکم دینکم ولی دین والا معاملہ

رکھتے ہیں، آؤ ہم لوگ کوئی اور بات کریں۔ یہ کہتے ہوئے علی کودرا کھانے کی میز سے اٹھ کھڑے ہوئے، ٹشو پیپر سے ہاتھ کو صاف کیا بولے ذرا ٹھہرو! کافی لے کر آتا ہوں۔

ڈنر کے شرکاء چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کہیں قہقہے اچھالے جارہے تھے اور کہیں بذلہ سنجی کا مظاہرہ ہورہا تھا لیکن میرے لیے علماء ودانشوروں کا یہ انبوہِ عظیم اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ اب میری دلچسپی کا تمام تر مرکز علی کودرا کی شخصیت تھی۔

کافی کا پیالہ لے کر جب ہم دونوں حاضرین کے درمیان سے گزرے اور اس دوران دعاوسلام اور مسکراہٹوں کے تبادلوں کا موقع آیا تو یہ سب کچھ بڑا اجنبی اجنبی سا لگا۔ میرا جسمانی وجود تو اب بھی شرکائے کانفرنس کے ساتھ تھا البتہ ذہنی طور پر میں اور علی کودرا ایک بالکل ہی دوسری دنیا کی سیر کررہے تھے۔ پائیں باغ کے ذرا نیچے جہاں مختصر سے چبوترے کے بعد گہری کھائی شروع ہوجاتی تھی، پتھر کی ایک بڑی سِل رکھی تھی اس پر کسی نے تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھ دیا تھا۔ ایسا لگا جیسے مشیت نے پہلے سے ہی ہماری گفتگو کے لئے یہاں انتظامات کر رکھے ہوں۔ علی کودرا نے اپنا تھیلا زمین پر رکھا اور قدرے بے تکلف انداز سے پتھر سے ٹیک لگا کر کافی کا لطف لینے لگے۔

بولے: یہاں سے دریائے ڈراوا کا منظر کتنا دلکش لگتا ہے۔

لیکن اگر بالکل نیچے دیکھیے تو خوف سا محسوس ہوتا ہے، پہاڑی کا یہ حصّہ کس قدر عمودی ہے، ایک بار پیر پھسل جائے تو سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں۔

انہوں نے نیچے گہری کھائی کی طرف ایک سرسری نگاہ ڈالی پھر زیرلب مسکراتے ہوئے بولے: ہاں خودکشی کے لیے یہ جگہ بڑی مناسب ہے۔ تمہیں پتہ ہے میں اس ذہنی تشنج سے بھی گزرا ہوں۔ جب تعذیب ذہنی سے نکلنے کی صرف ایک راہ دکھائی دیتی تھی اور وہ تھی خودکشی۔ میرے احباب کہتے تھے کہ میں اسکٹسوفرینک ہوں، بائی پولر ہوں، ڈپریشن کا مریض ہوں۔ انہیں کیا پتہ کہ میں کن مسائل سے دوچار تھا۔

تو کیا آپ بوسنیا کی اعلانِ آزادی کے وقت کوسووو میں تھے؟ میں نے گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے بظاہر ایک بے محل سا سوال داغ دیا۔

بولے: نہیں، ہم لوگ البانیائی نسل کے مسلمان ہیں، کوسووو ہمارا آبائی وطن ضرور ہے البتہ عرصے سے ہمارا خاندان سرائیوو میں آباد ہے۔ سابق یوگوسلاویہ میں علاقائی شناخت کچھ زیادہ معنیٰ نہیں رکھتی تھی۔ یہ

جھگڑا تو یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۹۲ء میں بوسنیا کے اعلانِ آزادی کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

تو کیا سابق یوگوسلاویہ میں مسلمان زیادہ سکون سے تھے؟ میں نے ایک اور غیر متعلق سوال ان کی طرف اس خیال سے اچھالا کہ شاید ان کے بیان کی گرہ کھل جائے۔

بولے: یہ تو میں نہیں کہتا۔ بوسنیا میں ڈھائی تین لاکھ مسلمان قتل ہوئے لیکن اتنی بڑی تباہی کے باوجود بھی سابق یوگوسلاویہ کے قبرستان جیسے امن کو ہم لوگ اچھے دنوں کی حیثیت سے یاد نہیں کرتے۔ بڑی گھٹن تھی اس ماحول میں۔ آپ اندازہ کریں کہ اس وقت ایک مسلمان خاتون ملیحہ عزت بیگووچ نے ایرانی انقلاب سے متاثر ہو کر آیت اللہ خمینی کو ایک خط لکھا تھا کہ میں سینتیس سال سے یوروپ کے ملحدانہ عیسائی ماحول میں رہ رہی ہوں جہاں میری طرح خوفزدہ مسلمانوں کا ایک گروہ جھوٹ اور منافقت کی زندگی جی رہا ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک کمیونسٹ ریاست میں اپنی آزادنہ اسلامی شخصیت کی تعمیر کر سکوں۔ روز روز کی صعوبت اور ذلت سے تنگ آ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے وطن سے ہجرت کر کے ایران آ جاؤں۔

جانتے ہو! ملیحہ کو اس خط کے لکھنے پر کیا سزا ہوئی؟ خفیہ اداروں نے اس کا خط سینسر کر لیا اور انہیں غیر ممالک سے ساز باز کرنے کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہ بڑے لرزہ خیز دن تھے۔ وہاں تو انسان ہر روز قتل ہوتا تھا، بار بار قتل ہوتا تھا اور طرفہ یہ کہ اس قتل پر اقوامِ عالم کی طرف سے ہمدردی کے دو بول بھی نہیں ملتے تھے۔

اب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ گاڑی اب صحیح سمت میں چل نکلی ہے۔

بولے: افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ کم از کم میری نظروں میں تو ایسا ہرگز نہیں۔ بظاہر تو ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے بوسنیا ہرزوگووینا نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا ہے، سربوں کی جارحیت کو لگام لگ گئی ہے، پڑوسی ریاستوں اور سرب کروٹ نسلی گروہوں نے ایک آزاد مسلم بوسنیا کو نفسیاتی طور پر گوارا کر لیا ہے لیکن اب اندر کے جھگڑوں کا بیج بویا جا رہا ہے۔ مختلف قسم کے اسلامی مبلغین بوسنیا کو اپنے فرقے کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ شیعہ، سنّی، سلفی جہادی اور پاسدارانِ انقلاب کے مابین اب ایک داخلی چپقلش جنم لے رہی ہے۔ یہ ایک بڑا خطرناک رجحان ہے جو آنے والے دنوں میں ہمیں اندر سے کھوکھلا کر دے گا۔

کیا آبادی ہوگی بوسنیا میں اہلِ تشیع کی؟ میں نے جاننا چاہا۔

بولے معاملہ تناسب کا نہیں بلکہ جارحانہ تبلیغ کا ہے۔ بوسنیا میں نہ سلفی وہابی ہیں اور نہ ہی شیعہ جہادی۔ روایتی طور پر بلقان کا یہ پورا علاقہ حنفی مسلک کا گڑھ رہا ہے جہاں عقائد کے ماتریدی چارٹر کو حرفِ آخر

سمجھا جاتا تھا۔ سابق یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کا ایک ہی مذہبی بورڈ تھا جو شرعی امور پر فیصلے صادر کرتا۔ اسلام کا یہ متفقہ قالب خواہ کتنا خوابیدہ اور کتنا ہی جامد رہا ہو، خواہ اس کی وجہ دوسرے مسالک اور مکاتب فکر سے ناآشنائی رہی ہو لیکن اتنی بات تو ضرور تھی کہ دینی اعتبار سے مسلمان خود کو ایک جسد واحد محسوس کرتے۔ افسوس کہ اتحاد واتفاق کی وہ فضا اب جاتی رہی۔ اب سعودی اسلام اور ایرانی اسلام کے مابین معرکہ گرم ہے۔ یہ دونوں بوسنیا کو اپنی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔

بوسنیا جیسے ملک میں اس قسم کی مسابقت کا آخر سبب کیا ہے؟

یہ دراصل ہماری کمزوری اور بے بسی کا مذہبی استحصال ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سابق یوگوسلاویہ میں مسلمان سیاسی اور معاشی طور پر بڑی کسمپرسی کا شکار تھے۔ جنگِ عظیم دوم میں جو مسجدیں اور اوقاف کے ادارے تباہ ہوئے تھے ان کی مرمت اور انتظام وانصرام کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ انقلاب ایران کے بعد لوگوں کو ایک نئی امید دکھائی دی۔ کچھ باہمت نوجوان جن میں علیجا عزت بیگووچ، عمر بہمن، حسن جنجک، ایدھم بیجا جک اور حسین زلوائی جیسے لوگ شامل تھے اور جنہوں نے آگے چل کر پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن (SDA) تشکیل دی، ان میں سے عزت بیگووچ کے علاوہ سبھوں نے ایران کا خفیہ سفر کیا۔ یہ لوگ ایک آزاد اور خودمختار اسلامی ریاست کا خواب لیے حمایت کی تلاش میں مختلف لوگوں سے ملتے رہے۔ ابتداء سے ہی ایرانی قیادت نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۹۲ء میں بوسنیا کی اعلانِ آزادی کے بعد جب نوزائیدہ ریاست پر اسلحہ کی پابندی عائد کردی گئی، اس دوران بھی کروشیا کے راستے اسلحوں کی کھیپ بھیجی۔ بعض لوگ بوسنیا سے مدافعانہ جنگ کی تربیت کے لیے ایران گئے اور ایران سے بعض عسکری ماہرین بوسنیائی نوجوانوں کی تربیت کے لیے سرائیوو آئے۔ اسی دوران عرب ملکوں میں بھی بوسنیا کے مسئلہ میں دلچسپی لی جانے لگی۔ کوئی ڈیڑھ دو سو عرب مجاہدین بھی ہماری صفوں میں آملے۔ سعودی عرب میں پرنس سلطان کی نگرانی میں بوسنیا کی مدد کے لیے کمیٹی قائم ہوگئی۔ عربوں کے امدادی قافلوں کے ساتھ ان کے مبلغین بھی آئے جنہوں نے بوسنیائی مسلمانوں کے عقیدے کی درستگی کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اس طرح حنفی ماتریدی خوابیدہ اسلام کے ماحول میں احیائے اسلام کی خواہش کو ایرانی اور سعودی دونوں گروہوں نے ہائی جیک کرنے کی کوشش کی۔ دیکھتے دیکھتے تنگ نظری، تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت نے معصوم سیدھے سادے مسلمانوں پر اپنی کمندیں ڈال دیں۔

تو کیا اس صورت حال پر وہاں کے سکّہ بند علماء نے کچھ احتجاج نہ کیا؟

بولے: مجبور بھلا احتجاج کیا کرتا، بوسینائی مسلمان اس وقت اپنے وجود کی جنگ لڑ رہے تھے، ان کے لیے اولاً یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مسلم ممالک سے آنے والی امداد کے سلسلے میں کسی تحفظ کا اظہار کرتے۔ ثانیاً شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بوسنیائی مسلمانوں کی نظری قیادت احیائے اسلام کا ایک عالمی منصوبہ رکھتی تھی۔ اسے شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ مختلف اور متحارب قسم کے اسلام کو بوسنیا کی سرزمین میں درآمد کرنا ایک بڑے خلفشار کا باعث ہوگا۔

مگر آپ کے ہاں تو علیجاہ عزت بیگووِچ جیسا مفکر بھی تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کی گرفت بوسنیا کی تحریکِ آزادی پر خاصی مضبوط تھی۔ کیا وہ اس صورت حال کا پیشگی ادراک نہ کر سکے؟

عزت بیگووِچ کا نام سن کر علی کودرا ایک لمحہ کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ ان کی نگاہیں دریائے ڈراوا سے ماورا دور خلا میں، ایسا لگا، جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

'علیجاہ تم یقیناً عظیم آدمی تھے،' یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ بولے: یہ تم نے علیجاہ کا ذکر چھیڑ کر میری خوابیدہ یادوں کو مشتعل کر دیا ہے۔ بڑے متبرک لمحات تھے جو میں نے ان کے ساتھ گزارے۔ وہ عام آدمی نہیں لیکن افسوس کہ دنیا نے انہیں عام آدمیوں کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی۔ وہ ایک مضطرب ملکوتی شخصیت تھی۔ فولادی عزم کا مالک، ناقابلِ تزلزل ایمان والا مسلمان۔

میں نے محسوس کیا کہ عزت بیگووِچ کے تذکرے پر علی کودرا کی خوابیدہ سی شخصیت کچھ اس قدر مضطرب اور مشتعل ہوئی کہ ان کا عالمانہ اور دانشورانہ اندازِ گفتگو یکسر جاتا رہا۔ ایسا لگا کہ وہ ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر جنگ بوسنیا کے ایام میں جا پہنچے ہوں جہاں ان کے قائد عزت بیگووچ دشمنوں سے محصور اور بیرونی امداد اور اسلحوں سے محروم ریت کی بوریوں سے بنائے گئے مدافعتی حصار کے پیچھے اپنا دفتر سجائے جنگ آزادی کی کمان کر رہے ہوں اور جہاں ہر لمحہ اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی وقت بھی ریاست بوسنیا اور اس کے صدر کی زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔ علی کودرا نے اپنے تھیلے سے سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکالا اور سگریٹ روشن کرتے ہوئے بولے۔ اگر تمہیں مسلمانوں کے زوال کو سمجھنا ہو تو اس مسئلہ کا گہرائی سے مطالعہ کرو کہ بوسنیا میں ہماری منزل کیسے کھوٹی ہوئی۔ ہم اپنے اہداف کو کیوں حاصل نہیں کر پائے۔ حالانکہ ہمارے پاس عزت بیگووچ کی شکل میں اعلیٰ درجہ کی فکری قیادت موجود تھی۔ وہ مفکر بھی تھا اور مجاہد بھی۔ سیاست داں بھی تھا اور مصنف بھی۔ وہ مغرب کی عیاریوں سے بھی واقف تھا اور مشرق کی مصلحت پسندی سے بھی ناواقف نہیں تھا اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک نڈر اور بے لوث شخص تھا جو اپنے لیے نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جیتا تھا۔ پھر اگر وہ احیائے اسلام کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکا تو اس کا سبب کیا تھا؟ مستقبل کے انقلابیوں کے لیے اس سوال کا جواب فراہم کرنا ناگزیر ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ اسی ناکام تجربے کو مختلف ناموں سے دہراتے رہیں گے۔

معاف کیجیے گا ایک طرف تو آپ عزت بیگووچ کو ایک بڑا مفکر گردانتے ہیں۔ ان کے اخلاص اور فہم وذکا کے سراپا مداح ہیں اور دوسری طرف ان کے تجربے کو ناکام بھی بتاتے ہیں۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آتی نہیں۔ میرے اس سوال پر انہوں نے پہلو بدلا، سنبھل کر بیٹھ گئے، جیسے اپنے آپ کو پھر سے منظّم کر رہے ہوں۔

بولے: آپ کو معلوم ہے بیگووچ ہمارے مرشد تھے۔ ہم لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں لیکن ہماری یہ محبت ہمیں اپنے قائد کے نقد و تجزیہ سے نہیں روکتی اور جب آخری بار میں ان سے ملا ہوں تو وہ کہنے کو تو بوسنیا کے صدر تھے لیکن اس مردِ درویش کے دل میں، ایسا لگتا تھا جیسے، محرومی اور بے بسی کا آتش فشاں ابل رہا تھا۔ وہ تو ان لوگوں میں تھے جو کہتے ہیں کہ جب تم دنیا میں کوئی مفید کام نہ کر پاؤ تو تمہارے لیے زندہ رہنے کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔

علی کودرا کے دل میں اپنے مرشد کے لیے اس قدر سچی محبت اور احترام دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اس مرد درویش کے مجاہدانہ کارناموں اور وقیع تحریروں پر خود ان کے ایک محبّ کی تنقید سنی جائے کہ عام طور پر پیر و مرشد اپنے گرد معتقدین، مقلدین اور مریدین جیسی مسکین مخلوق کو جمع کیے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیسا مرشد ہے جس سے بے پناہ محبت کرنے والا اس کا شاگرد اور پروردہ اس کا ناقد بھی ہے اور جو اپنے قائد کی صلابت فکری اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا قائل ہونے کے باوجود اسے ناکام و نامراد کہنے سے باز نہیں آتا۔

میں نے پوچھا بیگووچ ریاست بوسنیا کے بانی صدر رہے۔ اہل ملک ان سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ انہیں احتراماً دیدو (دادا) کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ عالم اسلام میں بھی انہیں غیر معمولی قدر و منزلت حاصل تھی۔ انہوں نے بوسنیا کی جنگ آزادی کو منزل سے ہمکنار کیا تھا۔ پھر آپ انہیں ہزیمت زدہ مجاہد کیوں کہتے ہیں؟

فرمایا: عزت بیگووِچ کے لیے صدر بن جانا ان کی کامیابی نہیں۔

مرغِ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

وہ آگ کھانے والے پرندہ تھے، آب ودانہ پر بھلا ان کا گزارا کب ہوتا تھا۔ جب وہ سولہ سال کے تھے تو انہوں نے میلادی مسلمانی نامی نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی تھی۔ انہوں نے عین عالم شباب میں اسلامی ڈکلریشن نامی ایک دستاویز جاری کی تھی جس میں اس عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ مسلمان اسلام کے علاوہ کسی اور نظریے پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ کمیونسٹ حکمرانی میں اس قسم کے خیالات کا اظہار عام آدمی تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے نو سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بوسنیا کی جنگ آزادی کے لیے وہ دنیا دنیا پھرے۔ انہوں نے مجھ جیسے نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کی جو بوسنیا کی اسلامی ریاست کا خواب لیے مختلف مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں ارباب اقتدار کے دلوں پر دستک دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایران، سعودی عرب اور خلیج کے دوسرے ممالک طوعاً و کرہاً ہماری امداد کو تیار ہو گئے۔ مرشد کا خیال تھا کہ بوسنیا کی نوزائیدہ اسلامی ریاست محض یوروپ کے نقشے پر ایک آزاد مسلم مملکت کے طلوع کا وقوعہ نہ ہوگی بلکہ اپنے علامتی خدوخال کے سبب پورے عالم اسلام کے احیاء اور اتحاد کا سبب بن جائے گی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کا برملا اظہار کیا کہ پان اسلام ازم ہم مسلمانوں کے دلوں کی آواز ہے جبکہ نیشنلزم ایک اجنبی تصور ہے جو ہمارے عزائم سے میل نہیں کھاتا۔ آپ نے ان کی مشہور زمانہ کتاب *Islam between East and West* تو دیکھی ہوگی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی ہمارے مرشد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے۔ وہ عرب و عجم، شیعہ سنّی اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک بنیان مرصوص میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ فکری اعتبار سے انہوں نے اس کام کے لیے بڑا ہوم ورک کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بوسنیا کی تجربہ گاہ اگر ایک خودمختار ریاست کی حیثیت سے مل جائے تو وہ یہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تاسیسی پتھر ڈال دیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بیک وقت ترکوں کے صوفی اسلام، ایران کی شیعیت اور سعودیوں کی سلفیت کے لیے بوسنیا کے دروازے کھول دیے۔ انہیں شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ہماری باہمی گروہ بندیاں اتنی شدید اور گہری ہیں کہ وہ ہمیں دوبارہ اٹھنے نہیں دیں گی۔ جوں جوں ہمیں اپنے باہمی نفاق کا اندازہ ہوتا گیا، ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ ہم کٹے پٹے بوسنیا کو غنیمت جان کر دکھے دلوں کے ساتھ قبول کر لیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یاسر عرفات جیسے انقلابی نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ جو کچھ مل رہا ہے اسے غنیمت جانو، اڑیل رویہ اختیار نہ کرو ورنہ ریاست بوسنیا کا وجود تحلیل ہو جائے گا۔

علی کودرا کے بیان کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ پائیں باغ کی بلندی سے ابھرنے والی ایک نسوانی

ندا نے ہماری گفتگو کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ وہ مارلن وارنر تھی جو مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ کور گروپ کی میٹنگ کا وقت ہو چلا ہے۔ مجھے علی کودرا کے ساتھ زیریں چبوترے پر محو گفتگو دیکھ کر اس نے کسی قدر شوخی کے ساتھ آواز ہ بلند کیا۔ اچھا تو آپ یہاں روپوش ہیں۔ بورل کی فصیلوں تلے دیکھئے دو مسلمان کیسی خوبصورتی سے کسی اسلامی سازش کا جال بُننے میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا کوئی سازش نہیں یہ سب تمہارے ریڈیو فری یورپ کا پروپیگنڈہ ہے۔ میرے جواب پر مارلن نے قہقہہ بلند کیا۔ میں نے علی کودرا سے اجازت چاہی اور مارلن کی معیت میں میٹنگ میں شرکت کے لیے چل پڑا۔

کاسل کے اندر نسبتاً ایک کشادہ کمرے میں ایک بڑی میز کے گرد پندرہ بیس لوگ بیٹھے تھے جہاں کانفرنس کے اعلانیہ کا مسودہ زیر بحث تھا۔ قریب ایک چھوٹی میز پر پروجکٹر اور لیب ٹاپ رکھا تھا جس کی مدد سے جلسے کی ناظمہ پیا جو برایک ایک شق کو باری باری سے حاضرین کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتیں۔ انہیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زندگی کی مسرتوں کو لوٹانے اور اسے مانند جشن جینے کا کوئی عملی پروگرام کیسے تشکیل دیا جائے۔ میری آمد پر انہوں نے پر جوش خیر مقدم کیا کہنے لگیں کہ آپ کی گفتگو میں تہذیب اور فطرت کی ہم آہنگی کا جو بیان ملتا ہے اور جدید طرز زندگی کی نا آسودگی اور نامرادی کا جس شدت کے ساتھ آپ نے کل کی گفتگو میں نوحہ کیا اس سے ہم لوگ اور خاص طور پر میں تو بہت ہی متاثر ہوئی۔ پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک متبادل طرز زندگی ممکن ہے، ہم یہ چاہیں گے کہ آپ کے اس وژن کو اس اعلانیہ میں سمو یا جائے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجوزہ اعلانیہ کی ایک مطبوعہ کاپی میری طرف بڑھا دی۔

اہل مجلس پورے جوش وخروش کے ساتھ گفتگو میں حصّہ لے رہے تھے مگر میرا یہ حال تھا کہ میرے چشم تصور میں اب بھی علی کودرا براجمان تھے۔ ان کا بیان تو ختم ہو چکا تھا لیکن اس سے پیدا ہونے والے سوالات نے میرے دل ودماغ میں ایک محشر بپا کر رکھا تھا۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور اعلانیہ کے نوک پلک سنوارنے کے خیال سے اسے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ الفاظ مفہوم سے خالی لگے۔ ایسا لگا جیسے میرے دل ودماغ میں کسی اور مسئلہ پر بحث جاری ہو۔ میں سوچنے لگا کہ اقوام عالم کو سرمایہ داری کے عفریت سے نجات دلانے اور زندگی کی مسرتوں کو دوبارہ ان تک لوٹانے کا کام وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں جن کے دل ودماغ میں خود ایک محشر بپا ہو، جو نظری طور پر ایک داخلی نزاعِ مسلسل میں مبتلا ہوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے علی کودرا کی قنوطیت میرے اندر سرایت کر گئی ہو۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ جب تک قندیلِ ربانی آپ کے

ہاتھوں میں نہ ہواور جب تک حبل اللہ المتین پر آپ کی گرفت مضبوط نہ ہو آپ دوسروں کی رہنمائی تو کجا اپنے لیے بھی کوئی واضح راستہ نہیں بنا سکتے۔

جیسے تیسے میٹنگ سے فارغ ہوا۔ دل تفکرات سے بوجھل، جوش وجذبہ سے خالی کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔ بورل کی فصیلوں تلے بلند درختوں پر سورج اپنی آخری کرنیں ڈال رہا تھا، لیکن آج میرے لیے بورل کی اس شام میں فطرت سے لطف اندوزی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ایسا لگا جیسے صدیوں سے ہماری ملی اور قومی زندگی پر ایک شامِ مسلسل نے سایہ کر رکھا ہو جہاں رات کی مہیب نظری تاریکی میں ہم مسلمانوں کے مختلف فرقے باہم دست وگریباں ہوں۔ غیرارادی طور پر میرے قدم قلعہ سے باہر جانے والے راستہ کی طرف بڑھتے گئے۔ مرغزاروں سے ہوتا ہوا پگڈنڈیوں کے سہارے نیچے پختہ سڑک پر آیا اور پھر ایک عالم بے خودی میں چلتا ہوا دریائے ڈراوا کے پل پر جا پہنچا۔ جھٹپٹے کا ماحول اور ہو کا عالم۔ لہروں کے شور میں ایسا لگا جیسے کوئی مجھ سے مخاطب ہو، میری دلجوئی کر رہا ہو۔ فطرت بھی کتنی عجیب شئ ہے اگر آپ کے کان اس کی نغمگی سے مانوس ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آپ کے باطن میں سرگوشی کرتا ہو، کہتا ہو لاتحزن ان اللہ معنا۔ یہ ارض وسمٰوات، یہ ساری کائنات تمہارے لیے مسخر کی گئی ہے۔ بس ضرورت ایک نئی ابتداء کی ہے۔

٤

تاریخ کا دلدل

اگلی صبح طبیعت کچھ مضمحل سی تھی۔ آج کا دن شرکاء کی سیر وتفریح کے لیے مخصوص تھا۔ بعض لوگ پیرا کی کے خیال سے پتوئی جا رہے تھے۔ شرکاء کا ایک بڑا گروہ شراب سازی کے اس کارخانے کی سیر کرنا چاہتا تھا جو اپنی قدامت، وسعت اور اعلیٰ درجے کی شراب کشید کرنے کے لیے بلقان کے علاقے میں معروف ہے۔ میرے لیے ان دونوں پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ سچ پوچھئے تو میں ایک الگ دنیا میں جی رہا تھا۔ اب میرا تناظر بدل چکا تھا۔ دنیا مختلف دکھائی دیتی تھی۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام جبر کے خلاف گو کہ میری بغاوت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اس سے پہلے ایک اہم اور ناگزیر منزل کو سر کرنا ابھی باقی ہو۔ ناشتے کے بعد میں آرام کے خیال سے بستر میں جا لیٹا۔ علی کودرا، عزت بیگووچ، یاسر عرفات، سعودی ولیعہد پرنس سلطان کی تصویریں گاہے بہ گاہے ذہن کے پردے پر ابھرتی رہیں۔ کبھی بوسنیائی رفیوجی کیمپوں میں اپنا چلنا پھرنا یاد آیا اور کبھی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے سامنے بوسنیا کی حمایت میں مظاہروں میں شرکت کی بات یاد آئی۔ پھر باہم یہ سارے مناظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔ پھر اچانک یادوں کا سلسلہ پشاور جا پہنچا۔ جہاد افغانستان کے دوران افغانی زعماء کی وہ ملاقاتیں یاد آئیں، تب ان کے بھولے پن پر بے ساختہ پیار آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مولوی یونس خالص جب امریکی صدر نکسن سے ملاقات کے لیے واشنگٹن ڈی سی پہنچے تو وہ نکسن کے حسنِ سلوک اور افغانیوں کے لیے ان کی بے پایاں محبت اور فراخدلانہ مدد سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے فرط احترام ومحبت میں نکسن کا ہاتھ تھاما اور بولے جناب صدر آپ کتنے بھلے انسان ہیں۔ ہم افغانیوں سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اتنے بھلے آدمی کو تو مسلمان ہو جانا چاہئے۔ یہ سن کر نکسن مسکرائے اور یونس خالص نے سمجھا کہ انہوں نے حجت تمام کر دی۔ مدرسانہ اسلام کے پروردہ بھولے بھالے افغانی

قائدین امریکی امداد کے پیچھے اس کے اصل عزائم کا ادراک نہ کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افغانیوں نے بڑی بے جگری سے روسی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ میں نے جب بھی ان کے زعماء سے گفتگو کی ان کے دلوں کو ایمان واعتماد سے بھر پور پایا۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اسی دل میں انھوں نے دوسرے افغانی قائدین کے لیے بغض وعناد کے آتش فشاں کو کس طرح جگہ دے رکھی ہے۔ ایک کا اسلام دوسرے کے لیے نا قابل قبول کیوں ہے؟ اس وقت بھی یہ خیال بار بار ستاتا تھا کہ آزاد افغانستان میں جب مختلف قسم کے اسلام باہم ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے، جب ہزارہ شیعوں کے لیے دیو بندی اسلام کی بالا دستی کو قبول کرنا ممکن نہ ہوگا اور یونس خالص کے لیے ربّانی اور مجددی کی مصلحت پسندی قابل قبول نہ ہوگی، تب احیائے اسلام کی اس عالمی تجربہ گاہ کی کوکھ سے کتنی بڑی مایوسی جنم لے گی۔ افغانی مجاہدین پھر بھی سادہ لوح لوگ تھے۔ حالات نے انہیں اچانک بندوق اٹھانے اور اپنی صفوں کو منظّم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت سامنے نہ آئے تھے۔ ان میں نہ کوئی مفکر تھا اور نہ کوئی مصنف۔ نہ ہی کسی کو امورِ دنیا کی ناقدانہ بصیرت تھی اور نہ ہی کوئی اسلام کی کسی تازہ بہ تازہ تعبیر کا داعی اور نقیب تھا۔ سو اگر آگے چل کر دیو بندی اسلام افغانی قوم کو کسی بنیان مرصوص میں تبدیل کرنے کے بجائے ان کے ملّی انتشار میں اضافے کا سبب بنا تو اس پر کچھ بہت زیادہ تعجب نہ ہونا چاہئے۔ البتہ عزت بیگووچ کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک مفکر بھی تھے اور مدبر بھی، حال اور ماضی کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسلام ان کی درسگاہ تھی اور ایمان ویقین ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا تھا۔ پھر اگر ان کی مساعی برگ و بار نہیں لائیں تو یہ بڑی فکر مندی کی بات ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خدا کسی مفکر اور مدبر کو سیاسی قوت سے نوازے۔ یقیناً بیگووچ کے تجربے میں ہمارے لیے عبرت کا بہت سا سامان پوشیدہ ہوگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ ایک الٰہی انتظام ہو کہ اس نے بیگووچ کے شاگرد رشید کو میرے پاس شاید اس خیال سے بھیجا ہے کہ وہ مجھے عصر حاضر میں احیائے اسلام کے ایک عظیم تجربے کے مالہ و ماعلیہ سے آگاہ کر سکے۔

ابھی میں ان ہی خیالات میں غرق تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ علی کودرا بنفس نفیس موجود ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں تھرماس ہے اور دوسرے ہاتھ میں انہوں نے کچھ کاغذات تھام رکھے ہیں۔ بولے مجھے آپ کی طبیعت کی ناسازی کا پتہ چلا۔ خیال ہوا کہ شاید یہ سب کچھ تفکرات کے سبب ہو۔ میں خود بھی ان مسائل سے دو چار رہتا ہوں۔ اس تھرماس میں بعض مخصوص قسم کی

جڑی بوٹیاں اور پھول پتے جوش دے کر لایا ہوں، اسے ایک طرح کی ہربل چائے سمجھ کر نوش فرمائیے، ان شااللہ آپ خود کو تازہ دم محسوس کریں گے۔ اور اگر طبیعت آمادہ ہو تو کھلی فضا میں بیٹھئے۔ کبھی کبھی نیند کی کمی کے سبب بھی طبیعت اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے۔

میں نے ان کی دعوت قبول کی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ علی کودرا کی گفتگو میں پھر لطف آئے گا، دل کا بوجھ ہلکا ہوگا اور کیا عجب کہ مسائل کی کوئی گرہ کھل ہی جائے۔ ہربل چائے کا ہر گھونٹ نشاط افزا ثابت ہوا۔ اس دوران علی کودرا اپنے تجربات کی روشنی میں اس کی افادیت کے فضائل سے مجھے آگاہ کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ کیسی کیسی اعصاب شکن صورتِ حال میں جب مایوسی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا پھولوں کے اس عرق سے ان کی طبیعت دوبارہ کھل اٹھی۔

ہربل چائے کا رنگ ایک طرح کا سحر خیز سنہرہ پن لیے ہوئے تھا البتہ ذائقے میں کسی قدر تلخی تھی۔ ابتداً تو اسے دوا سمجھ کر پیتا رہا۔ پھر ایسا لگا جیسے ہر گھونٹ کے ساتھ فرحت اور تازگی کا احساس دوبالا ہوتا جاتا ہو۔ میں نے پوچھا یہ مجرب نسخہ کیا آپ کی اپنی دریافت ہے کہ مجھے اس سے پہلے بھی مختلف قسم کی ہربل چائے پینے کا اتفاق ہوا ہے لیکن فرحت کا اس قدر احساس اور بشاشت کی اس سرعت کے ساتھ واپسی کا اس سے پہلے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔

بولے یہاں بلقان کے علاقے میں اور خاص طور پر سلووینیا میں ایسی جڑی بوٹیوں اور فرحت بخش پھولوں کی بہتات ہے۔ بازار میں مختلف قسم کی ہربل چائے خوبصورت پیکٹوں میں ملتی ہیں البتہ وہ سب خشک پتے ہوتے ہیں اور ہماری چائے تازہ پھولوں اور جڑی بوٹیوں سے بنی ہے اس لیے اس کی اثر انگیزی کا احساس فی الفور ہوتا ہے۔ علی کودرا آج بالکل ہی مختلف سے آدمی لگے۔ ان کی دلجوئی، غمگساری اور تیمارداری پر بے پناہ پیار آیا۔ کہاں وہ اول جلول سا کودرا؛ الجھے بال، پراگندہ لباس، اہل مجلس سے کٹے کٹے اور دور دور رہنے کا انداز اور کہاں میری ناسازیٔ طبیعت کا اتنا خیال، ایسا لگا جیسے ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ خاص طور پر انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ جنگ بوسنیا کے دوران جس شخص نے ہندوستان میں بوسینا کے حق میں ملک گیر عوامی تحریک چلائی تھی وہ میں ہی تھا تو فرط جذبات میں ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ بولے ان باتوں سے امید بندھتی ہے کہ بحیثیت امت ہمارا سب کچھ تباہ نہیں ہو گیا ہے۔ ہمارے اندر وہ بنیادی جوہر موجود ہے جو مراقش سے ملیشیا تک ہمیں جسدِ واحد میں تبدیل کردے۔ البتہ بعض مسائل بڑے سنگین ہیں

جب تک ان کا ادراک نہ ہوا امید بندھی رہتی ہے اور جب ان کی سنگینی کا اندازہ ہو تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ یہ کہہ کر علی کودرا اچانک کچھ بجھ سے گئے۔ ایسا لگا جیسے اب ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں رہ گیا ہو۔ ان کے چہرے پر پرانی ناامیدی واپس آ گئی۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ خیالات کی کوئی افسردہ لہر انہیں پھر آ لے اور وہ اچانک حسبِ سابق مجلس سے اٹھ کھڑے ہوں۔

'ایک بات پوچھوں؟' میں نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔ یہ آپ نے اپنے اردگرد کیا طلسم بُن رکھا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے کو ملی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ نظامِ جبر کے باغی ہیں، ان لوگوں میں سے ہیں جو علائق سے کنارہ کشی کرتے اور جنگلوں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کوئی کہتا کہ ذہنی خلل کے شکار ہیں اور کسی کی رائے تھی کہ آدمی تو پڑھا لکھا ہے، باتیں پتے کی کرتا ہے، البتہ کثرتِ غور و فکر کے سبب اس کی کوئی چُول ڈھیلی ہو گئی ہے۔ یہ سن کر علی کودرا کے چہرے پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ انہوں نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولے تم نے جالینوس کا وہ واقعہ نہیں سنا ہے کہ جب بادشاہ نے اسے قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا، اس کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ایسی صورت میں وہ بادشاہ کے غضب کا مستحق ہوتا۔ اور اگر قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر لیتا تو آزاد منش جینے کا لطف جاتا رہتا۔ اس نے اس مصیبت سے بچنے کی راہ یہ نکالی کہ بچوں کی طرح لکڑی کے ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اور لگا مختلف قسم کی طفلانہ آوازیں نکالنے۔ بہت جلد یہ خبر پھیل گئی کہ جالینوس کا دماغ چل گیا ہے لہٰذا بادشاہ کو اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ جبر جب ناقابلِ برداشت ہو جائے اور آزاد زندگی کی مسرتیں ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوں تو رہبانیت اور دیوانگی آخری پناہ گاہ رہ جاتی ہے۔ ابن الہیثم جب فاطمی خلیفہ کے حکم پر قاہرہ بلائے گئے اور ان کے ذمہ دریائے نیل کے رخ موڑنے کا کام سونپا گیا تو اس اسکیم پر بہت کچھ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلیفہ کی حکم عدولی کی ایک ہی شکل ہے کہ وہ اپنی حرکات و سکنات سے اپنا ذہنی توازن کھو دینے کا یقین دلا دیں۔ ابوحامد الغزالی بھی جب اپنے سیاسی مربی نظام الملک کے قتل کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے بغداد سے فرار اختیار کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے تارک الدنیا ہونے کا پرشور پروپیگنڈہ کیا اور حج کے بہانے بغداد سے نکل آئے۔ سو یہ جو تم بہت سے لوگوں کے بارے میں ترکِ دنیا کی باتیں سنتے ہو اور انہیں رہبانیت کے ہالے میں گھرا دیکھتے ہو تو یہ سب کچھ ایک طرح کا فریبِ نظر ہے، حقیقت وہ کچھ نہیں ہوتی جو تمہیں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہے۔

لیکن جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو آپ اپنے انداز و اطوار سے واقعی ایک راہب لگتے

تھے۔

بولے اگر کسی خول میں زیادہ دنوں تک چھپے رہیں تو وہ خول آپ کی شخصیت کا جز بن جاتا ہے۔ پھر میں ایسے حالات سے گزرا کہ میرا دل فی نفسہٖ زندگی سے مایوس سا ہو گیا۔ بہت دنوں بعد کل آپ سے گفتگو کے دوران ایسا لگا جیسے غور وفکر کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہو۔ بہت کچھ سوچنا ابھی باقی ہو بلکہ یہ کہئے کہ آپ کی رجائیت سے میری قنوطیت مسلسل لڑتی رہی ورنہ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے بوسنیا کی جنگ جیتی، یورپ کے عین قلب میں مسلم ریاست کا خواب سچ کر دکھایا لیکن اس فتح کے بعد جب ہم نے اپنے مرشد کے عزائم کو پسپا ہوتے دیکھا۔ احیائے اسلامی کے عالمی منصوبے کو خود اہل اسلام کے ہاتھوں تاراج ہوتے دیکھا تو ایسا لگا جیسے ہماری ساری قربانیاں رائگاں گئی ہوں۔

بوسنیا کے حالات یقیناً انتہائی سنگین تھے۔ ڈھائی تین لاکھ لوگ قتل عام کا شکار ہوئے پھر جو لوگ ان کربناک مناظر سے خود گزرے ہوں ان کے دل ودماغ پر اس کا اثر فطری ہے۔ لیکن یہ جو آپ کے اندر کبھی کبھی میں ہلا مارنے والی شکست خوردگی دیکھتا ہوں اور جس کے سبب آپ خودکشی جیسے انتہائی اقدام پر بھی سوچنے پر مجبور ہوئے، کیا کبھی آپ نے اس کا تجزیہ کرنے کی بھی کوئی کوشش کی؟ میں نے علی کودرا کے ذہن میں راست جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے میں ذہنی اور فکری سطح پر جو لکھی لڑائی لڑتا رہا ہوں۔ میدانِ جنگ میں دشمن کی گولہ باری کے دوران مزاحمتی چوکیوں پر ڈٹے رہنا کچھ مشکل نہیں ہوتا لیکن جب آپ نظری طور پر گومگو کی کیفیت میں ہوں، آپ کا وجود اندر سے مستحکم نہ ہو تو قلب ونظر کی یہ خلش آپ کو اندر سے کھوکھلا کیے دیتی ہے۔

اگر آپ اس خلش کی وضاحت کر سکیں تو شاید میرے لیے اس پورے تناظر کا سمجھنا آسان ہو۔

میری اس گذارش پر علی کودرا نے چند ثانیے کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر بولے سمجھ میں نہیں آتا بات کہاں سے شروع کروں۔ یہ ۱۹۷۹ء کی بات ہے۔ مارشل ٹیٹو کے ایام حکومت میں احیائی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ میں چھپتا چھپاتا عمرے کے بہانے سعودی عرب جا پہنچا۔ بعض احباب نے ایران کی راہ لی اور بعضوں نے یورپ کے مختلف ملکوں میں پناہ حاصل کی۔ میرے ذمہ سعودی عرب میں بوسنیائی مشن کے لیے حمایت کا حصول تفویض ہوا تھا۔ خیال ہوا کہ عربی زبان سے جب تک کماحقہ واقفیت نہ ہو میں کوئی مفید خدمت انجام نہ دے سکوں گا سو اس خیال سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کوئی سات سال ایک

طالب علم کی حیثیت سے میں نے سبقاً سبقاً پہلی مرتبہ اسلام یہیں پڑھا۔ عام طالب علموں کے مقابلے میں یونیورسٹی سے باہر ریاض اور مکہ کے شہروں میں با اثر علماء سے میرے روابط کے امکانات کہیں زیادہ پیدا ہوگئے۔ اس لیے کہ میری حیثیت ایک طالب علم سے کہیں زیادہ بوسنیائی مشن کے نمائندے کی تھی اور اس لیے میں سعودی علماء کی شفقت ومحبت کا کہیں زیادہ سزاوار ٹھہرا۔ ابتداً تو میرا یہ تاثر تھا کہ سلفی علماء ہی منہج سلفِ صالح کے سچے امین ہیں کہ وہ براہ راست کتاب وسنت سے استفادے کے داعی اور وکیل ہیں۔ ان کے مقابلے میں بوسنیائی علماء کی حنفیت ایک جامد اور ہیچ شئی معلوم ہوئی۔ ۱۹۸۹ء میں یوگوسلاویہ ٹوٹنے کے بعد جب میں وطن واپس پہنچا تو اس جذبہ سے سرشار تھا کہ حنفی صوفی اثرات کے حامل بوسنیائی مسلمانوں کا عقیدہ درست کیا جائے۔ ہمارے بعض احباب میری تقلیب نظری پر بڑے متوحش ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس وقت ان نظری مباحث کو چھیڑنے یا مقامی علماء کو ان مناقشوں میں مشغول کرنے کے بجائے مستقبل کے بوسنیا کی فکر کریں۔ میری تربیت جس نہج پر ہوئی تھی میں خواہی نخواہی کتاب وسنت کے تمسک کے حوالے سے ان نظری مباحث کو چھیڑ بیٹھتا لیکن چونکہ سعودی عرب میں علماء سے میرے ذاتی مراسم تھے اور میں نے انہیں بوسنیا کی حمایت کے لیے تیار کرنے میں کلیدی رول انجام دیا تھا اس لیے میری باتوں کو انگیز کیا جاتا رہا۔ صوفی اور حنفی حلقوں کے علاوہ میری جارحانہ خطابت کا ایک ہدف اہل تشیع کا اسلام ہوا کرتا تھا۔ گوکہ بوسنیا میں اہل تشیع کی کوئی آبادی نہ تھی لیکن ایران سے ہمارے ابتدائی رابطوں کے سبب بعض احباب اہل تشیع کی مدح سرائی کرنے لگے تھے۔ میرے نزدیک اہل تشیع کا اسلام یکسر لائق استرداد تھا۔ شیخ بن باز اور شیخ جبرین جیسے علماء کی مجلسوں میں جب بھی اہل تشیع کا ذکر آیا میں نے دیکھا کہ ان کا موقف بڑا واضح تھا۔ وہ اہل تشیع کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ اہل حدیث علماء کے نزدیک اہل تشیع روافض میں سے تھے جن کے واجب القتل ہونے پر روایتیں موجود تھیں۔ ایک بار مدینہ یونیورسٹی میں ایک طالب علم نے مہدی کے مسئلہ پر ایک مقالہ پیش کیا۔ بڑی زوردار بحث رہی۔ پتہ یہ چلا کہ مہدی کی آمد پر شیعہ اور سنّی دونوں متفق ہیں۔ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ مہدی اہل بیت میں سے ہوگا۔ البتہ شیعوں کی یہ خام خیالی ہے کہ انہیں مہدی کی معیت حاصل ہوگی کہ وہ اپنے عقائد باطلہ کے سبب دائرہ اسلام سے باہر جا پڑے ہیں۔ ردِ روافض کے ضمن میں ہمیں یہ باتیں ازبر کرائی گئیں کہ شیعہ ختم نبوت کے انکاری ہیں، وہ ملہم اور محدَّث کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے بارہ اماموں کو آسمانی وحی سے سرفراز سمجھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عصمت قرآن کے انکاری ہیں ان کا ماننا ہے کہ اصل قرآن

جو موجودہ قرآن کی تقریباً تین گنا ضخامت لیے ہوئے تھا اور جس میں اہل بیت کی مدح اور ان کے استحقاقِ خلافت پر بے شمار قرآنی نصوص موجود تھے وہ امام غائب اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ یہ وہ تصور دین تھا جو میں مدینہ کی مشہور زمانہ درسگاہ سے لے کر نکلا۔ میرے نزدیک دین کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہ تھی کہ گمراہ فرقوں، غالی صوفیوں اور روافض کا عقیدہ درست کیا جائے، انہیں راہِ راست پر لایا جائے۔ غالباً یہ ۱۹۸۷ء کی کوئی شام تھی جب ہمیں مدینہ یونیورسٹی میں اچانک یہ خبر ملی کہ امت کا ایک بطل جلیل اور اس یونیورسٹی کے سابق طالب علم احسان الٰہی ظہیر پاکستان میں ایک عوامی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے قاتلانہ حملے کا شکار ہو گئے۔ علاج کی غرض سے انہیں ریاض لایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ شیخ بن باز نے اپنے عزیز شاگرد کا جنازہ پڑھایا جس میں بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔ کسی کی موت پر ایسا انبوہِ عظیم میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی کہیں نہیں دیکھا۔ میں نے احسان الٰہی ظہیر کی بعض کتابیں جو شیعیت، قادیانیت اور بریلویت وغیرہ پر تھیں، پہلے دیکھی تھیں۔ اب جو ان کی موت پر زبردست دھول اٹھی تو ان کی کتابوں میں از سرِ نو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس وقت بھی ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں آئی تھی کہ اگر ہماری تقریر و تحریر کی جارحیت مختلف فرقوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کا سبب ہوئی تو ہم من حیث الامت ایک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کی مجلسوں میں جب بھی اس اندیشے کا ذکر کیا، ان کی طرف سے یہی جواب ملا کہ عقیدے پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی اور سیاسی مصالح کا خیال رکھنا حکمرانوں کی مجبوریاں ہیں، طبقۂ علماء کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی طرح کی مداہنت سے کام لے۔ سلف صالحین کی اتباع اور کتاب وسنت سے تمسک کا نعرہ اتنا سحر انگیز تھا کہ میں داخلی خانہ جنگی کے اس اندیشے کو مسلسل نظر انداز کرتا رہا یہاں تک کہ قدرت نے میرے لیے ایران جانے کا سامان کر دیا۔

آپ اہل تشیع کے زبردست ناقد تھے ایرانی روابط کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے پھر ایران جانے کی کیا تقریب نکل آئی؟

فرمایا: میں ۱۹۹۰ء میں باقاعدہ بوسنیا واپس چلا گیا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں بوسنیا کی اعلانِ آزادی کے بعد ہم لوگ اچانک دشمنوں کے حصار میں آ گئے۔ چھ ماہ تک تو کسی طرح ہم نے مزاحمت جاری رکھی۔ پھر اسلحوں کی کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ بیرونی دنیا سے اسلحوں کے حصول پر پابندی تھی۔ سربوں کے پیچھے ایک حکومت تھی اور ہمارے لیے اقوامِ عالم کے پاس زبانی ہمدردی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ مسلم ممالک سے غذائی

اشیاء اور امدادی ساز وسامان کے پیکٹس تو پہنچ رہے تھے لیکن اسلحہ، جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، کوئی ہمیں دینے کو تیار نہ تھا۔ ایسی صورت میں حسن جیجک کی معاونت کے لیے مجھے ایران بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ حسن جیجک پہلے بھی کئی بار ایران جا چکے تھے۔ اعلیٰ قیادت سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جب تک طبقۂ علماء سے ہمارے روابط گہرے نہ ہوں، سیاسی امداد میں استحکام اور ثبات نہیں آ سکتا۔ ایران میں مجھ پر ایک نئی دنیا آشکار ہوئی۔ مجالس عزا کے عوامی اجتماعات، اہل بیت کی محبت کے والہانہ اظہار کے دلکش نظارے جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تو مجھے ایسا لگا کہ ان کے بارے میں ہماری انتہا پسندانہ رائے شاید مبنی بر انصاف نہیں۔ ہماری سفارت کامیاب رہی اور ہم ایک انتہائی نازک وقت میں، جب بوسنیائی ریاست کا چراغ گل ہونے کو تھا، اسلحوں کی کھیپ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جنگ طول کھینچتی گئی، ایران سے فوری روانگی کا کوئی امکان نہ رہا تو اس خیال سے کچھ تو طبقۂ علماء میں اثر ونفوذ کی خاطر اور کچھ اپنی ذاتی علمی دلچسپی کے سبب میں نے قم کے حوضۂ علمیہ میں داخلہ لے لیا۔ ابتداً فارسی زبان میرے لیے ایک بڑا مسئلہ بنی رہی لیکن اس کے بغیر ایرانی علماء سے راست تبادلۂ خیال اور اہل تشیع کے سماجی مظاہر اور مجلسوں کی واقعی تفہیم ممکن نہ تھی سو میں نے بڑی لگن سے فارسی زبان میں بنیادی استعداد پیدا کر لی۔

مگر علماء سے رابطے کے لیے تو آپ کی عربی زبان سے واقفیت ہی کافی ہونی چاہئے تھی۔ کیا ایرانی علماء میں عربی زبان کی تعلیم پر زور کم ہے؟

کبار علماء اور خاص طور پر وہ جنہیں نجف میں تعلیم کا موقع ملا ہے تو یقیناً عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں البتہ جن لوگوں کی تعلیم ایران میں ہوئی انہیں بلادِ عجم کے علماء پر قیاس کیجئے۔ وہ اکتساب واستفادے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن تحریر وتقریر پر قدرت کاملہ نہیں رکھتے۔ پھر میری دلچسپی شیعیت کے سماجی مظاہر کو سمجھنے میں تھی جس میں فارسی زبان وادب اور شاعری کا بڑا اہم رول ہے البتہ مدینہ کی تعلیم سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے پہلے ہی سال عمامہ باندھنے کی اجازت مل گئی۔ کچھ تو عربی زبان کی تعلیم اور کچھ سنّی بوسنیائی شہری ہونے کے سبب اساتذہ کا رویہ میری طرف خصوصی شفقت ومحبت کا تھا۔ انہیں میں نے جتنا قریب سے دیکھا میرے اندر یہ احساس گہرا ہوتا گیا کہ اہل تشیع کے سلسلے میں سعودی علماء افراط وتفریط اور منفی پروپیگنڈہ کا شکار ہیں۔ دو تین سال بعد جب فارسی زبان پر مجھے کسی قدر عبور حاصل ہو گیا، عزا کی مجلسوں میں منقبت سماعی اور نوحہ خوانی کے دوران فارسی شاعری کے زیر وبم اور سحر انگیز آہنگ میں مجھے وہ لطف آنے لگا جس کا اس سے پہلے کسی دینی

مجلس میں کوئی تجربہ نہ ہوا تھا۔ کیا بتاؤں، ایسا لگتا جیسے آپ کا پورا وجود اہل بیت اطہار کی محبت سے سرشار ہو، آپ صدیوں کا فاصلہ طئے کر کے اس عہد میں جا پہنچے ہوں جہاں حسین مظلوم کی شہادت کا واقعہ ابھی ابھی پیش آیا ہو۔ اسے نغمے کی زبان کا سحر کہئے کہ ائمہ اہل بیت کی مظلومی ایک تازہ اور زندہ عمل معلوم ہوتی۔ البتہ قم میں اپنے قیام کے دوران میں اپنی سنیت کو بڑی حد تک سنبھالے رہا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اہل تشیع کے سلسلے میں نفرت وعناد کی وہ کیفیت باقی نہ رہی۔ شب وروز اسی طرح گزرتے رہے۔ اس دوران نہ مجھ سے کسی نے شیعہ بننے کے لیے کہا اور نہ ہی میری سنیت پر ہمارے اساتذہ میں سے کسی نے انگلی اٹھائی۔ ایک دن میں فاطمہ معصومہ کے روضہ پر بیٹھا تھا۔ اسی دوران عرب زائرین کا ایک گروپ بھی وہاں زیارت کے لیے آیا۔ وہ لوگ عربی زبان میں روضہ کی تاریخ پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں بوسنیا کا رہنے والا ہوں اور تعلیم کی غرض سے قم میں مقیم ہوں تو انہیں میری ذات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ میں طالب علم رہ چکا ہوں تو ان کی دلچسپی حیرت میں تبدیل ہوگئی۔ ان میں ایک صاحب احمد تیجانی سماوی تھے، جن کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے عالم دین ہیں جو پہلے سنی تھے اور اب باقاعدہ شیعہ ہو گئے ہیں۔ بولے علی! تمہارا نام تو پہلے سے ہی مشیت نے علی رکھا ہے۔ اہل بیت کے ناصر ومددگار بن جاؤ، یہی اصل دین ہے۔ مہدیٔ آخرالزماں، تمہیں خوب معلوم ہے کہ، اہل بیت میں سے ہوں گے۔ پھر تمہیں شیعانِ اہل بیت بننے سے کون سی چیز روکے ہوئی ہے۔ مجھے دیکھو میں بھی تمہاری طرح سنی خانوادے میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں عمرے کے لیے سعودی عرب پہنچا۔ وہاں وہابی علماء کی صحبت میں توحید کے جرعے پیتا رہا مگر میری تشنگی باقی رہی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ وہ حضرات اہل بیت کی تفضیل کے تو قائل ہیں لیکن اہل بیت سے محبت کرنے والوں سے اس قدر بغض وعناد کیوں رکھتے ہیں۔ عرصے تک میں شیعوں کے بارے میں منفی پروپیگنڈے کا شکار رہا۔ اسے ابن سبا کی یہودی سازش کی حیثیت سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ قدرت نے میرے لیے نجف کی زیارت کا سامان پیدا کیا جہاں میں نے سید الخوئی اور باقر الصدر جیسے کبار شیعہ علماء کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ جب میں نے ان لوگوں کو قریب سے دیکھا تو میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ یہ کہتے ہوئے شیخ تیجانی کچھ آبدیدہ سے ہو گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگایا اور بولے خدا تمہارے دل کو اہل بیت اطہار کی محبت سے منور کر دے۔ یہ قصہ سنا کر علی کو درا اچانک خاموش ہو گئے، کچھ دیر دور خلا میں گھورتے رہے جیسے کہانی کا اگلا سرا تلاش کر رہے ہوں۔

میں نے پوچھا: پھر کیا ہوا؟ کیا آپ نے بھی شیعیت اختیار کر لی؟

بولے: یہ کہنا تو مشکل ہے کہ قم میں قیام کے دوران میری سنیت کا رنگ پہلے ہی ہلکا ہو گیا تھا، میں اہل تشیع کی مجالس میں خود کو ایک بے خودی اور سرشاری کی کیفیت میں پاتا۔ مجلسی شاعری اور منقبت سماعی میں میرا انگ انگ ڈوب جاتا لیکن باقاعدہ شیعیت کے اختیار کرنے کا مجھے کبھی پہلے خیال بھی نہ آیا تھا۔ سید تیجانی کی ملاقات نے میرے اندر ایک کشمکش برپا کر دی۔ علماء کی مجلسوں میں اور طلباء سے باہمی مناقشوں کے دوران شیعہ موقف کی حمایت میں اب تک جو دلائل میں سنتا رہا تھا اور جس کے غیر شافی جواب پا کر میں نے اسے مستقبل کی علمی تحقیق کے لیے رکھ چھوڑا تھا وہ سارے سوالات ایک بار پھر مرصع ہو کر میرے سامنے آ گئے۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اگر یہ بات سچ ہے کہ غدیر خم میں رسول اللہ نے علی کی وصایت اور ولایت کا اعلان کر دیا تھا، جس کا تذکرہ سنی مآخذ میں بھی موجود ہے، تو پھر خلافت کا حق علی کے علاوہ کسی اور کے لیے کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ایک روز جب خطبۂ شقشقیہ پر کلاس میں بحث جاری تھی میں نے استاد سے پوچھا کیا واقعی یہ حضرت علی کا کلام ہے جس میں وہ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ لباسِ خلافت ان کا حق تھا جسے ابوبکر و عمر نے ان سے چھین لیا؟ استاد کا کہنا تھا کہ لہجہ کی بلند آہنگی اور بلاغت اس بات کی گواہ ہے کہ علی کے علاوہ یہ الفاظ کسی اور کی زبان سے نہیں نکل سکتے۔ یہ اسلوبِ عالیہ ان ہی کا وصفِ خاص ہے۔ میں نے کہا مگر نہج البلاغۃ کے دو اہم شارحین ابن المیثم البحرانی اور ابن ابی الحدادا سے حضرت علی کا قول نہیں مانتے۔ میرے اس اعتراض پر استاذ محترم کچھ خاموش سے ہو گئے، بولے یہ ایک الگ بحث ہے اس کا کبھی اور احاطہ کیا جائے گا۔

تو کیا پھر کبھی اس مسئلہ پر کسی تفصیلی گفتگو یا علمی تحقیق کا موقع مل سکا؟

بولے کلاس میں تو اس کا کوئی موقع نہ ملا البتہ جب بھی میں نے ان امور پر کبار اساتذہ سے گفتگو کی تو ان کے اندر ایک طرح کا اعتدال پایا۔ وہ تمام روایتوں کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے، ان کی تحقیق و تنقید کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ البتہ عام اساتذہ جو مدرسانہ طرز فکر کے حامل تھے اور پُر جوش طلباء کی مجلسوں میں ان باتوں کا خاصا تذکرہ رہتا کہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی اہل بیت پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ تین چار کے علاوہ تمام صحابہ حصول دنیا میں لگ گئے اور باہمی سازشوں سے مسند خلافت پر قبضہ کر لیا۔ علی خلافت سے محروم ہوئے۔ فاطمہ فدک کا مقدمہ لیے ارباب اقتدار کو انصاف کی دہائی دیتی رہیں، عمر اور ان کے اصحاب فاطمہ کا گھر جلانے کے لیے آ گئے یہاں تک کہ فاطمہ بلبلا کر پکار اٹھیں کہ میرے باپ اور رسولِ خدا آپ کے دنیا سے جاتے ہی

آپ کے اصحاب نے ہمارے ساتھ بڑا سخت برتاؤ کیا۔ طلباء کے ان باہمی مناقشوں میں اس بات کا تذکرہ بھی رہتا کہ قائم اپنے ظہور کے بعد اہل بیت کے دشمنوں سے بدلہ لیں گے۔ عائشہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور قائم کے حکم سے انہیں بار بار عذاب دیا جائے گا۔ بعض غالی کتابوں میں ایسی باتیں بھی پڑھنے کو ملتیں کہ عائشہ کا گناہ صرف آیت افک کے حوالے سے نہیں بلکہ ان پر رسول اللہ کے قتل کی سازش رچنے کا بھی الزام ہے کہ ان واہی تباہی روایتوں کے مطابق عائشہ نے زہر دے کر رسولؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ میرے لیے یہ تمام باتیں قابل تحقیق اور محل نظر تھیں اور جب بھی میں نے ان امور پر کبار اساتذہ سے گفتگو کی انہوں نے ان امور سے دامن بچانے کی تلقین کی البتہ پر جوش نوجوان اساتذہ اور مناظرہ پسند طلباء ان مسائل کو مدارِ شیعیت باور کرانے سے باز نہ آئے۔ میرے لیے مصیبت یہ تھی کہ علی کی وصایت وولایت اور انہیں خلافت سے محروم کرنے کے شواہد روایات وآثار کی سنی کتابوں میں کثرت سے موجود تھے مثلاً صرف بخاری کو لیجئے جہاں کم از کم چھ جگہوں پر مختلف اسالیب میں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ بوقت وصال رسول اللہ وصیت لکھوانے کے لیے قلم اور کاغذ طلب فرما رہے تھے جسے حضرت عمر کے اس اصرار کے سبب کہ حسبنا کتاب اللہ عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

پھر تو آپ کے لیے شیعہ ہو جانا ہی قرین حق تھا۔ آپ اہل قم کو کیسے طرح دے گئے؟

میرے اس سوال پر بھی علی کودرا کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ بولے: شیعہ ہونا بڑا مسئلہ نہ تھا، مسئلہ ان premises کا تھا جن کی بنیادوں پر مستقبل کے شیعہ علماء اپنے مسلک کے فروغ کا پروگرام بنا رہے تھے جو خود بعض معتدل کبار علماء کے نزدیک لائق تحقیق تھیں جیسا کہ میں نے خطبۂ شقشقیہ کے سلسلے میں ذکر کیا، پھر تیجانی سماوی کی طرح میرا مسئلہ آسان نہ تھا وہ اولاً صوفی سنی تھے پھر وہابی اثرات میں آئے اور پھر شیعیت کو اپنے لیے منتخب کر لیا۔ ایک خانے سے دوسرے خانے میں منتقل ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب آپ حق کی تلاش میں ایک چوکھٹے کو خیر باد تو کہتے ہیں لیکن دوسرے چوکھٹے میں پوری طرح فٹ نہیں بیٹھتے۔ حنفیت اور سنیت تو قم کے دورانِ قیام میرے اندر سے بڑی حد تک جاتی رہی تھی لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ شیعیت کے سماجی اور تہذیبی مظاہر خاص طور پر شعر ونغمہ میں بے خود ہو جانے کے باوجود میں شیعیت کے نظری چوکھٹے میں اپنے آپ کو پوری طرح فٹ نہ کر سکا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ شروع سے میرے مرشد علیجاہ عزت بیگو وچ نے مجھے احیائے اسلام کے عالمی منصوبے کا خواب جس طرح دکھایا تھا اس میں عرب وعجم، شیعہ سنّی جیسی سرحدیں تحلیل ہو جاتی تھیں۔ مرشد کو شاید ہمارے داخلی فکری بحران کا اس قدر اندازہ نہ تھا جس کا

ادراک مجھے وہابی اور شیعی دنیاؤں کے درونِ خانہ مطالعہ کے بعد ہوا۔ اب میں اس بات کو کیسے بیان کروں کہ معتدل اور خدا ترس علماء خواہ وہ سنّی وہابیوں میں ہوں یا اثناعشری شیعوں میں، وہ ریاض اور مدینہ میں رہتے ہوں یا قم اور تہران میں، ان کا تمام خلوص، ان کی للٰہیت اور مل بیٹھنے کی تمام کوششیں اس لیے کامیاب نہیں ہوسکتیں کہ ان دونوں فرقوں کی کتابوں میں ایسی متحارب روایتیں اور ایسے اشتعال انگیز بیانات لکھ دیئے گئے ہیں جو رہتی دنیا تک باہمی مناقشے اور خانہ جنگی کو غذا فراہم کرتے رہیں گے۔

پھر جو لوگ لاشیعیہ ولاسنیۃ کا نعرہ بلند کرتے رہے ہیں کیا وہ کسی فریب نظر کا شکار ہیں؟ میں نے ان دو دنیاؤں سے ان کی گہری واقفیت کے سبب اس نازک مسئلہ پر ان کی رائے جاننا چاہی۔

بولے: فریب نظر تو نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے خوش کن نعروں کے پیچھے بعض اہم مسائل کے فوری طور پر التوا کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ انقلاب ایران کے ابتدائی دنوں مین جس زور وشور کے ساتھ لاشیعیۃ ولاسنیۃ کا نعرۂ پرفریب بلند ہوا اس سے بظاہر تو یہ لگتا تھا کہ خمینی کی قیادت میں نئے ایران نے شیعیت کے خول سے نکلنے کا عزم مصمم کرلیا ہے۔ ابتدائی دنوں میں انقلاب کو اکسپورٹ کرنے کی باتیں بھی ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا گویا اس مرد بزرگ کی قیادت میں عالمِ اسلام کی از سرنو شیرازہ بندی کا کام اپنے اتمام کو پہنچے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ خمینی نے شیعیت کے بنیادی چوکھٹے میں انتظارِ محض کے کارِ لایعنی کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم محض انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کے بجائے اپنے اقدامی عمل سے امام زماں کی آمد کے لیے سازگار ماحول تیار کریں۔ شیعہ فکر میں اس بنیادی تبدیلی نے ایرانیوں کی امت منتظر کو ایک اقدامی امت میں تبدیل کردیا۔ اور چونکہ عالمِ اسلام میں ایک بڑی تبدیلی جمہور مسلمانوں کو ساتھ لیے بغیر ممکن نہ تھی، سوانہوں نے لاشیعیہ لاسنیہ، اسلامیہ اسلامیہ جیسے سحر انگیز نعرے تخلیق کیے۔ جس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۹۳ء کے ابتدائی ایام میں جب بوسنیائی تحریک مزاحمت پر ابتلاء وآزمائش کی گھڑیاں آئیں تو ہمیں اس وقت پوری دنیا میں اسلامی ایران امیدوں کا واحد جزیرہ نظر آیا۔ پھر ابتدائی ایام میں ایران نے جس طرح ہماری حوصلہ افزائی کی اور جس دینی اخوت کا مظاہرہ ہوا اس کے سبب وحدت اسلامی کے احیاء کی بڑی امید پیدا ہوگئی۔ خمینی جب تک زندہ رہے ایران میں شیعیت اور پان اسلام ازم کے مابین نظری معرکہ آرائی جاری رہی۔ آخری دنوں میں حالات پر ان کی گرفت کمزور پڑنے لگی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ایران اور عراق کے مابین برادر کشی کی آٹھ سالہ جنگ نے خمینی کو اصل انقلابی ایجنڈے پر پوری توجہ کا موقع نہ دیا۔ رفتہ رفتہ

مستکبر ین کے ذریعے تھوپی گئی اس جنگ پر مستضعفین اور مستکبر ین کے مابین معرکہ آرائی کے بجائے شیعہ سنی کی باہم رزم آرائی کا رنگ غالب آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد اسلامی کے لیے وہ بنیادی اقدامات نہ کیے جا سکے جن کے لیے شیعیت کے نظری قالب میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔

یہ باتیں آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں۔ کیا خمینی شیعی قالب میں کوئی بڑی تبدیلی لانا چاہتے تھے؟ میں نے تخصیص کے ساتھ ان سے جاننا چاہا۔

بولے جی ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔ خمینی ایک غیر معمولی انسان تھے۔ انھیں ان کی پچھلی تحریروں پر قیاس نہ کیجئے جس میں وہ ایک روایتی شیعہ عالم نظر آتے ہیں اور عام شیعہ علماء کی طرح اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ ان لائمتنا مقامالا یبلغہٗ ملك مقرب و لانبی مرسل۔ ان کی اصل عبقریت تو ان خطبات میں دیکھنے کو ملتی ہے جو انھوں نے انقلاب کے بعد مختلف مواقع پر نشر کیے اور جہاں ان کی کوشش یہ رہی کہ شیعی علامتوں کو بین الملی اسلامی علامتوں کے طور پر پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر عید غدیر کے موقع پر روایتی شیعہ ذاکرین اور علماء کی طرح حضرت علی کی حق تلفی کا نوحہ کرنے اور سنی موقف سے ٹکرانے کے بجائے وہ غدیر کو قیامِ انصاف کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غدیر کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسی حکومت کے قیام کی جدوجہد کریں جہاں کسی کی حق تلفی نہ ہو اور لوگوں کو بھر پور انصاف مل سکے۔ خمینی اس حقیقت سے ناآگاہ نہیں تھے کہ روایت کی کتابوں میں رطب و یابس کی بھر مار ہے اور ایسی روایتوں کی کمی نہیں جو سنیت تو کجا خود حقیقی شیعیت کے منافی ہیں۔ انھوں نے دبے لفظوں میں ہی سہی ایک بار اس خیال کا اظہار کیا کہ بحار الانوار جیسی کتابوں میں جہاں ہر طرح کی باہم متضاد روایتیں جمع ہو گئی ہیں ان کی نقد و اصلاح کا کام انجام دینے کی ضرورت ہے۔

مگر اس قسم کی باتیں تو دوسرے شیعہ علماء بھی کرتے رہے ہیں مثلاً مرتضیٰ مطہری کو لیجئے جو ذاکرین کی قصہ گوئی کا شدت سے ابطال کرتے ہیں اور جن کا کہنا یہ ہے کہ شیعہ مجلسوں میں ایسی ایسی واہی تباہی روایتیں بیان ہوتی ہیں جن سے خود شیعیت کی اصل تصویر مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حاجی نوری نے لولو و مرجان میں لکھا ہے کہ صفین کی جنگ میں فضل بن عباس نے ایک شخص کو ہوا میں اچھال دیا، پھر یکے بعد دیگرے وہ اسی طرح اسّی لوگوں کو آسمان میں پھینکتے رہے۔ کہا جاتا ہے کی جب آخری آدمی پھینکا گیا ہے تو اس وقت تک پہلا آدمی واپس نہ گرا تھا۔ پھر آپ تلوار سونت کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ گرنے والے گرتے رہے اور ان کی

تلوار سے دو دو ٹکڑے ہوتے رہے۔

جی ہاں ذاکرین کا مت پوچھیئے بڑی معجز بیانیاں ہیں ان کی مجلسوں میں۔ جبھی تو وہ بڑے بڑے مجمع کو اپنی مٹھی میں لیے رہتے ہیں۔ جدھر چاہتے ہیں ان کے جذبات واحساسات کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ میں خود بھی قم اور تہران میں ایسی مجلسوں کا حظ اٹھاتا رہا ہوں لیکن اصل لطف تو ان کی شاعری کا ہے۔ شعر سماعی کا جو لطف فارسی زبان میں ہے شاید اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ میں نے فاطمہ معصومہ کے مزار پر اور جمکر ان کی مسجد میں منقبت سماعی کے جو مظاہر دیکھے ہیں واللہ شعر ونغمہ کے انبساط کا وہ تجربہ مجھے کہیں اور نہیں ہوسکا۔ حرم فاطمہ کی زیارت کے دوران زائرین کی آہ وبکا اور گریہ وزاری ومناجات کے مناظر مجھے کچھ زیادہ متاثر تو نہیں کرتے کہ میرے اندر کی وہابیت شاید اسے حرم تسلیم کرنے میں مانع رہی، البتہ نوحے اور منقبت کی مجلسوں میں جب کوئی پرسوز نغمہ گو بجتا تو ایسا لگتا جیسے میرے وجود کا رواں رواں ایک سحر انگیز انبساط میں سرشار ہو۔ واللہ فارسی نغموں کی اثر انگیزی کا کوئی جواب نہیں۔ ایک بار مشہد سے زائرین کا ایک گروپ آیا ہوا تھا جس میں علماء وفضلاء کی ایک بڑی تعداد تھی، ان حضرات نے بڑے پرسوز انداز سے منقبت کے چند اشعار پڑھے۔

دختر، جز فاطمہ نیاید چون این — صلب پدر را وہم مشیمہ مادر
دختر، چون این دو از مشیمہ قدرت — نامد ونابد دگر ھمارہ مقدر
آن یک، امواج علم را شدہ مبدا — وین یک، افواج حلم راشدہ مصدر
آن یک موجود از خطابش مجلی — وین یک، معدوم از عقابش مستر
آن یک برفرق انبیا شدہ تارک — وین یک اندر سر اولیا را مغفر
آن یک در عالم جلالت ''کعبہ'' — وین یک در ملک کبریائی ''مشعر''

کچھ تو اشعار کی اثر انگیزی، کچھ لہجے کی پرسوزی اور کچھ حرم فاطمہ میں حضوری کی کیفیت کے سبب اہل محفل پر ایسی بے خودی طاری ہوئی کہ بس نہ پوچھئے، بیان سے باہر۔ ایسا لگا جیسے زمان ومکان کا حجاب جاتا رہا ہو اور پھر جب نغمہ زن نے

''لم یلد'' م بستہ لب وگرنہ بگفتم — دخت خدا ایند این دو نور مطہر

کا شعر پڑھا تو اس کی ہر تکرار میں ایسا لگا کہ کہنے والے نے وہ بات کہہ دی ہو جو انسانی نطق وگویائی اور فکر رسا کی آخری منزل ہو۔ بقول شاعر اگر لـم یـلـد نے میرے ہونٹ نہ سی دیئے ہوتے تو میں کہتا کہ یہ دو فاطمہ یعنی

فاطمہ زہرا اور فاطمہ معصومہ دراصل خدا کے دو پاکیزہ نور، بلکہ اس کی بیٹیاں ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ کسی اور کے اشعار نہیں بلکہ خمینی مرحوم کے تحریر کردہ قصیدے کا حصہ ہیں۔

شعر و نغمہ کے ذکر پر ایسا لگا جیسے علی کودرا کے اندر کا مغنی جاگ اٹھا ہو یا شاید وہ قم کی یادوں میں کھو گئے ہوں۔ انھوں نے ایک خاص لَے میں یا کریمہ! یا کریمہ! کی دُھن پر اشفعی لنا، اشفعی لنا فی الجنۃ کی صدا بلند کی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر ایک زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولے اگر شعر و نغمہ کی فراوانی نہ ہو تو زندگی بڑی سونی سونی اور ویران سی لگتی ہے۔ مشہد ہو یا قم، نجف ہو یا کربلا شعر و نغمہ نے یہاں انبساط کا بڑا سامان کر رکھا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی، آپ فاطمہ معصومہ اور ائمہ اہل بیت کی شفاعت پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں، اگر آپ ان تجربوں سے گزرے نہیں تو آپ روحانی انبساط کے بعض قیمتی تجربوں سے محروم رہ گئے۔ یہ کہتے ہوئے علی کودرا نے میری طرف دیکھا جیسے وہ میرا تاثر جاننے کے خواہاں ہوں۔ میں نے سوچا کہ علی کودرا شعر و نغمہ کے سحر دلفریب کا ذوق رکھتے ہیں اگر گفتگو کا رُخ ادھر مڑ گیا تو پھر اصل موضوع پر بات نہ ہو سکے گی اور میں اس موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا سو یہ سوچ کر میں نے گفتگو کا رُخ آیت اللہ خمینی کی طرف موڑ دیا۔

میں نے پوچھا کہ خمینی کے جس قصیدے کا ذکر ابھی آپ نے کیا، کیا اس سے ایسا نہیں لگتا کہ وہ اپنی تمام مجتہدانہ مساعی کے باوجود روایتی شیعہ فکر کا ہی توسیعہ تھے؟ انھوں نے ان علامتوں پر سوالیہ نشان قائم کرنے کے بجائے انھیں استحکام بخشا۔

ایک حد تک تو آپ کا اعتراض درست ہے، لیکن یہ محض اس کا ظاہری پہلو ہے۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ نئی صبح کے قیام کا ہر داعی ایک شب تاریک سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ وہ اس روایت کے اندر رہ کر اس کی تقلیب کا بیج ڈالتا ہے۔ خمینی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شیعی فکر کو جو اب تک تاریخ کے حاشیہ پر امام غائب کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی نہ صرف یہ کہ جہد و عمل کی راہ پر ڈالا بلکہ اسے جمہور مسلم فکر کی قیادت پر آمادہ کیا۔ خمینی کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ عالم اسلام کی قیادت کے لیے شیعی فکر میں بعض بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ اب دیکھئے انقلاب ایران سے پہلے اصولی اور اخباری علماء کے نظری مناقشوں نے اصولی موقف کی برتری تو ثابت کر دی تھی لیکن مختلف مراجع تقلید اپنے اپنے حلقۂ اثر تک محدود تھے۔ خمینی نے ولی فقیہ کی حیثیت سے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ ایرانی حکومت غیاب پیغمبر میں

رسول اللہ اور امام کے نائب کی حیثیت سے اسی مرکزیت اور اختیارات کی حامل ہے۔ شیعہ فکر جو مختلف ارتقائی مراحل سے گزر کر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک انجمادِ دائم کا شکار تھی اسے خمینی کے فکری اور عملی اقدامات نے امت مسلمہ کی امیدوں کا محور و مرکز بنا دیا۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے پہلو بدلا، چند ثانیے خاموش رہے جیسے کوئی اہم نکتہ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر فرمایا اگر شیعہ فکر کی ارتقائی تاریخ پر ہماری نگاہیں نہ ہوں تو ہمیں خمینی کے فکری اقدامات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھئے شیعہ فکر میں پہلی بڑی تبدیلی غیبتِ امام کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد شیخ الطائفہ کے ہاتھوں پانچویں صدی ہجری میں اس وقت آئی جب انھوں نے فقہاء کو غیبتِ امام میں نائب کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے کا جواز فراہم کیا۔ کوئی دو سو سال بعد محقق حِلّی کی اجتہادی کوششوں سے فقہاء کو اقامتِ حدود اور حقِ امام کی وصولی اور اس کی تقسیم کا حق ملا۔ کوئی تین سو سالوں بعد محقق الکراکی کی تعبیرات نے علماء کو امام کے نائب العام کی عمومی حیثیت عطا کر دی اور انھیں نائب کی حیثیت سے قیامِ جمعہ کی اجازت عام مل گئی۔ آگے چل کر شہید الثانی کی کوششوں سے علماء کو نائب امام کی حیثیت سے حق امام کی وصولیابی کا جو اختیار مل چکا تھا اس پر یہ اضافہ ہوا کہ علماء کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں حق امام کی تقسیم باطل سمجھی جائے گی۔ انہیں احکام جہاد صادر کرنے کا حق ہوگا جیسا کہ آگے چل کر کاشف الغیتہ کے فتوے سے ظاہر ہوا جنھوں نے امام غائب کے نائب کی حیثیت سے روسی جارحیت کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اب اس پسِ منظر میں خمینی کے فتوے کو ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے ۶ رجنوری ۱۹۸۸ء کو جاری کیا۔ جس میں انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ ایران کی اسلامی حکومت کو رسول اللہ کے نائب کی حیثیت سے وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو تفویض فرمایا اور یہ ایک ایسا اختیار ہے جو دوسرے تمام احکام و اختیارات پر بھاری ہے۔ اب ذرا غور فرمائیں کہ اگر ولی فقیہہ نے امام کی غیبت میں ریاست کی کمان نائبِ رسولؐ کی حیثیت سے سنبھال رکھی ہو اور اسے وہ اختیارات کلی حاصل ہوں جو خدا نے رسول اللہ کو تفویض کیے ہیں اور جن پر ان کے بعد کے خلفاء کا عمل رہا ہے تو پھر امامت اور خلافت کے مسئلہ پر شیعہ اور سنی فکر میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

یہ تو یقیناً بڑا مجتہدانہ اور جرأت مندانہ موقف ہے۔ کیا اس کی انقلابیت اور دور رسی کا شیعہ علماء کو واقعی کوئی اندازہ تھا؟

بولے: ہاں! کیوں نہیں، یہ تو شیعیت کی ایک ایسی تقلیب فکری کا اعلان تھا جس کے بعد شیعی فکر

اپنے خول سے نکل کرامت کی قیادت کا کام اپنے ہاتھوں میں لے سکتی تھی۔ درونِ خانہ اس فتویٰ پر بڑی چہ می گوئیاں ہوئیں۔ بعض تنگ نظر مولویوں کو ایسا لگا جیسے شیعی اور سنی فکر پھر سے ایک محور پر واپس آ رہی ہو۔ اگر یہ discourse کچھ اور آگے بڑھا ہوتا تو دونوں فرقوں کے لیے اپنی اپنی مسموم تاریخ کی از سرِ نو تطہیر کا امکان پیدا ہو جاتا اور کچھ عجب نہیں کہ ہم بہت جلد تاریخ و تعبیر کے تنقیدی محاکمے کے ذریعے تیسری چوتھی صدی سے پہلے والے منظر نامے کو متصور کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ یعنی وہ عہد جب تمام اختلافِ فکر و نظر کے باوجود شیعہ سنی فرقوں کی الگ الگ نظری شناخت قائم نہیں ہوئی تھی۔

پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟ خمینی تو بڑے مقبول قائد تھے۔ ایران سے باہر بھی شیعہ حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔

بولے یہی تو وہ سرالاسرار ہے جس پر عام لوگوں کی نگاہیں نہیں جاتیں اور جو کچھ نظر آتا ہے فی الواقع ایسا ہوتا نہیں۔ ولی فقیہہ کی یہ نئی حیثیت مختلف مراجع تقلید کے لیے جو حق امام کی وصولیابی پر اپنا حق سمجھتے تھے، موت کا پیام تھی۔ ایران سے باہر مرجع تقلید کے مختلف حلقوں کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ان کی مجتہدانہ شان ولیِ فقیہہ کی مرکزیت میں گم ہو جائے۔ دوسری طرف سنی حلقوں میں اس خطرے کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا کہ شیعہ فکر کی یہ انقلابی تبدیلی نہ صرف یہ کہ اسے ملی اسٹیج پر ایک مرکزی قائدانہ رول عطا کر سکتی ہے بلکہ ایک ریاست کی پشت پناہی کے سبب سنی مذہبی قیادت پر بھی شب خون مار سکتی ہے۔ شیعہ اور سنی دونوں حلقے اس غیر معمولی انقلابی اقدام کے اسرار و عواقب کے لیے تیار نہ تھے۔ خمینی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ان کے شاگردوں کے لیے، جن کی تربیت روایتی شیعہ دبستانوں میں ہوئی تھی، نئے راستوں پر چلنا آسان نہ ہوگا۔ وہ دنیا سے افسردہ گئے۔ ان کا احساس تھا کہ انقلاب کے اصل ثمرات حاصل نہیں ہو پائے۔ آپ نے خمینی مرحوم کی وہ مشہور غزل تو سنی ہوگی جو انھوں نے اپنی وفات سے کچھ پہلے کہی تھی:

درِ میخانہ گشایید بہ رویم، شب و روز — کہ من از مسجد و از مدرسہ، بیزار شدم
جامہ زہد و ریا کندم و برتن کردم — خرقہ پیر خراباتی و ہشیار شدم
واعظ شہر کہ از پند خود آزارم داد — از دم رندیِ آلودہ مددگار شدم
بگذارید کہ از بتکدہ یادی بکنم — من کہ با دستِ بتِ میکدہ، بیزار شدم

میرے لیے یہ اشعار نئے نہ تھے۔ میں خمینی مرحوم کے آخری ایام کی افسردگی سے بھی واقف تھا

جس کی عینی شہادت اور مصدقہ خبریں مجھے محبی ڈاکٹر کلیم صدیقی مرحوم کے ذریعے ملتی رہی تھیں۔ان دنوں جب بھی لندن گیا اپنے بزرگ دوست کلیم صدیقی کی مجلسوں میں ایرانی انقلاب کی بلند آہنگی کا تذکرہ رہتا۔وہ اس کے زبردست موید اور وکیل تھے اور بعض معاملات میں ناقد بھی۔البتہ خمینی کی وفات کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔آج علی کودرا سے گفتگو کے بعد اس افسوسناک وقوعہ پر ایک اور شہادت سننے کو ملی۔اے کاش !ان کے شاگردوں کو یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ شیعیت کے خول سے نکلے بغیر اور متحارب تاریخی تناظر کا بے لاگ تنقیدی محاکمہ کیے بغیر امت کی تنظیم نو کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔اے کاش کہ خمینی کی مجتہدانہ فکر اور تقلیبِ فکری کی دعوت متعینہ خطوط پر آگے بڑھ پاتی۔اے کاش کہ یہ مناقشہ ایک بے لاگ علمی روایت کی شکل اختیار کرلیتا۔لیکن یہ سب تو کاش کی باتیں ہیں۔اے کاش کہ اگر تاریخی حوادث پر رنگ آمیزی اور اعتقادات کا سایہ نہ پڑا ہوتا تو آج صورت حال یقیناً مختلف ہوتی ۔ میری نگاہوں میں برسوں پہلے علی گڑھ میں بیت الصلات کی ان مجالس کا منظر جاگ اٹھا جب نوحہ خواں اے کاش! اے کاش! کی تکرار سے اپنے ناظرین کو عاشور کے ان ایام میں صدیوں پیچھے لے جاتا ہے جہاں وہ اس اندوہناک وقوعہ کو روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔اس کے حصے میں اے کاش کی گردان کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا وہ اسے اپنا فریضۂ منصبی سمجھ کر 'اے کاش!' پر ہی اکتفا کرلیتا ہے۔

اے کاش میں بھی ہوتا میدانِ کربلا میں
اے کاش!
زہرا کے لاڈلے پہ جاں اپنی وار دیتا
حر کی طرح سے میں بھی اعداء سے جنگ کرتا
شہہ کی طرف جو بڑھتا وہ ہاتھ کاٹ دیتا
میدان جنگ سارا لاشوں سے پاٹ دیتا
اے کاش!
مولا بجبرِ قسمت دل میں رہی یہ حسرت
حاصل ہوا نہ مجھ کو سرمایۂ شہادت
اشکِ عزا کی بارش کرتی رہیں گی آنکھیں

سینہ زنی کروں گا اس غم میں تا قیامت

تو کیا اے کاش ہمارے اجتماعی ملّی سفر کی آخری منزل ہے؟ علیجاہ عزت بیگووچ جیسا مفکر اور مجاہد بازی ہار گیا۔ خمینی دنیا سے مایوس و نامراد گئے۔ مجھے ایرانی ٹیلی ویژن کی وہ نشریات بھی یاد آئیں جو خمینی کے فرمودات کو کبھی 'راہ اینجاہ است' کے عنوان سے نشر کیا کرتی تھیں۔ علی کودرا کی گفتگو سن کر مجھے ایسا لگا جیسے 'راہ اینجاہ است' کا سوال اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ پھر سے مرصع ہو گیا ہو۔ تو کیا واقعی آگے راستہ مسدود ہے؟

مجھے خاموش اور متفکر دیکھ کر علی کودرا بولے: خمینی اور دیدو (علیجاہ عزت بیگووِچ) میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے۔ دونوں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب اور امین تھے، دونوں عالم اسلام کی سیاسی اور نظری وحدت اور اس کی ضرورت کا گہرا شعور رکھتے تھے، دونوں ہی پر زبردستی جنگ تھوپ دی گئی اور ان دونوں نے بڑی بے جگری سے صورت حال کا مقابلہ کیا، ہار نہ مانی۔ دونوں ہی کو عالمِ اسلام کے روایتی حلقوں سے گرم جوش تعاون کے بجائے محدود حمایت بلکہ کسی حد تک منافقت کا سامنا کرنا پڑا۔ خمینی اپنے تعمیر کردہ ایران اور حلقۂ شاگرداں سے مایوس گئے اور عزت بیگووچ کو خود سنی دنیا سے وہ توقیر اور اعزاز نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ دیدو اکثر کہا کرتے تھے کہ بوسنیا تو ایک علامت ہے ہمارا مقصد محض ایک چھوٹی سی مسلم ریاست کا حصول نہیں بلکہ اس علامت کے ذریعہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہے، مراقش سے انڈونیشیا تک ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں آج بھی انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ ایسا احترام ہے جو منافقت پر مبنی ہے۔ ہمارے خواب گہنا گئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے علی کودرا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اچانک خاموش ہو گئے۔ دور خلا میں دیکھنے لگے جیسے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ انھوں نے تھرماس کھول کر باقی ماندہ مشروب کو گلاسوں میں انڈیلا اور میری طرف اس انداز سے بڑھایا جیسے غم و اندوہ کے اس بیانیے پر مجھے پرُسا دے رہے ہوں۔

میں نے کہا کودرا! اس میں شبہ نہیں کہ ماضی کے تجربات انتہائی دلگرفتہ ہیں لیکن زندہ قومیں اپنے ناکام تجربوں سے سیکھتی اور مستقبل کے لیے راستہ بناتی ہیں۔ تمہارے مرشد علیجاہ عزت بیگووچ نے اپنی کتاب میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام دراصل ایک منہج ہے، ایک طریقہ ہے، مشکل حالات میں راستے کی دریافت کا طریقہ، مسدود راہوں میں نئے امکانی راستے کی بازیافت کی ایک حتمی ترکیب، یہ بنا بنایا حل پیش نہیں کرتا بلکہ مختلف حالات میں حل ڈھونڈنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ ضرورت ایک فکری

breakthrough کی ہے۔

مگر مسئلہ یہی تو ہے کہ breakthrough ہوتو کیسے؟ صدیوں سے ہم مسموم تاریخ، گمراہ کن سیاسی پروپیگنڈہ، محیرالعقول روایتوں اور شانِ نزول کے متحارب بیانات میں کچھ اس طرح گرفتار ہیں کہ اس شیطانی گردابِ محوری پر اب حقائق اور عقائد کا گمان ہونے لگا ہے۔ تاریخ کے یہ متنازع اور مسموم بیانات عقائد کی کتابوں میں مدون ہوگئے ہیں۔ اب کوئی فرقہ ان تناظرات سے ماوراء وحی ربانی کی تفہیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہر فرقے نے اپنے منحرف گروہی اسلام کے استحکام اور اس کی نشر واشاعت کے لیے باقاعدہ تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں جنھیں وہ اسلام کے قلعوں سے تعبیر کرتا ہے اور ان تمام قلعوں کے ساکنین ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کو مسلسل صیقل کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا: کودرا! مدارس کے بارے میں مقبول عام تصور تو یہی ہے کہ ان کے دم سے آج اسلام کا وجود باقی ہے۔ کہیں آپ اس سلسلے میں شدتِ احساس کا شکار تو نہیں؟

بولے: یہ گروہی اور مسلکی منافرت کی تربیت گاہیں ہیں۔ ان کے دم سے جس اسلام کو دوام و استحکام ہے وہ مسلکی اور گروہی اسلام ہے جو انسانوں کو مختلف خیموں میں بانٹتا ہے۔ یہ اس اسلام کے قلعے نہیں ہیں جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا، بلکہ سچ پوچھئے تو دینی اور فقہی مدارس کا قیام ہی اس وقت عمل میں آیا جب حکمرانوں کو اپنے ڈھب کا اسلام تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قزوین کی پہلی دینی درسگاہ خلافت فاطمی کے داعیوں نے اپنے مبلغین کی تربیت کے لیے قائم کی، پھر جامعہ ازہر کا باضابطہ قیام بھی فاطمی اسلام کی اشاعت کے لیے عمل میں آیا۔ عباسیوں نے اس نظری معرکہ آرائی کے جواب میں نظامیہ بغداد کے مدارس کا جال بچھا دیا۔ اہل تشیع کے ہاں حوضہ علمیہ کی روایت بھی اثنا عشری اسلام کو استناد فراہم کرنے کے لیے قائم ہوئی۔ حال کی تاریخوں میں جب جامعہ ازہر پر جمال عبدالناصر کا قبضہ تھا اور عالم اسلام کی قیادت پر سعودی اور مصری حکمرانوں کے مابین مقابلہ آرائی جاری تھی، سعودی حکومت کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ جامعہ ازہر جیسے کسی ادارے کے بغیر، جس کے علماء اس کے نظری ہراول دستے کے طور پر کام کر سکیں، سعودی حکمرانوں کی ملی سیاست کا منصوبہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا آناً فاناً مدینہ میں ایک متبادل عالمی جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں لے آیا گیا اور ناصر کے مخالفین اخوانی علماء کو اس منصوبہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اب

صورت حال یہ ہے کہ قم اور مدینہ دونوں اپنے ہاں سے مبلغین کی جو کھیپ نکال رہے ہیں وہ روز اول سے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ دونوں بقائے باہم کی راہ پر نہیں چل سکتے کہ ایک کی بقا و نمو دوسرے کے لیے پیام موت ہے۔ یہ کہتے ہوئے کودرا نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ مجھے خاموش اور متفکر دیکھ کر اپنے تھیلے میں کچھ تلاش کرنے لگے پھر بوسنیائی زبان میں للیان نامی ایک رسالہ نکالا جس کے اندر سرائیوو میں واقع مہدی فاؤنڈیشن کا ایک تعارف نامہ رکھا تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر میری طرف اسے بڑھاتے ہوئے بولے: دیکھئے یہ عید غدیر کے موقع پر منعقد ہونے والی ایک مجلس کی رپورٹ ہے جس میں غدیر خم کی اہمیت اور اس واقعہ کی تاریخی اور دینی اہمیت کا تذکرہ ہے۔ لکھا ہے کہ یہ دن مومنین کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ علامتیں خواہ کتنے ہی معتدل لب ولہجہ میں کیوں نہ بیان ہوں ان کی راست زد اہل سنت کے ان عقائد پر پڑتی ہے جن کے مطابق خلافت امرھم شوریٰ بینھم کے اصولوں کے تابع ہے۔ غدیر کے مقام پر علی کی ولایت کے اعلان کو اگر ایک امر واقعہ قرار دیا جائے تو خلفائے ثلاثہ کی خلافتیں معتبر نہیں رہ جاتیں۔ پھر آپ یہ کیسے توقع کرتے ہیں کہ اہل تشیع ان لوگوں کے لیے اپنے دل میں کشادگی محسوس کریں گے جنھوں نے علی کی ولایت کا انکار کیا اور منصوص امامت پر غاصبانہ قبضہ کے مرتکب ہوئے۔ شیعہ حضرت علی کو خلیفۂ بلا فصل مانتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سب کچھ مقدس عقیدہ ہے محض تاریخ نہیں۔ اس کے برعکس سنیوں کا اصرار ہے کہ خلفائے ثلاثہ کو بھی راشدون خلفاء کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

مگر یہ سب تو گزرے واقعات ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حالات میں جب عالم اسلام بیرونی سازش اور عسکری حملوں کی زد میں ہے تاریخ کے ان مسموم بیانات کو فی الحال منجمد کر دیا جائے؟ ہم فی الحال نازک اور حساس مسائل کو چھیڑنے کے بجائے اپنے ملّی بقا و استحکام کی خاطر ایک مشترکہ اسٹریٹیجی تشکیل دیں۔

میرے اس مشورے پر انھیں کچھ غصہ سا آ گیا انھوں نے جھنجھلاہٹ میں پتھر کی میز پر کچھ اس زور سے ہاتھ مارا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں انھوں نے اپنے ہاتھ زخمی نہ کر لیے ہوں اور کہیں پھر سے انھیں ڈپریشن کا دورہ نہ پڑنے لگے۔

'آپ نے بجا فرمایا'، میں نے گفتگو کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ 'صورت حال کو جتنی باریک بینی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے اسی قدر ہمتیں پست ہونے لگتی ہیں، لیکن کوئی راستہ تو بہر حال نکالنا ہوگا۔ ڈوبتی کشتی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے اس کے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ہر بحران اپنے

ساتھ اپنے حل کی کلید لاتا ہے۔ لکل داء دواء کا یہی مطلب ہے اور ہم مسلمانوں کو تو ویسے بھی لا تقنطوا من رحمة اللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ اب دیکھیے گزشتہ برسوں میں شیعہ سنی خلیج کو پاٹنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ بالکل رائیگاں بھی نہیں گئی ہیں۔ شیخ شلتوت کے زمانے میں جامعہ ازہر نے پہلی بار فقہ جعفریہ کو پانچویں فقہی مسلک کے طور پر قبول کیا۔ دوسری طرف اثناعشری شیعوں کے مقبول عام رہنما آیت اللہ خمینی نے اپنے وصیت نامہ میں خلفائے ثلاثہ کے دور پر اپنی تائید کی مہر ثبت کی۔ خمینی نے یہ بات کسی سیاسی ضرورت کے تحت نہیں کہی بلکہ ایک ایسے وثیقے میں اس کا ذکر کیا جو ان کی موت کے بعد پڑھا جانا تھا اور جس سے یقیناً انھیں عوامی حمایت اور مقبولیت مطلوب نہیں تھی۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو تاریخ کی تنقیح و تصحیح اور اس کے محاکمے کا کام کسی قدر آگے بڑھا ہے۔

بولے: یہ محض قضیہ کا ظاہری پہلو ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسی وصیت نامہ میں ایسی باتیں بھی مذکور ہیں جو کسی نئی ابتداء کا راستہ مسدود کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر خمینی نے اس اہم وثیقے میں جوان کے موت کے بعد مسلسل تین گھنٹے تک ایرانی پارلیامنٹ میں پڑھا جاتا رہا طبقہ علماء کو خصوصی عز و شرف کا مستحق ٹھہرایا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ علماء کی قیادت میں تمام مخالفانہ پروپیگنڈے سے بے پرواہ ہو کر مستقبل کا سفر جاری رکھیں۔ ایک طرف تو انھیں اس بات کا شکوہ تھا کہ مسجد و میخانے گرمئ افکار سے خالی ہیں، روایتی علما نئی ابتدا کا حوصلہ نہیں رکھتے، روایت کی کتابیں جن پر مقبول عام شیعہ فکر کا مدار ہے، نقد و اصلاح کی محتاج ہیں اور دوسری طرف ان کے پاس کوئی متبادل ادارہ بھی نہیں جو ان کے انقلابی اور پین اسلامی پروگرام کو آگے بڑھا سکے۔ جس فقہی منہج کے وہ خود پروردہ تھے اور جس سے باہر نکلنے میں ان کے ذاتی علمی استحضار کو بڑا دخل تھا اور جس سے رہائی کے بغیر ایک نئی ابتدا ممکن نہ تھی افسوس کہ اسی فقہی منہج کے حاملین کو انھوں نے انقلاب کی امانت سونپنے میں عافیت جانی۔ اس طرح گھوم پھر کر ہم اسی پرانے فکری چوکھٹے میں واپس آ گئے۔ نئے ایران میں علماء محض حوضہ علمیہ یا مذہبی اداروں کے پاسبان نہ تھے بلکہ رہبر انقلاب کی حیثیت سے معاشرے کی کمان پوری طرح اب ان کے ہاتھوں میں تھی۔ اب جو روایتی فکر کو حکومت کی سرپرستی ملی تو پرانے قضیے نئی آب و تاب کے ساتھ سامنے آئے۔ نوحوں اور ماتم کی مجالس اور مشہد و قم کے زائرین کے لبوں پر مظلومیت اہل بیت کی لے پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی۔ فاطمہ معصومہ کے مزار پر جاتے ہوئے مجھے اکثر جعفر صادق سے منسوب وہ روایتیں یاد آتیں جن میں فاطمہ کو اپنے شیعوں کی شفاعت پر مامور بتایا گیا ہے۔ میں نے جب بھی وہاں زائرین کے لبوں پر یـا

فاطمہ اشفعی لنافی الجنۃ کی مناجات سنی، مجھے وہاں اپنی اجنبیت کا شدت سے احساس ہوا کہ فاطمہ کی شفاعت تو صرف ان کے شیعوں کے لئے مخصوص بتائی گئی ہے۔ شیعہ اور سنی اسلام کی تابانی ایک دوسرے کی مخالفت، مخاصمت بلکہ استرداد کے دم سے قائم ہے۔ یہ ایک ایسی لامتناہی خلیج ہے جسے پاٹا نہیں جاسکتا۔ پل تو وہاں بنتے ہیں جہاں دریائے شور کے دونوں طرف کنارے پائے جاتے ہوں۔ یہاں تو اختلافات کا ایک بحرِ بے کنار ہے۔ سمندروں پہ پل نہیں بنتے مرے بھائی! یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرا شانہ تھپتھپایا، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ایک بوجھل سی انگڑائی لی پھر فرمایا آج کل مغرب کے فکری حلقوں میں تہذیبوں کے مابین تصادم کا چرچا ہے انھیں کیا پتہ کہ ہم مسلمان من حیث الامت ایک داخلی تہذیبی تصادم کے شکار ہیں۔ یہ ایک ناقابل علاج مرض ہے۔ اے کاش! کہ ہمیں اس کی سنگینی کا ادراک ہوتا۔ کتنے معصوم ہیں ہمارے مفکرین جو یہ سمجھتے ہیں کہ عوامی غلغلوں اور احیائی نعروں میں تعصّبات اور نفرتیں بہہ جائیں گی۔ جس دیوار کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہو فلک بوسی اس کا مقدر نہیں ہوتی، یہ کہتے ہوئے علی کودرا نے اپنا بستہ شانے سے لٹکایا، میری طرف یاس وحسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور ناصحانہ لہجہ میں بولے: میرے بھائی! ہم تاریخ کے مہیب اور پراسرار دلدل میں پھنس چکے ہیں۔ اب ہاتھ پیر مارنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے تھرماس اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے بائیں باغ کی جانب چل دیے۔

کودرا! ہولڈ آن اے سکینڈ، ذرا بات تو سنیے، میں نے انھیں روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو ایک عالم غضب میں تھے انھیں اس تاریخ پر غصہ تھا جو مسخ کر دی گئی۔ کودرا تو اپنا تھرماس اور بستہ اٹھا کر چل دیے لیکن اپنے پیچھے قنوطیت کا سارا غبار چھوڑ گئے۔

کیا واقعی تاریخ کے اس دلدل سے نکلنا ممکن نہیں؟ کیا ایک دائمی خانہ جنگی امت مسلمہ کا مقدر بن چکی ہے؟ کوئی ہزار سال پہلے، تیسری چوتھی صدی ہجری میں جب سے ہم نے مسلم حنیف کی نظری شناخت کو خیرآباد کہتے ہوئے شیعہ، سنی، اسماعیلی، اباضی جیسی غیر قرآنی اور غیر اسلامی شناختیں ایجاد کیں، ایک داخلی کشمکش بلکہ خانہ جنگی ہمارا مقدر بن گئی۔ اہل سنت کے متشددین شیعوں کو روافض گردانتے اور انھیں کافر اور واجب القتل قرار دیتے ہیں دوسری طرف شیعوں کا فہم تاریخ حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل اور وصیٔ نبی قرار دیتا ہے۔ پھر یہ دو متحارب نقطہ نظر ایک امت کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں؟ بڑے بڑے عبقری دماغ اور اصلاح احوال کی مخلصانہ کوششیں صدیوں سے تاریخ کے دلدل میں دم توڑتی رہی ہیں۔ عزت بیگووِچ تاریخ کے ایک ایسے لمحہ میں عالم

اسلام کی شیرازہ بندی کے لیے سامنے آئے جب اسلامی بیداری اور نئی ہجری صدی کی نئی صبح کا دنیا بھر میں غلغلہ تھا۔ انھوں نے شیعہ سنی دونوں دنیاؤں کو بوسینا کی علامت کے ذریعہ بیدار کرنے اور اسے ایک جسد واحد میں تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن عالم اسلام بیدار تو کیا ہوتا، شیعہ، وہابی اور صوفی اسلام کی مسابقت نے خود بوسنیا کا خواب دھندلا کر دیا۔ میدان جنگ میں تقریباً جیتی ہوئی جنگ داخلی منافقت اور نظری مسابقت کے سبب ڈائٹن معاہدے کی میز پر کچھ اس طرح ہاری گئی کہ بوسنیا بیک وقت تین صدور کا ملک بن گیا جہاں کروٹ، سرب اور مسلمان صدور کی مشترکہ کونسل میں ہر ایک کے حصے میں باری باری سے آٹھ ماہ کی صدارت آئی۔ بیگووِچ عالم اسلام کو نشاۃ ثانیہ سے دوچار کرنے کے بجائے اپنوں اور غیروں کی منافقت کا کچھ اس طرح شکار ہوئے کہ آزاد بوسنیا کی سرزمین بھی ان کے قدموں سے پھسل گئی۔ خمینی نے تاریخ کی تنقیح و تصحیح کے لیے غیر معمولی انقلابی قدم اٹھایا۔ خلفائے ثلاثہ کے عہد کو اجتماعی تاریخ کا حصہ بتا کر انھوں نے صحیح سمت میں چلنے کی راہ ہموار کر دی لیکن تاریخ کی اس نئی تعبیر کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے، بالفاظ دیگر تاریخ کی دلدل میں پھنسی امت کو نکالنے کے لیے انھیں ژرف بیں اصحاب کی ٹیم نہ مل سکی۔ کتنا بے رحم ہے تاریخ کا یہ دلدل کہ اس سے نکلنے کی ہر کوشش مزید مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ کیا واقعی رہتی دنیا تک یہ ممکن نہیں کہ سنی اپنی سنّیت سے دستبردار ہو جائیں اور شیعہ اپنی شیعت کو خیرآباد کہہ دیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ تیسری صدی سے پہلے والا متفقہ اور مشترکہ اسلام ایک بار پھر ہماری ملی وحدت کا علامیہ بن جائے؟ لیکن یہ سب ہو تو کیسے؟ ہر سوال مزید نئے سوالوں کو جنم دیتا تھا۔ سوالوں کی اس قطار سے میں گھبرا اٹھا۔ کاش کہ میں بھی کوئی عالم دین ہوتا، فقیہ عصر اور مفتی وقت ہوتا اور مجھے سارے سوالوں کے جواب معلوم ہوتے یا پرانی کتابوں کی ورق گردانی سے نئے سوالوں کے جوابات تیار کرنے کے فن سے واقف ہوتا۔ اپنی کم مائیگی پر سخت غصہ آیا۔ پھر یہ سوچ کر کسی قدر تسلی ہوئی کہ جب تک حبل اللہ المتین ہاتھ نہ آئے قیل وقال کے یہ دفاتر ہمیں صدیوں سے آباد اس مہیب نظری دلدل سے نجات نہیں دلا سکتے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

۵

نورانی پیالہ

آج شام بورل میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ مقامی شرکاء وعمائدین کی ایک بڑی تعداد تعارفی کاک ٹیل پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے محوِگفتگو تھی۔ جرمنی سے رزمیہ گو مغنّیوں کا ایک طائفہ اوپیرا (opera) کے لئے آیا تھا۔ خبر گرم تھی کہ آج قلعہ کے پرانے مکیں اپنی تمام اساطیری عظمتوں کے ساتھ جی اٹھیں گے۔ نائٹس ہال کو کچھ اس طرح مزین کیا گیا تھا کہ اس پر عہد وسطیٰ کی کسی عرب مجلس کا گمان ہوتا تھا۔ اب تک کاسل کی دیواروں پر آویزاں مختلف پینٹنگز میں اس قلعہ کے پرانے مکیں گزرے وقتوں کے کردار کی حیثیت سے دیکھنے والوں کو ماضی میں لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اب ماضی اپنی تمام آب وتاب کے ساتھ ازخود متشکل ہونے کو تھا۔ فرشی مجلس کے عین مرکز میں ایک طویل میز کے گرد میں نے اپنی جگہ سنبھالی۔ میز کے دوسری طرف عربی انداز کے جبوں اور منقش خوبصورت عباؤں میں مغنیوں کے طائفے نے جگہ لے رکھی تھی۔ کسی نے اپنے ہاتھ میں نیزہ اور کسی نے طویل عصا اٹھا رکھا تھا۔ ان کے چہروں پر کچھ ایسی بشاشت تھی گویا ابھی ابھی اپنی مہم پر نکلنے والے ہوں، تازہ دم، عزم وحوصلے سے معمور۔ دفعتاً نائٹس ہال کی روشنی گل ہوگئی۔ ہال کے مختلف گوشوں میں دیواروں سے لٹکتی ہوئی شمعدانوں میں ٹمٹماتی شمعوں نے اپنے وجود کا احساس دلایا۔ اور تب ہی کسی نے سرور آمیز موسیقی کی لے کچھ اس طرح بلند کی کہ وہ دوسری لے سے مل کر ایک طرح کی مسحور کن سمفنی میں تبدیل ہوگئی۔ میہا یوجنک کے ہاتھوں میں آج الکٹرونک آلات موسیقی کے بجائے محض ایک بانسری تھی، عہد وسطیٰ کی بانسری۔ اور آج انھوں نے اس بانسری سے وہ سماں باندھا کہ اہل مجلس خود کو فشر کنگ کے عہد میں محسوس کرنے لگے۔ پھر مغنیوں کے طائفے سے ایک شخص اٹھا جس نے دونوں ہاتھوں سے ایک سنہرا پیالہ تھام رکھا تھا۔ اس نے پیالہ کے ساتھ میز کا ایک طواف کیا پھر ایک بڑی دلدوز سی چیخ بلند کی، اور اسی دلدوز لے

میں اہل مجلس سے کچھ اس طرح سوالی ہوا:

Hort ihr den Ruf? Nun danket Gott, dass ihr berufen ihn zu horen!

''لوگو! کیا تم نے وہ ندا سنی؟ اب خدا کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں اس ندا کا مستحق سمجھا''

پھر کسی قدر سرعت کے ساتھ اس نے اس نورانی پیالہ کو طویل میز کے عین مرکز میں رکھ دیا اور عین اس لمحہ نغمہ زنوں نے بربط کی لے پر رزمیہ کے ابتدائی اشعار سے مجلس کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ لیکن ابھی چند ثانیے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک دوسرا مغنی جس نے اپنے جبہ پر ستاروں والی سنہری شال حمائل کر رکھی تھی میز کے عین مرکز میں آیا، پھر بڑے احترام اور احتیاط کے ساتھ نورانی پیالہ کو شانوں تک بلند کرتے ہوئے بولا:

Wacht doch mindest am Morgen!

''جاگ اٹھو کہ صبح ہو چکی ہے''۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ بے کیف برقی روشنیاں جل اٹھیں۔ ہال کے ایک گوشہ سے میہا پو جنک طلوع ہوتے ہوئے دکھائی دیے لیکن اس دفعہ ان کے ہاتھ میں بانسری کے بجائے دستی مائکروفون تھا۔ فرمایا: حاضرین پارسی فال اور فشر کنگ کو گزرے ہوئے کوئی ہزار سال کا عرصہ ہوا لیکن میں جب بھی کاسل بورل آتا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ دنیا کو کنگ آرتھر کے محل کا پتہ ہو یا نہ ہو البتہ ہم اہلِ سلووینیا پارسی فال کے کاسل بورل سے خوب واقف ہیں۔ آج کی یہ شام اور ہماری یہاں حاضری ایک ایسی تاریخ کا تسلسل ہے جہاں تاریخ اور اسطورہ ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پارسی فال کے دو بھائی پہلے ہی جنگ میں مارے جا چکے تھے۔ ماں نے بڑا جتن کیا کہ پارسی فال دنیا کے ہنگاموں اور جنگ و جدال کے میدان سے دور رہے۔ بچپن سے وہ اپنی ماں کی خصوصی نگرانی میں دنیا سے دور جنگل میں پرورش پاتا رہا۔ اسے سوال پوچھنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسا اس لیے کہ ہر سوال دوسرے بہت سے سوالوں کو جنم دیتا تھا اور اندیشہ تھا کہ سوالوں کے تعاقب میں ننھا پارسی فال صحرانوردی اور کوہ پیمائی کی راہ نہ اختیار کر لے۔ لیکن بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن جنگل میں اس کی ملاقات ایک ایسے مجاہد (Knight) سے ہو گئی جو گھوڑے پر سوار اسلحوں سے مرصع کسی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس شہسوارانہ طرز زندگی نے پارسی فال کا دل موہ لیا۔ اسے پہلی بار پتہ چلا کہ زندگی میں کچھ اعلیٰ مقاصد بھی ہوتے ہیں جن کے حصول کے لیے خطرات کو دعوت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شام جب وہ دریا عبور کرنے کو تھا اس کی ملاقات دو مچھیروں سے ہو گئی جنہوں نے اسے ایک رات اپنے ہاں قیام کی دعوت

دی۔ پارسی فال اپنے میز بان کے ساتھ جب کاسل بورل میں داخل ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کا میز بان کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ کاسل کا مالک فشر کنگ ہے۔ شام کی مجلس میں جب کاسل میں دربار سجا تو پارسی فال کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ فشر کنگ کی دونوں جانگھوں میں گہرا زخم ہے جس سے مسلسل خون رستا رہتا ہے اور جس کی تکلیف اسے ہر لحہ بےکل کیے رہتی ہے۔ اسی شب جب وہ عشائیہ سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا اس نے دیکھا کہ قدسی مآب افراد کا ایک جلوس بڑے تزک و احتشام اور شان کے ساتھ دربار میں داخل ہوا۔ آگے آگے ایک شخص ایک نورانی پیالہ ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ ایک نیزہ بردار اس کی حفاظت پر مامور اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ نیزے کی نوک پر خون کے تازہ قطرے موجود تھے۔ شاید نورانی پیالہ میں بھی خون کی تھوڑی مقدار باقی رہ گئی ہو بالکل ایسے ہی جیسے مسیح کے آخری عشائیہ کا بچا ہوا مشروب۔ یہ نورانی پیالہ اہل مجلس کے درمیان دیر تک گردش کرتا رہا۔ پارسی فال کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں اور یہ کیسا پیالہ ہے؟ فشر کنگ کے رستے زخموں اور اس کی بےکلی کا سبب کیا ہے؟ وہ چونکہ سوال پوچھنے کے فن سے ناواقف تھا سو اپنے تمام تجسس اور اندرونی داعیات کے باوجود سوال کرنے سے قاصر رہا۔ رات اسی گومگو میں گزر گئی۔ دوسرے دن جب وہ سو کر اٹھا تو دنیا بدل چکی تھی۔ ویران قلعہ میں نہ آدمی تھا نہ آدم زاد۔ اس نے اپنے مہربان میز بان کو بہت آواز دی۔ کاسل کا کونا کونا چھان مارا۔ اس کی آواز کاسل کی فصیلوں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ ناچار کاسل سے باہر نکلا، جنگل کی راہ لی جہاں اسے ایک بین کرتی ہوئی عورت ملی۔ اس نے پارسی فال سے نورانی پیالہ اور اس جلوس کی بابت پوچھا۔ جب پارسی فال نے اسے کل شب قلعہ کے اندر اس جلوس اور پیالہ کی موجودگی کا ذکر کیا تو وہ بڑی غضبناک اور افسردہ ہوئی۔ بولی اے کاش کہ تم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ نورانی پیالہ کیا تھا۔ دراصل اس میں فشر کنگ کے زخموں کا علاج تھا۔ یہ وہی ہولی گریل ہے جس کی تلاش میں لوگ صدیوں سے سرگرداں ہیں۔ اے کاش کہ تم سوال پوچھنے کا ہنر جانتے۔ تم نے سوال نہ پوچھ کر ایک نادر اور سنہری موقع گنوا دیا۔

میہا پوجنک یہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولے: آج جب اس واقعہ پر ہزار سال گزر چکے ہیں کیا ہم لوگ اپنے اندر بےلاگ سوال کرنے کی جرأت پاتے ہیں؟ وہ سوال جو آپ کے روایتی طرز فکر پر ایک سوالیہ نشان لگا دے۔ سوال کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ وہ جرأت رندانہ ہے جو پوری کائنات کو بیک جنبش تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آتی ہے اور جو بیدار مغز اور زندہ دل انسانوں کو تائید ایزدی پا کر نبوت تک عطا کر دیتی ہے۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد نائٹس ہال کی مجلس برخواست ہوگئی اور حاضرین ایک طرح کا تجسس لیے چائے نوشی کے لیے باہر نکل آئے۔ چائے کے دوران میری نگاہیں علی کودرا کو تلاش رہی تھیں۔ کودرا تو دکھائی نہ دیے البتہ مارلن سے نگاہیں چار ہوئیں، تیز تیز قدموں سے بڑھتی ہوئے میری طرف آئی اور کسی قدر جھکتے ہوئے بولی: ڈاکٹر شاز یہ کیا قصہ ہے؟ یہ کیسی مسٹری(mystry) ہے؟ یہ جو آپ اپنے خطبوں میں سوال کی تراش وخراش پر زور دیتے ہیں اور سوال پوچھنے پر لوگوں کو اکساتے ہیں اس کا پارسی فال کے قصے سے کیا تعلق ہے؟ اب جو میں نے پارسی فال کے پس منظر میں آپ کی باتوں پر غور کیا تو مجھے اس میں ایک حیرت انگیز اور پراسرار تعلق معلوم ہوا۔

میں نے کہا کہ سوال کرنا تو انسان کی سرشت میں ہے تم نے محسوس کیا ہوگا کہ استاد جب اسکول میں بچوں سے پوچھتا ہے کہ کیا کسی کو کوئی بات پوچھنی رہ گئی ہے تو اکثر طلباء محض اس خیال سے اپنے سوالات کو دبائے رہتے ہیں کہ سوال پوچھ کر وہ پوری کلاس کے لیے مرکز توجہ بننا نہیں چاہتے۔ انھیں شاید غیر شعوری طور پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بار اگر سوال اپنی زنبیل سے باہر آ گیا تو پھر اسے لگام دینا آسان نہ ہوگا۔ سو جو بچے خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اُن کے اندر سوالات کا زخم مسلسل رستا رہتا ہے۔ اور ہاں تم نے بائبل میں حضرت مسیح کا وہ قول نہیں پڑھا:

Ask and it will be given to you;
Seek, and you will find;
Knock, and it will be opened to you

'لیکن یہ تو دعا کے سلسلے میں ہے جیسا کہ میں سمجھتی ہوں، دعا کے بغیر ہدایت کے دروازے نہیں کھلتے۔'

جب تک طلب صادق نہ ہو اور فرد کے اندر سوال قائم کرنے اور اسے مزید صیقل کرنے کی جرأت نہ ہو ہمیں اس کے واقعی جواب تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی تمام مذہبی کتابیں اور آسمانی صحیفے بنیادی طور پر انسان کو سوال مرصع کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ ایک بار اگر سوال اپنے جملہ ابعاد کے ساتھ قائم ہو جائے تو پھر یہ ازخود صحیح اور صائب جواب کی طرف لے جاتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ اس عمل میں دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔

ابھی ہماری یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ کاسل کے باہر سے اچانک بگل بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ہر لمحہ بگل کی آواز تیز ہوتی جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے عہد وسطیٰ کی کوئی فوج رات کی تاریکی میں کوچ کرنے والی ہو۔ ہم لوگ کاسل کے باہر ملحقہ مرغزاروں کی طرف چل پڑے۔ درختوں کے درمیان جہاں نسبتاً میدانی علاقہ تھا ایک بڑی اسکرین آویزاں کر دی گئی تھی۔ لیزر کی رنگ برنگی شعاعوں کے ذریعہ کھلے آسمان کے نیچے تاریک رات میں ایک دلفریب اور پر اسرار ماحول کا طلسم قائم تھا۔ نیم تاریک ماحول میں دور درختوں کے بیچ سازندوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں نے جگہ لے رکھی تھی۔ ابتداً کچھ دیر بگل بجتے رہے اور لیزر کی شعاعیں فریب نظر کے کام پر مامور رہیں۔ پھر سیاہ رات کی تاریکی میں ایک کربناک چیخ سنائی دی جیسے کوئی زخموں سے مجروح، زندگی سے مایوس، آخری چیخیں نکال رہا ہو۔ پھر اسکرین پر رات کی تاریکی صبح کے منظر میں تبدیل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ ایک قدیم اساطیری قلعہ کی فصیلوں کے باہر گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز سنائی دی۔ فوجی جنگی ساز و سامان سے مرصع دو شہہ سوار نوعمر پارسی فال سے محو گفتگو دکھائی دیے۔ مناظر بدلتے رہے یہاں تک کہ ایک بزرگ صورت راہب کی نگاہ غلط انداز ایک مصروفِ عبادت دوشیزہ کو آلودہ کر گئی۔ بس پھر کیا تھا ایسا لگا جیسے اس کے باطن میں کوئی کاری زخم لگ گیا ہو۔ کرب کا وہ عالم کہ راہب کی چیخیں تھمتی نہ تھیں۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں تلافی مافات کے شدید داعیہ سے لبریز خدا کے حضور الحاح وزاری کرتا رہا۔ اس کی روح کا زخم مندمل تو کیا ہوتا ہر لمحہ اس کی شدت احساس میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اس کے شاگردوں نے بڑی جدوجہد کی یہاں تک کہ جزیرۃ العرب سے آنے والے مرہم سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک کرب مسلسل ان کی زندگی کا شب و روز بن کر رہ گیا۔

صبح صادق کا منظر لیزر کی شعاعوں کی مدد سے کچھ اس شان سے طلوع ہوتا کہ حاضرین کو گاہے حقیقی صبح کا دھوکہ ہونے لگتا اور کبھی اسکرین کے بیک گراؤنڈ پر زندہ کرداروں کی حرکت ان کے پرسوز مکالمے اور دلدوز چیخیں ہمیں عہد وسطیٰ کے ماحول میں منتقل کر دیتیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ زرق برق عربی لباس میں ایک شخص کچھ اس شان سے سامنے آتا ہے کہ اس کے پیچھے شاگردوں، حواریوں یا درباریوں کی ایک بڑی تعداد اس کے اشارۂ ابرو کی منتظر ہے۔ یہی ہے وہ فشر کنگ جس کے احساس گناہ نے اسے بے کل کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی جانگھیں اس مقدس نیزے سے زخمی ہو گئی ہیں جسے خدا نے اسے اس لیے عطا کیا تھا کہ وہ ہولی گریل کی حفاظت پر مامور رہے۔ کوئی تین گھنٹہ تک پارسی فال کا یہ رزمیہ جنگل کے پر اسرار ماحول میں اعلیٰ فنکاری کے ساتھ کچھ اس طرح جاری رہا کہ حاضرین نے گاہے اپنے آپ کو عہد وسطی کے ماحول میں پایا۔ سنیما کی جدید ٹکنالوجی اور جنگل کی حقیقی رات نے مل کر کچھ ایسا ماحول تشکیل دیا تھا کہ گاہے پارسی فال کے رزمیہ پر حقیقت کا

گمان ہوتا تھا۔کبھی فنا کے نغمے گائے جاتے اور کبھی 'نغمہ زائرین' حاضرین کو یہ تسلی دلاتا کہ جب تک توبہ کرنے والوں سے خدا کی رحمت کا وعدہ باقی ہے جہنم یا موت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

Of hell and death, I have no fear
For thou my Lord are ever near
Alleluia!
Alleluia!

آخری منظر دلدوز بھی تھا اور سبق آموز بھی جو اپنے اختتام پر بہت سے حل طلب سوالات چھوڑ گیا۔ فشر کنگ اپنے مصاحبین کے جلو میں ایک نیم تاریک پر اسرار خانقاہ میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ نورانی پیالہ (ہولی گریل) ایک قیمتی اور منقش غلاف سے ڈھکا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ پارسی فال نے اپنے ہاتھ میں مقدس نیزہ تھام رکھا ہے اور یہ اسالیب مختلف حاضرین کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ فشر کنگ کے رِستے زخموں کا علاج اسی مقدس نیزے سے ہوسکتا ہے جس نے اسے زخمی کیا ہے کہ گناہ کے دھبے عفو و درگزر سے دھل جاتے ہیں:

Nur eine Waffe taugt: die Wunde schliesst der
Spear nur, der sie schlug

لیکن فشر کنگ شدت احساس میں مبتلا، زندگی سے مایوس، موت کا طالب ہے۔ اسے نہ تو نورانی پیالہ کی موجودگی کا کچھ اندازہ ہے اور نہ ہی اسے اس بات کا احساس کہ وہ کوئی اور نہیں مقدس نیزے کا حامل اس نورانی پیالہ کا محافظ ہے۔ وہی پیالہ جس کی آرزو میں لوگ کوہ و بیابان کے چکر لگاتے ہیں اور جس میں مقدس خون کے چند قطرے ازلی ناسور کو بھی چشم زدن میں مندمل کر سکتے ہیں۔ اہل مجلس حیران ہیں کہ فشر کنگ کو آخر ہوا کیا ہے۔ وہ مختلف دواؤں کی تلاش اور مرہموں کے حصول کے لیے مختلف سمتوں میں اپنے ہرکاروں کو تو بھیجتا ہے لیکن اسے یہ توفیق کیوں نہیں ہوتی کہ وہ نورانی پیالہ پر پڑے منقش غلاف کو الٹ سکے۔

اسی پس منظر میں ایک شخص آہ و بُکا کرتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ کہتا ہے: لوگو! تم اس نورانی پیالہ کا غلاف کیوں نہیں الٹتے؟ آخر کس چیز نے تمہیں اس عمل سے روکے رکھا ہے؟ اس سوال کے جواب میں چند ثانیے خاموشی رہتی ہے پھر اہل مجلس پر تاریکی سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے خانقاہ کی جلتی شمع کو بجھا دیا ہو۔ اور تبھی تاریکی میں ایک سایہ ندائے غیبی کی لے میں اہل مجلس کو باخبر کرتا ہے کہ اس پیالہ کے گرد دراصل ان محافظوں کا پہرہ ہے جن کے دامن گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جو مقدس آثار کے محافظ تھے وہی بے توفیق ہو گئے۔ ان کی روح زخمی ہے، وہ ایک تعذیب مسلسل سے دوچار ہیں۔ وہ چاہتے تو ہیں کہ مقدس خون

کے چند قطرے ان کے زخموں کا مداوا کر سکیں لیکن ایک ابدی بے توفیقی ان کا مقدر بن گئی ہے۔

چند ثانیے بعد اسکرین پر دوبارہ جھٹپٹے کا منظر طاری ہوا، پارسی فال ہاتھوں میں مقدس نیزہ لیے سامنے آیا، اس کی چشمِ حیرت نے حاضرین پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر ماحول تاریکی میں ڈوب گیا۔ ایک دلگرفتہ چیخ کے ساتھ لیزر شعاعیں دفعتاً خاموش ہوگئیں اور ایسا لگا جیسے ہم پھر سے عہد وسطیٰ کے ماحول سے کاسل بورل کی حقیقی سرزمین پر واپس آ گئے ہوں۔

تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ میں رزمیہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ حاضرین پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ صدیوں کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرنا اور پھر اصل ماحول میں واپس آ جانا ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ تمثیل پر حقیقی کرداروں کا گمان اور مصنوعی طلسماتی ماحول کے حقیقی ہونے کا ایسا تجربہ مجھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ شاید یہ بورل کے درودیوار اور اس سے ملحقہ جنگل کے سبب تھا جہاں رات کی تاریکی میں حجر وشجر ان کرداروں کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہوگئے تھے اور اس پر مستزاد کرداروں کی مشرق لباسی، قدیم رزمیائی لب ولہجہ میں مکالمہ کی ادائیگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کاسل بورل کی تین چار دنوں کی سکونت، ان سب چیزوں نے مل کر تمثیل کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔

لوگ اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے تھے، کچھ ابھی تک محو حیرت تھے، قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے غالباً میری مشرقی شکل وصورت دیکھ کر پوچھا: کہیے کیسا لگا؟ کیا تاثر ہے آپ کا؟

''ایک طلسم تھا جو رخصت ہوا۔ بڑا ہی اثر انگیز تھا یہ سب کچھ، بیان سے باہر، گو کہ زبان کا حجاب حائل تھا''، میں نے کہا۔

بولے جی ہاں قدیم جرمن کا حظ اٹھانے والے اب خال خال ہی پائے جاتے ہیں اور مائکروفونی ترجمے سے انبساط میں خلل واقع ہوتا ہے۔

کیا اس سے پہلے بھی آپ نے اس اوپیرا کو کبھی سنا ہے؟ میں نے ان کی گہری دلچسپی کا سبب جاننا چاہا۔

بولے: ہمارے لیے پارسی فال کا رزمیہ قومی افتخار کا معاملہ ہے۔ جس طرح شیکسپیئر انگریزوں کے لئے اور دانتے اطالویوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اسی طرح پارسی فال ہمارے لیے جستجو کی علامت ہے۔

تو کیا آپ یہیں پتوئی میں رہتے ہیں؟

نہیں! رہتا تو لبلیانہ میں ہوں، وہاں یونیورسٹی میں تقابل ادیان پڑھاتا ہوں۔ ہم لوگ خاص طور پر اس اوپیرا کے لیے لبلیانہ سے آئے ہیں۔

میں نے سوچا کہ مذہبیات کے طالب علم کی حیثیت سے کیوں نہ ان سے اس نورانی پیالہ کی بابت معلوم کیا جائے جس کی تلاش ایک مدت سے عیسائی دنیا میں ہوتی رہی ہے اور جو مختلف اعلیٰ فن پاروں کا موضوع رہا ہے۔

کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں، آخر کس چیز نے فشر کنگ کو نورانی پیالہ کا غلاف اٹھانے سے روک رکھا ہے؟ یہ کیسا ڈائلما ہے کہ جس چیز کی تلاش میں عالم عیسائیت صدیوں سے سرگرم ہے وہ قریب آکر بھی اس سے دور رہ جاتی ہے؟

بولے: آج کے اوپیرا میں آخری سین اصل کہانی سے مختلف تھا۔ دراصل رزمیہ کا یہ حصہ مختلف لوگوں نے اپنی صوابدید کے مطابق مختلف انداز سے ترتیب دیا ہے۔ اصل رزمیہ جو بارہویں صدی کے فنکار وولفرم ون ایشن باخ نے لکھا ہے اس میں پارسی فال کو ہولی گریل کی تلاش میں سرگرداں دکھایا گیا ہے۔ انیسویں صدی میں رچرڈ ویگنر نے اسے اپنے انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کی۔ بعض مصنفین نے اس رزمیہ کو ایک خوشگوار منطقی انجام تک پہنچایا ہے جس میں ہولی گریل کی بازیافت اور فشر کنگ کے رستے زخموں کے مداوے کی بات کہی گئی ہے۔ البتہ آج کا اختتام شاید ہماری صورت حال سے کہیں زیادہ قریب ہے کہ ہم مصائب وآلام کے باوجود نورانی پیالے سے رجوع کی توفیق نہیں پاتے۔

رات کے دو بج چکے تھے میں نے پروفیسر لینارٹ پریوک سے رخصت لی۔ بار بار میری نگاہوں میں نورانی پیالہ کا وہ منظر گھوم جاتا۔ بصیرت جب سلب ہو جائے تو بصارت کفایت نہیں کرتی۔ شاید آیت قرآنی افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ عالم عیسائیت میں نورانی پیالہ کی گمشدگی کا ماتم ہے سو اگر ان کے اہل بصیرت منقش غلاف کو الٹ بھی دیں تو ان کے ہاتھ مزید محرومی اور مایوسی کے علاوہ اور کیا آئے گا۔ لیکن اس کے برعکس ہمارا ہولی گریل (وحیِ ربانی) تو آج بھی زیرِ غلاف اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ پھر ہم کیوں اپنے اندر منقش غلاف کو الٹنے کی جرأت نہیں پاتے؟

کتنی مماثلت ہے فشر کنگ کے رِستے زخم، اس کی بے کلی اور ہمارے فکری اور نظری تشتت میں۔

ہمارے اہل علم جو کبھی اس نورانی پیالہ (وحی ربانی) کے امین ومحافظ ہوا کرتے تھے انھوں نے اس کے گرد آثار و روایات اور فقہ وتاویلات کی نا قابل عبور فصیل چن دی ہے۔ ہمارا ملی وجود تفرقہ کے داخلی زخم کے سبب صدیوں سے مسلسل رس رہا ہے۔ ہم وحدت امت کی مصنوعی کوششوں میں مختلف مرہموں کو آزماتے ہیں لیکن ہمیں نورانی پیالہ پر پڑے منقش غلاف کو الٹنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وحی کی تجلی سے محرومی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس صورت حال پر بے چین اور مضطرب ہے لیکن ہم پارسی فال کی طرح سوال کرنے سے ڈرتے ہیں، مبادا سوالات اگر ایک بار مروجہ فکری چوکھٹوں سے باہر نکل گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک نئی جستجو ہمارے باطن کو بدل کر رکھ دے۔

٦

تاریخ کے قیدی

رات بھران ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔نورانی پیالہ کا منظر نگاہوں سے جاتا نہ تھا۔ بورل کے درو دیوار، ایسا لگتا تھا، جیسے مجھے بار بار منقش غلاف کو اُلٹنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں وقت کا پارسی فال نہیں، بھلا میرا اس رزمیہ سے کیا تعلق؟

ابھی آنکھ پوری طرح لگتی بھی نہ تھی کہ نورانی پیالہ کے گرد جبّہ و دستار میں ملبوس قدسی مآب محافظوں کا وہ منظر کچھ اس شدت کے ساتھ نگاہوں میں تازہ ہوجاتا گویا جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ مختلف مناظر نگاہوں میں کچھ اس طرح جھلملاتے جیسے منتشر خواب میں اشیاء اپنی ماہیت بدل دیتی ہیں۔ بارالہٰا یہ کیا قصہ ہے؟ پتھر کے بلند چبوترے پر منقش غلاف کے اندر پیالہ کی شکل ایک ایسی کتاب کی صورت کیسے اختیار کرلیتی ہے گویا ایک بلند و بالا محراب میں ریشمی جزدان میں کوئی کتاب مقدس رکھی ہو۔ یہ کون لوگ ہیں جو اس کی حفاظت پر کچھ اس طرح مامور ہیں کہ بلند محراب کے گرد آثار وروایات اور فقہ و تاویلات کی فصیلیں مسلسل اونچی ہوتی جاتی ہیں۔ تاریخ اور روایت، اسلامی علامتیں اور عیسائی یوروپ کے اسطورے کچھ اس طرح گڈ مڈ ہوتے رہے کہ میرے لئے ان سے پیچھا چھڑانا ممکن نہ رہا۔

آج کی رات نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے قلعہ کے درو دیوار بولتے ہوں، جیسے ایک ہزار سالہ پرانی تاریخ اپنے جملہ ابعاد کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوگئی ہو۔ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے، اندیشوں اور وسوسوں کا شکار، نہ جانے کب نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی پرانا بورل نگاہوں کے سامنے ہے۔ نئے سورج نے بورل کے شبینہ اساطیری ماحول سے سریت کی قبا اتار پھینکی تھی۔ یہاں اب نہ کوئی پارسی فال تھا اور نہ کوئی فشر کنگ۔

لوگ کانفرنس کے اگلے پروگرام کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔ ابھی میں کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک صاحب نے یہ خبر دی کہ علی کودرا سخت بیمار ہیں، ان پر تشنج کا دورہ پڑ رہا ہے، ڈاکٹر پیا ناشتے کے دوران تمہیں تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھیں۔ یہ سُن کر مجھے سخت تشویش ہوئی۔ اپنی بے خوابی اور جاگتی آنکھوں کی بے بسی کے وہ مناظر بھی یاد آئے جب میں اپنی تمام تر کوشش کے باوجود منقش غلاف کو الٹنے کی جرأت نہ کر سکا۔ پھر خیال آیا کہ علی کودرارات کے پروگرام سے لوٹتے ہوئے دکھائی نہ دیے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوں۔ یہ سوچ کر میں تیز تیز قدموں سے علی کودرا کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ زیریں منزل پر ان کے کمرے کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو تین لوگوں نے انہیں بازو سے پکڑ رکھا ہے۔ ان کا پیر بستر سے بندھا ہے۔ وہ بار بار پوری قوت سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے تشدّد پر آمادہ ہوں:

'چھوڑو مجھے ابھی نہروان اور صفین کی جنگ ختم نہیں ہوئی ہے۔ ہماری صفوں میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ اللهم عجل لولیك الفرج '۔

سامنے ایک کرسی پر ڈاکٹر پیا بیٹھی ہیں جو انھیں بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ شیاطین اب بورل سے رخصت ہو چکے ہیں۔ بوسنیا میں جنگ بند ہو چکی ہے۔ ہر طرف امن وامان ہے۔

مجھے دیکھ کر ڈاکٹر پیا نے راحت کی سانس لی۔ نہروان اور صفّین بھلا ان کی سمجھ میں کیا آتا۔ وہ دراصل بوسنیائی جنگ کے نفسیاتی زخم سمجھ کر اسے مندمل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ادھر علی کودرا بھی مجھے دیکھ کر کچھ ڈھیلے پڑتے دکھائی دیے۔

کودرا چاہے آج ہر طرف معرکۂ نہروان اور صفین بپا ہوا اور اہل نظر کو کل یوم عاشورہ کل ارض کربلا کا منظر کیوں نہ دکھائی دیتا ہو، تم اس نکتہ کو کیوں بھولے جاتے ہو کہ

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہ سن کر علی کودرا نے میری طرف گھور کر دیکھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر کسی قدر تیز لہجے میں بولے: جب تک عمر والے اس دنیا میں باقی ہیں فاطمہ کا گھرانہ محفوظ نہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ علی والے سکون کی سانس لیں۔

کودرا علی کی تفصیل تو صدیاں گزریں اہل اسلام کے دل و دماغ پر قائم ہو چکی ہے۔ کیا شیعہ اور کیا سُنّی اپنے اپنے انداز سے سبھی لوگ دمادم مست قلندر، علی کا پہلا لمبر کے نعرے لگا رہے ہیں۔

بولے: میں نہیں مانتا، یہ سب بہلاوے کی باتیں ہیں۔ علی اور عمر دو ایسی تلواریں ہیں جو ایک نیام میں نہیں رکھی جاسکتیں۔

کودرا! جس طرح علی کے بغیر اسلام کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی اسی طرح عمر کے بغیر بھی بات ادھوری رہ جائے گی۔ تم ہی سوچو جس کے پاس عمر نہ ہو اس کے پاس آخر بچا کیا۔ بس جانو زندگی کی کہانی ختم۔

اس لطیفہ کو سن کر علی کودرا کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ ان کی لبوں پر آئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر دیوار پر لگی بے سوار گھوڑے کی پینٹنگ کو خاموشی سے تاکتے رہے۔ پھر شاید انھیں پارسی فال کے اس گھوڑے پر ذوالجناح کا گمان ہوا ان کے جذبات میں اچانک ہلچل سی پیدا ہوئی، انھوں نے پوری قوّت سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے پھر انھیں سنبھالا۔ انھوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو بستر میں گرا دیا۔ اور ایک سرور آمیز روحانی لَے میں دعائے فرج پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بند آنکھوں سے آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے رہے پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے فرمایا: پتا ہے وہ عنقریب آنے والے ہیں۔ شاید اگلی منگل کی شام کو جمکران کی مسجد میں ان کا ظہور ہو جائے۔ اہل بیت کے دشمنوں کی اب خیر نہیں۔

کودرا یہ بڑی اچھی خبر ہے۔ ویسے دشمنان اہلِ بیت اب رہے کہاں؟ اموی اور عباسی خلافتوں کی بساط لپیٹی جا چکی۔ اب تو عالم اسلام میں جتنی بھی حکومتیں قائم ہیں خواہ وہ سنّی ہوں یا شیعہ، سلفی ہوں یا بریلوی یہ سب لوگ صبح و شام تسبیحِ فاطمہ کا ورد کرتے ہیں۔ ان کی مسجدیں پنجتن پاک کی فضیلت سے گونجتی ہیں، ان کے خطبے 'فاطمة سيدة نساء اهل الجنة' اور 'الحسن و الحسين سيدا شباب اهل الجنة' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ و سلام کے بغیر ان کی نمازیں مکمل نہیں ہوتیں۔ پھر اہل بیت کا دشمن اب رہا کون؟

میری یہ باتیں علی کودرا کے لیے بڑی تشفی بخش ثابت ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ان کے لہجے کی جھنجھلاہٹ اور شدّت جاتی رہی۔ ادھر شاید مُسکّن دواؤں نے بھی اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر نیم بند آنکھوں سے میری گفتگو سنتے رہے اور پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ ڈاکٹر پیا کی ہدایت تھی کہ دو ایک لوگ ان کی

نگرانی پر مامور رہیں۔ ان کے بندھے پیر کھول دیے جائیں تا کہ وہ جب دوبارہ بیدار ہوں تو اپنے آپ کو ایک نئی صورت حال میں پائیں۔

'یہ نہروان اور صفین کا کیا قصہ ہے جس نے علی کودرا کے جذبات کو اس قدر مشتعل کر رکھا ہے؟'

ڈاکٹر پیا نے حالات کو قابو میں آتا دیکھ کر اب اس قضیۂ نامرضیہ کا ذکر چھیڑا۔

یہ وہ تاریخی مقامات ہیں جہاں کبھی اپنے باہمی اختلاف کے سبب اہل ایمان کی تلواریں آپس میں الجھ گئی تھیں۔

یہ کب کی بات ہے؟

اس واقعہ کو کوئی چودہ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔

اتنی پرانی بات؟ پھر ان باتوں نے علی کودرا کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟

'ہر فرقہ ان تاریخی واقعات کی اپنے طور پر توجیہ و تعبیر کرتا ہے'، میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

مائی گڈنس! (my goodness) تو گویا تم لوگ تاریخ کے اسیر ہو۔ تاریخ میں پیش آنے والے واقعات وحوادث سے اب تک اپنا پیچھا نہیں چھڑا پائے۔ ڈاکٹر پیا نے اعتراض وارد کیا۔

مگر یہ بات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کے ماننے والے کسی نہ کسی اعتبار سے تاریخی حوادث اور اس کی من پسند تعبیرات کے اسیر ہیں۔ مثال کے طور پر عیسائیت کو لیجئے جو اہل علم کی زبان میں پولائن کرسچینیٹی (Pauline Chritianity) کہلاتی ہے، یعنی پال کی تعمیر کردہ عیسائیت۔ وہی پال جو کبھی حضرت مسیحؑ کے شدید مخالفین میں تھا۔ اسے دمشق کے سفر میں مسیحؑ سے ہم کلامی کا شرف ہوا۔ اس واقعہ نے پال کو مسیحؑ کے مخالف کے بجائے ان کے زبردست مؤید اور مبلغ میں تبدیل کر دیا۔ بلکہ یہ کہئے کہ وہ عیسائیت کے معمارِ اعظم بن گئے۔ ان کے فرمودات اور ان کے مکاتیب آج بائبل کا حصہ ہیں۔ پال جو عیسائیت کی تاریخ کا ایک پڑاؤ ہے فی نفسہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ آج اگر پال کو عیسائیت سے خارج کر دیا جائے تو مروجہ عیسائیت کی عمارت زمیں بوس ہو جائے۔ کچھ یہی حال ربائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کا بھی ہے جس کی بنیاد تو راۃ کے بجائے تلمودی شارحین کے قیل وقال پر رکھی گئی ہے۔

'مگر ہم تو اسے تاریخ سمجھتے ہیں اور اسے تاریخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور شاید اسی لیے عیسائی معاشرے کو مذہبی علامتیں اس طرح شدت کے ساتھ متحرک نہیں کرتیں۔ پھر ہمارے ہاں تاریخی تناظرات

مسلسل تنقید و تفتیش کی زد میں رہتے ہیں ۔۱۹۴۸ء میں بحرِ مردار کے پہاڑی غاروں سے جو اسکرول دریافت ہوئے تھے انھوں نے بائبل کے روایتی فہم پر بڑے اثرات مرتب کیے اور یہ جو کبھی آپ سنتے ہیں کہ بعض عیسائی محققین کے مطابق حضرت مسیحؑ شادی شدہ تھے، میری میگڈالین ان کی منکوحہ تھیں، ان کی موت صلیب پر پیش نہیں آئی بلکہ وہ سبت کے احترام کے سبب موت سے پہلے ہی صلیب سے اُتار لیے گئے اور پھر اپنے مؤیدین کے ساتھ دنیا کے مختلف حصّوں میں اپنے مشن کی اشاعت میں سرگرم رہے یہاں تک کہ بعض محققین نے کشمیر میں قبرِ مسیحؑ کی موجودگی کا پتہ بھی لگایا ہے، تو یہ سب باتیں تاریخ کے سراب سے نکلنے کی ہی تو کوششیں ہیں‘۔ ڈاکٹر پیا نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کی کوشش کی۔

’جی ہاں آپ کی بات ایک حد تک صحیح ہے۔ البتہ یہ نہ بھولیے کہ تاریخ کو ایک متقابل تاریخ کے ذریعہ شکست نہیں دی جاسکتی۔ اس طرح ایک تاریخ کے سحر سے نکل کر ہم دوسری تراشیدہ تاریخ کے اسیر بن جاتے ہیں‘۔

’پھر آپ کے نزدیک اس کا علاج کیا ہے؟ تاریخ کے سراب سے نکلنے کی کیا سبیل ہوسکتی ہے؟‘ ڈاکٹر پیا نے جرح کی۔

’اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تاریخ سے کہیں مستند اور معتبر ماخذ کو اس کام پر لگایا جائے؛ وہ ماخذ جہاں متحارب بیانات نہ پائے جاتے ہوں اور جس کی صداقت پر تمام فرقوں کا اتفاق ہو۔ عیسائیت کی بابت تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں بائیبل کے چار مروجہ نسخوں میں مرقس، متیٰ اور لوقا اگر ایک رُخ اختیار کرتے ہیں تو یوحنّا کی بائیبل ایک الگ نقطۂ نظر کا پتا دیتی ہے۔ البتہ ہم مسلمانوں کے ہاں وحی ربّانی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں مسلمانوں کے تمام ہی فرقے قرآن مجید کی لاریبیت اور اس کی عصمت کے قائل ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھنے اور اس کے اسیر ہوجانے کے بجائے پوری جرأت کے ساتھ اس کی تنقید و تنقیح کا کام انجام دے سکیں اور اس عمل میں ہمیں وحی ربّانی کی مشایعت معیارِ حق کے طور پر حاصل رہے۔

’لیکن آپ کے ہاں بھی تو ربائی یہودیت اور پولائن عیسائیت کی طرح مولویانہ یا فقہی اسلام کا ایک پورا مفصل نظام موجود ہے۔‘

’جی ہاں افسوس تو اسی بات کا ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اسلام ربائیانہ تعبیرات کو

اصر واغلال کا طوقِ غلامی قرار دیتا ہے اور محمد رسول اللہ کو اس کام پر مامور بتاتا ہے کہ وہ لوگوں کی گردنوں کو مذہبی پیشوائیت کی غلامی سے نجات دلاتے ہیں؛ قرآن کے الفاظ میں: ویضع عنهم اصرهم و الاغلال التی کانت علیهم۔ آپ کو شاید یہ بات بھی معلوم ہو کہ اسلام میں کسی چرچ یا پوپ کا کوئی وجود نہیں۔ بندہ بغیر کسی توسط کے براہ راست خدا سے اپنا تعلق استوار رکھتا ہے۔ حریت فکر ونظر کی یہی وہ آزادی ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں کو عطا کرتا ہے۔

'واقعی؟ پھر تو بڑی کھلی فضا ہونی چاہئے تھی آپ کے ہاں۔ پھر یہ کیا قصہ ہے کہ صفین اور نہروان کے واقعات نے آپ کی اجتماعی زندگی پر اب بھی پہرہ بٹھا رکھا ہے؟' ڈاکٹر پیا کا سوال اتنا تیکھا اور برجستہ تھا گویا وہ مجھے زچ کر رہی ہوں۔

کیا بتاؤں اس سوال کا جواب بہت آسان ہے، تکلیف دہ حد تک آسان۔ بلکہ اتنا ہی مشکل بھی۔

کیا مطلب؟ انھوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

جی ہاں! سامنے پڑی ہوئی چیز جو ہمارے عمومی مشاہدے کا حصّہ ہوتی ہے اس کی صداقت سے انکار اگر مقبول عام رویہ بن جائے تو یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اتنی سیدھی سی بات اس قدر سچی ہو سکتی ہے، دانشورانہ ایچ پیچ سے خالی، دو اور دو چار کی طرح واضح۔

میں کچھ سمجھی نہیں۔

بات یہ ہے کہ صفین اور نہروان یا صحابہ کے باہمی اختلافات کی جو تصویر مسموم تاریخ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے اسے ہم وحی کی روشنی میں پرکھنے سے مسلسل احتراز کرتے رہے ہیں۔ بلکہ سیدھی سی بات یہ سمجھو کہ ہم نے تاریخ کو وحی پر قاضی بنا رکھا ہے۔ مفسرین کی اصطلاح میں اس طریقۂ تاویل کو تفسیر بالماثور کہتے ہیں۔

'یہ تو کچھ وہی صورتِ حال ہے جس سے اہلِ یہود کی مذہبی فکر عبارت ہے۔ ان کے ہاں بھی فہم وحی کی کلید تلمودی شارحین کے ہاتھوں میں ہے،' پیا نے ہم مسلمانوں کو اہل یہود کی سطح پر کھینچ لانے کی کوشش کی۔

'جی ہاں کچھ ایسا ہی سمجھئے،' میں نے کہا۔ 'البتہ ہم میں اور اہل یہود میں ایک فرق ہے اور وہ فی نفسہ بہت بڑا فرق ہے۔ اصولی طور پر ہم قرآن مجید کو حکم تسلیم کرتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے اندر قرآن کی روشنی میں دینی ادب کا محاکمہ کرنے کی جرأت نہیں پاتے؛ مبادا متوارث اسلام کی عمارت اور مختلف فرقوں کے خود ساختہ محل زمیں بوس ہو جائیں'۔

بولی: اگر قرآن مجید کو تاریخ پر محاکمہ کا اختیار سونپ دیا گیا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صورتِ حال یکسر بدل جائے گی؟ مسلمان اپنی تراشیدہ تاریخ کے حصار سے باہر آ جائیں گے؟

جی ہاں! کیوں نہیں۔ اب صدرِ اول میں مسئلہ خلافت پر پیدا ہونے والے اختلافی بیانات پر ایک نگاہ ڈالیے جو فرقہ وارانہ رنگ آمیزی کے ساتھ مدون تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔ قرآنی دائرۂ فکر میں ان کی صداقت مشتبہ ہے۔ ابوبکر کی تنصیبِ خلافت کے مسئلہ پر علی کے دل میں تنگی کا پیدا ہونا یا فاطمہ کا فدک کے مسئلہ پر ابوبکر سے تاحیات بول چال بند کر دینا یا عمر کا فاطمہ کا گھر جلانے کے لئے آنا اور کبارِ صحابہ کے مابین اس قسم کے دسیوں تراشیدہ افسانے ہرگز لائقِ اعتبار نہیں کہ بقول قرآن: محمد رسول الله واللذین معه اشداء علی الکفار و رحماء بینهم۔

'ہاں آپ نے بالکل صحیح فرمایا، بات تو دل کو لگتی ہوئی ہے، پتہ نہیں میرا دھیان اب تک ادھر کیوں نہیں گیا' علی کودرا، جواب تک نیم خوابیدہ بستر پر دراز تھے، انھوں نے بروقت مداخلت کی۔

'کودرا آپ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟' انھیں معمول پر لوٹتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر پیا نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

بالکل درست! البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آپ حضرات یہاں کب آئے اور یہ قصہ یہاں کیوں چھڑا ہے؟

'آپ پر تشنج کا دورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں آج آپ اہل بیت کی حمایت میں تلوار بکف تھے'، میں نے وضاحت کی۔

اچھا! واقعی؟ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔ ہاں وہ نورانی پیالہ اب بھی میری نگاہوں میں پھرتا ہے اور میں اپنے اندر بڑی بے بسی سی محسوس کرتا ہوں کہ اپنے تمام اندرونی داعیات کے باوجود اس منقش غلاف کو اُلٹ نہیں پاتا۔

'میں نہ کہہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کل کے اوپیرا کا اثر ہے۔' پیا نے اپنی ماہرانہ تشخیص کا اعادہ کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران کھانے کے وقفہ کا اعلان ہو گیا۔ علی کودرا کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے لیکن ہم لوگوں کے اصرار پر پائیں باغ میں اجتماعی کھانے میں شرکت کے لیے چل پڑے۔ لوگ انھیں صحت مند اور نارمل دیکھ

کر بہت خوش ہوئے، کچھ حیرت زدہ بھی تھے کہ یہ سب کچھ اتنا جلدی کیسے ٹھیک ہو گیا۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ انھیں ہوا کیا تھا اور اب وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ نیک خواہشات اور صحت یابی کی دعاؤں کا سلسلہ جب ذرا تھما تو ہم لوگوں نے ایک گوشہ میں پڑی بنچ پر اپنا قبضہ جمایا۔ علی کو دراا پنے تئیں لوگوں کی فکرمندی دیکھ کر کچھ حیران سے تھے۔ انھیں اب کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کسی جانکسل مرحلہ سے گزرے ہیں۔ تشنج کے اس دورے میں ان پر کیا گزری، انھیں کچھ یاد نہ تھا۔ بولے: پتا نہیں میرے ساتھ یہ کیا ہوتا ہے کہ میں اچانک اپنے اندر سے غائب ہو جاتا ہوں۔ کوئی اور شخص میری جگہ سنبھال لیتا ہے۔ پھر اس کے مکالمے میرے مکالمے نہیں رہتے۔ کبھی کبھی اس کیفیت کا ہلکا سا نقش ذہن پر باقی رہ جاتا ہے اور کبھی کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

آپ کے ساتھ یہ سب کچھ کب سے ہے؟ ڈاکٹر پیا نے مرض کی مزید تشخیص کے خیال سے پوچھا۔

تخصیص کے ساتھ تو یہ کہنا مشکل ہے۔ ہاں بوسنیائی جنگ کے دوران میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے بعض قریبی رشتہ دار جو سربوں کی بربریت کا نشانہ بنے تھے، انھیں میں گوشت پوست کے زندہ انسانوں کی طرح اپنے اردگرد موجود پاتا۔ یہ مناظر اتنے واضح ہوتے کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا۔ لیکن پھر اچانک سب یہ کچھ غائب ہو جاتا۔ ان دنوں میں ذہنی طور پر اس پوزیشن میں تھا کہ ہلو سے اور حقیقت میں فرق کرسکوں۔ البتہ قم میں اپنی طالب علمی کے دوران جب میں نے اپنے آپ کو بیک وقت سنّی اور شیعہ شناخت میں الجھا پایا اور بسا اوقات میرے لیے ان دوشناختوں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا مشکل ہو گیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر ہر لحہ ایک مکالمہ جاری ہوا اور وہیں شاید مجھے پہلی بار تشنج کا دورہ بھی پڑا۔

آخر اس کا سبب کیا تھا، آپ نے کبھی اس صورتِ حال کے تحلیل و تجزیہ کی کوشش کی؟ میں نے ان کے ذہن کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے: ابتداء میں تو میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔ ایک بار کسی منگل کی شام کا واقعہ ہے اپنے بعض احباب کے ساتھ جمکران کی مسجد کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ وہاں مسجد کے عقب میں ایک کنواں ہے جس میں مومنین اپنے عریضے امام زماں تک پہنچانے کے لیے ڈالتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ یہ عریضے ہر منگل کی شام امام زماں کو پیش ہوتے ہیں۔ میں نے بھی بعض احباب کے اصرار پر ایک عریضہ لکھا تھا جسے کنویں میں ڈالنے کے خیال سے اس کے قریب پہنچا، پھر آگے کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ احباب کا بیان ہے کہ میری زبان سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ عجل یا صاحب الزمان عجل، ادر کنی ادر کنی الساعة الساعة کے

کلمات بلند ہوئے اور پھر میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔احباب کو حیرت ہوئی کہ وہ میری سنّی شناخت اور وہابی تعلیم وتربیت سے واقف تھے۔ان کے لیے میرے اندر امام غائب کے ظہور کی یہ شدید خواہش کچھ قابل فہم نہ تھی۔لیکن جب میں حواس میں واپس آیا تو مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

تو کیا اب بھی آپ کے اندر کوئی بین المسلکی مکالمہ چلتا رہتا ہے؟

بولے: لاشعور میں ایسا ہو تو ہو البتہ شعوری طور پر میں اسے دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ پتہ نہیں پھر کیا بات ہے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک شیعہ عالم کلام کرنے لگتا ہے اور کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی غیر شعوری طور پر میں وہابی اسلام کا مبلغ بن جاتا ہوں۔

اب میں سمجھی میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ پیا نے مداخلت کی۔ بولی بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے اندر بیک وقت دو شخصیتیں رہتی ہیں۔تمہیں بیک وقت دونوں ہی سے پیار ہے۔تم ان میں سے کسی ایک کو دربدر کرنے پر آمادہ نہیں۔

بولے: ہاں کبھی کبھی تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔

'میں نے سُنا ہے کہ بعض انسانوں کے اندر بیک وقت پانچ پانچ، سات سات شخصیتیں رہتی ہیں'، میں نے کہا۔

میری اس مداخلت پر کودرا مسکرائے۔ بولے: یہ سب ماہرین نفسیات کے تفنّن طبع کی باتیں ہیں اندازے ہیں، قیاس آرائیاں ہیں۔ میں نے اب تک اس موضوع پر جو کچھ پڑھا ہے اس کی روشنی میں میری رائے تو یہ ہے کہ انسانی دماغ کے اس پہلو کا مطالعہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔جس طرح ہم شعور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی طرح دل ودماغ کے پیدا کردہ مختلف التباسات کے بارے میں بھی ہمیں کچھ علم نہیں۔

'مگر نیوروسائنس نے دماغ کی عکسی تصویروں کے ذریعہ بہت کچھ منکشف کیا ہے۔تشنج اور دل گرفتگی کو سہارا دینے کے لیے بہت سی دوائیں ایجاد کی ہیں جن کے استعمال سے دماغ میں ہونے والے کیمیائی عدم توازن (chemical imbalance) کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔' پیا کی اس ماہرانہ مداخلت پر علی کودرا نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ بولے یہ سب ڈاکٹروں کے اوہامات ہیں جن کا ادویات کی کمپنیاں اور نفسیاتی وروحانی گرو دن رات پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ برین میپنگ کی حقیقت اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہم مریض کے

جذبات کو مشتعل کر کے دماغ کی طرف خون کے بہاؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ کیمیکل ایمبیلنس کی حقیقت ایک myth سے زیادہ نہیں۔ ابھی تک ہمارے پاس کوئی ایسا طریقۂ تفتیش نہیں ہے جو اس مفروضہ کیمیکل ایمبیلنس کی شہادت دے سکے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض ادویات دماغی اشتعال اور تشنج میں کسی قدر مفید پائی گئی ہیں۔

'پھر ان دواؤں کی کوئی سائنسی بنیاد تو ہوئی نا۔ اگر ان کے استعمال سے ذہنی اور نفسیاتی مریض شفا پاتے ہیں تو کہیں کوئی گڑ بڑی تو ہے جسے یہ دوائیں درست کر رہی ہیں'، پیا نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کی کوشش کی۔

میڈیکل سائنس کی اسی تعبیر سے تو مجھے اختلاف ہے۔ آپ جسے نفسیاتی مرض کہتی ہیں انھیں بہت سے لوگ روحانی بیداری یا بیدار مغزی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب آپ کے کانوں میں کوئی آواز آتی ہے جسے دوسرے لوگ سننے پر قادر نہیں ہوتے یا آپ اپنے اردگرد ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کے حیطۂ ادراک میں نہیں آتیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آپ شعور کی ایک بلند وارفع سطح پر جی رہے ہیں جہاں عام انسانوں کا گزر نہیں۔ اسے مرض کہنا، میرے خیال میں زیادتی ہے۔

'مگر میڈیکل سائنس تو abnormal behaviour کو قابو میں لانے کو ہی علاج سمجھتی ہے'، پیا نے اصرار جاری رکھا۔

'دیکھیے آپ نے پھر غلط لفظ کا استعمال کیا، اسے ابنارمل نہیں بلکہ سوپر نارمل کہیے'۔

گفتگو کو اصطلاحوں اور تعبیرات میں الجھتا دیکھ کر میں نے سوچا نیورو سائنس نسبتاً ایک نیا میدان ہے جہاں انسانی دماغ کے لامتناہی امکانات اور اس کی وسعتوں پر بہت سی باتیں کی جا سکتی ہیں۔ کودرا خود چونکہ ان مراحل سے گزرے ہیں، سو کیوں نہ اُن کے ذاتی تجربوں کی بابت کچھ متعین سوالات کیے جائیں تا کہ وہ دو شخصیتیں جو بیک وقت ان کے اندر رہتی، ایک دوسرے سے کلام کرتی اور بسا اوقات باہم اُلجھ پڑتی ہیں، ان کی تفہیم میں کچھ مدد مل سکے۔ اور کیا عجب کہ اس طرح شیعہ سنّی کی صدیوں پرانی خلیج کو پاٹنا ممکن ہو سکے۔

میں نے پوچھا: کودرا! یہ جو دو شخصیتوں والی بات ہے کیا یہ بھی محض ایک تراشیدہ اسطورہ ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

بولے: قطعیت کے ساتھ تو کچھ کہنا مشکل ہے کہ کوئی میرے اندر آتا اور جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور

لگتا ہے کہ میری شخصیت میں بیک وقت دو مراکز ہوں جیسے کسی بڑے اسٹیج پر مناظرے کے لیے دو ڈائس رکھے ہوتے ہیں۔ ایک ڈائس پر ایک تناظر سے بولتے ہوئے اچانک میں خود کو دوسرے ڈائس پر پاتا ہوں اور میرا تناظر یکسر بدل جاتا ہے۔ البتہ جب بھی میں کسی موقف کی حمایت کرتا ہوں میں اپنے نقطۂ نظر کو ہر حال میں منوانا چاہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر اعتماد اور قوّت کا ایک آبشار بہہ رہا ہو۔ پھر دفعتاً موسم بدلتا ہے، میرا اعتماد ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اب مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ناکامی اور نامرادی کا یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں موت ایک لگژری معلوم ہوتی ہے۔ چند ایک بار میں ایسی کیفیت سے گزرا ہوں۔ بظاہر بڑے خوشنما لیکن بڑے سنگین ہوتے ہیں یہ لمحات۔ انہیں الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے دونوں طرف ڈائس کو میری طلب شدید ہو، جیسے مناظرہ بازوں کو فتح کی جلدی ہو، جیسے بیک وقت دو مخالف سمتوں میں مجھے کھینچا جا رہا ہو، پھر دفعتاً کسی ایک پول پر میری گرفت چھوٹ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد مجھے پتا نہیں رہتا کہ آگے کیا ہوا؟ شاید اگر ایسا نہ ہو تو میں زندہ نہ بچ پاؤں۔

تو کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس کیفیت کے گزر جانے کے بعد خود آپ کو اس کا اندازہ ہو سکا ہو؟

'جی ہاں! دسیوں بار۔ جب تک میں حواس میں رہتا ہوں، جب تک مکالمے میں دونوں پولز پر گرفت برقرار رہتی ہے، میں ایک طرح کے انتقالِ دانش (intellectual shifting) کو محسوس کرتا، بلکہ اس سے محظوظ ہوتا ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ کھٹکا گرنے سے پہلے کی بات ہے۔ کاش کہ میں اپنا دماغ آپ کو تھوڑی دیر کے لیے مستعار دے سکتا پھر شاید کسی قدر آپ کو اندازہ ہو پاتا کہ دو دنیاؤں میں رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کھٹکا گرانا تو دراصل ایک طرح کی (survival strategy) ہے؛ جو لوگ حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتے وہ صرف survive کرتے ہیں، پرمسرت بھرپور زندگی جینے سے محروم رہتے ہیں۔ میرا غم ایک شخص کا ذاتی سانحہ نہیں بلکہ ایک پوری امت کی محرومی کا علامیہ ہے جس نے صدیوں سے دو مختلف نظری قطب پر جینا گوارا کر رکھا ہے۔' یہ کہتے ہوئے علی کودرا کچھ آبدیدہ سے ہو گئے۔

علی کودرا کو یاس و نامرادی کی گرفت میں واپس جاتے دیکھ کر میں نے انھیں سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ میں نے کہا: کودرا! آپ کے اندرون میں سلفی اور شیعی اسلام کے مابین جو مکالمہ مدت سے جاری رہا ہے اگر اسے ذات کے نہاں خانے سے نکال کر امت کے وسیع اسٹیج پر منعقد کیا جا سکے اور دونوں طرف حالات کی سنگینی کا کسی قدر اندازہ بھی ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ بات یقیناً آگے بڑھے گی۔ ہماری بیشتر باہمی غلط فہمیاں

دراصل اسی سبب ہیں کہ ہم فریقِ مخالف کے نقطۂ نظر اور اس کے علمی سرمایے سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے۔

بولے: میں ناامید نہیں ہوں لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ فرد، گروہ اور فرقہ جب تک کہ امت نہیں بنتے، ان کے فکری سفر میں بہت سے ایسے seductive moments آتے ہیں جب یہ اپنے آپ پر کنٹرول کھو دیتے ہیں۔

seductive moments?

جی ہاں! وہ جو کہتے ہیں نا art of seduction، اس کا اطلاق صرف جنسی زندگی پر نہیں ہوتا۔ کبھی شاعری اور نغمہ انسان کو عقل و دانش کے کھونٹے سے بہالے جاتا ہے، کبھی سلفِ صالحین اور چرچ فادرس کا حوالہ دے کر اس کی عقل کو ماؤف اور معطل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ سب ایسے traps ہیں جس کے آگے تحلیل و تجزیے، افہام و تفہیم اور مکالمے و مناقشے کی قوت دم توڑ دیتی ہے۔ مجلسِ عزا میں اہل بیت کی شان میں سحر انگیز قصائد سنیئے، تاریخی واقعات سے خواہ انھیں کچھ بھی علاقہ نہ ہو، شاعری کے فسوں میں آپ بہہ جاتے ہیں۔ اسی طرح سلف صالحین اور چرچ فادرس کا موقف خواہ کتنا ہی بودا اور پھسپھسا ہو، بڑے بڑے ناموں کا طلسم آپ کو الگ راستہ بنانے سے روکتا ہے۔ یہ سب seduction ہی کے تو مختلف انداز ہیں۔

seduction کی یہ تعریف سن کر ڈاکٹر پیا کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ایک لطیف سی معنیٰ خیز مُسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی، بولی: کودرا! بڑی دلکشی ہے آپ کی گفتگو میں۔ وہی دلفریبی، وہی سحر انگریزی اور وہی seductive effect جو بقول آپ کے غیر محسوس طور پر انسان کی عقل و خرد کو بہالے جاتا ہے۔

'جی ہاں! حبّ کلام بھی seduction ہی کی ایک قسم ہے۔ کلام کے سحر کا وار محبوب کے عشوہ و ادا کے مقابلے میں کہیں زیادہ کاری ہوتا ہے'، کودرا نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

تشنج کے حملہ نے، ایسا لگتا تھا جیسے علی کودرا کے بیان کی گرہ کھول دی ہو۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان کے فرمودات کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ لیکن وقت اگلے پروگرام کا ہو چلا تھا۔ جہاں ہم لوگوں کو طے شدہ پروگرام کے مطابق پروفیسر وولف کی گل افشانی گفتار کا تختۂ مشق بننا تھا۔

'دیکھیے ہم لیم صفت انسانوں پر وولف کے کلامی عشوہ و ادا کے غمزے کیا گل کھلاتے ہیں'۔

ڈاکٹر پیا نے آوازہ کسا اور ہم لوگ نائٹس ہال کی جانب چل پڑے۔

۷

مسدود راستے

پروفیسر وولف کہنے کو تو ایکانومکس کے پروفیسر ہیں لیکن مدرسانہ طرزِ فکر سے انھیں دور کا بھی علاقہ نہیں۔ out of box thinking ان کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے۔ ان کی گفتگو بھاری بھرکم اصطلاحوں سے مملو نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پیچیدہ معاشی مسائل پر ان کے بیان میں کہانی کا سا لطف ملتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ محض ایک دانشور اور معلم نہیں بلکہ جہد و عمل کے داعی اور نقیب بھی ہیں۔ بوسنیا کی جنگ کے دوران وہ دانشور سے کہیں زیادہ صحافی کے روپ میں نظر آئے۔ سربوں کی بربریت کے خلاف مسلسل ان کا قلم متحرک رہا۔ ان کو جب بھی سننے کا اتفاق ہوا ان کی گفتگو میں فرحت و انبساط کی نشاط انگیز کیفیت پائی۔ ایک بار بوسنیائی جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ معاشی سرگرمیاں جب بند گلی میں داخل ہو جاتی ہیں، جب اُمید کی کوئی کرن نہیں دِکھتی تو انسانی معاشرہ cannibalism کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر گھٹا ٹوپ مایوسی کے بطن سے سلوبدون میلوسے وِچ جیسے آدم خور کا پیدا ہونا ایک لازمی اور فطری عمل ہے۔ بقول پروفیسر وولف مغربی دنیا میں معیشت کا بحران بھی ایک ایسی ہی صورتِ حال پر منتج ہو سکتا ہے۔ ہمارے حلقۂ احباب کے لیے پروفیسر وولف کا عالمانہ طرزِ فکر کچھ نیا نہ تھا لیکن اس کے باوجود ان کے خطبے سے بے اعتنائی ممکن نہ تھی کہ ان کا ہر بیان ایک بالکل ہی نئی کہانی کے لطف و انبساط سے معمور ہوتا ہے۔

آج کی گفتگو کا موضوع تھا: "Our Stolen Future"۔ پروفیسر وولف کے اشارے پر پروجیکٹر کی مدد سے مختلف تصویریں یکے بعد دیگرے اسکرین پر طلوع ہوتی رہیں۔ غالبًا یہ تیس کی دہائی کے وہ مناظر تھے جسے معاشی تاریخ میں Great Depression کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سڑکوں پر مزدوروں کا ہجوم، انقلاب کی آمد آمد، بھوکے بچے، نا آسودہ اور مضمحل چہرے، ویران صنعتی معاشرے کی تباہ کن تصاویر۔ پھر تصویروں کی

زبانی جنگ عظیم دوم کی کہانی، شہری آبادی کی تباہی، بمباری، غلاموں کی منفعت بخش تجارت، برطانوی اور امریکی سرمایہ داری کے پیچھے انسانی محرومیوں اور تعذیب مسلسل کی دردناک داستان۔ پروفیسر وولف کی اس بے زبان اور بے گفتہ تقریر نے اشاروں ہی اشاروں میں سرمایہ داری کی مکروہ تاریخ اور انسانوں پر ہونے والی تعذیبِ مسلسل سے کچھ اس طرح نقاب کشائی کی کہ بیان سے باہر۔ ناظرین محوِ حیرت تھے بلکہ بیتاب اور منتظر کہ دیکھیے پروفیسر وولف کی شعلہ بیانی ان بے جان تصاویر میں کس طرح روح پھونکتی ہے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں سلائڈ شو کا یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا اور تب پروفیسر وولف کچھ اس طرح گویا ہوئے:

'عزیز دوستو! اس حادثۂ فاجعہ سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہمارے مستقبل پر سرمایہ دار غاصبوں نے کچھ اس طرح شب خوں مارا کہ ہمیں اس کے اسرار وعواقب کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔ پروپیگنڈہ تو اس بات کا ہے کہ مغرب ایک کھلا معاشرہ ہے جہاں ہر مسئلہ پر آزادانہ گفتگو اور مناقشے کو مستحسن سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشی نظام پر گفتگو یا سرمایہ داری کے علمی اور عقلی تجزیے کو ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ آپ شراب نوشی کی مضرتوں پر خوب گفتگو کیجیے، خاندانی اقدار کی بحالی کی تحریک چلایئے، اسقاطِ حمل اور ہم جنس شادیوں کی حمایت یا مخالفت میں جو چاہیں کہیں، لیکن خبردار کہ معاشی نظام اور اس کے مکر وفریب سے پردہ اُٹھانے کی کوئی کوشش آپ کی دانشوری پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ مغرب کے بظاہر کھلے معاشرے میں معاشیات جیسے اہم مسئلے پر آخر کسی آزادانہ گفتگو کا دروازہ کیسے بند کیا جا سکتا ہے۔ تو سنیے کہ یہ سب کچھ اب تک کیسے روا رکھا گیا ہے۔

اُصولی طور پر ایکانومکس دراصل لین دین، نفع اور نقصان کا ایک ایسا علم ہے جس سے ہر شخص کسی نہ کسی درجہ میں وابستہ ہے۔ وہ اسے اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں روبہ عمل لاتا ہے اور اس کی بنیاد پر مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کرتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ نفع ونقصان کا یہ عام فہم علم عام انسانوں کی فہم سے بالا ہو لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ فی زمانہ اکانومکس کے بارے میں عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے جسے صرف متخصصین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عام انسانوں کے لیے اس کے مالۂ وماعلیہ سے واقف ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا دنیا کی ایک بڑی اکثریت حتیٰ کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک قابل ذکر تعداد اس بے اعتمادی میں جیتی ہے کہ معاشی مسائل میں دسترس اس کے بس کی بات نہیں۔ حالانکہ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس سے تمام ہی انسانوں کا حال اور مستقبل وابستہ ہے۔

ہماری گاڑھی کمائی کہاں جاتی ہے، ہماری محنتوں کا صحیح معاشی ثمرہ کیا ہے، وہ کدھر جاتا ہے، انسانوں کے مابین آمدنیوں کے حیرت انگریز تفاوت کا سبب کیا ہے؟ ان اُمور کی نقاب کشائی عام انسانی دائرے سے باہر سمجھی جاتی ہے۔ ہے نا یہ ایک عجیب سی بات؟ یہ کہتے ہوئے پروفیسر وولف نے چہرے سے عینک اُتاری، اسٹیج کا ایک مضطربانہ چکر لگایا پھر سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولے کہ دوستو! اگر عام انسانوں کو صرف اس بات کا پتہ چل جائے کہ ہماری معاشی سرگرمیوں کے پس پردہ کیا کھیل کھیلا جارہا ہے تو یقین جانو کہ دنیا چشم زدن میں ایک انقلاب کی زد میں ہوگی۔ پھر کسی عالمانہ تجزیے اور ذرائع ابلاغ کی ساحری میں یہ کس بل نہ ہوگا کہ اس عمومی بغاوت پر بند باندھ سکے۔ آپ کہیں گے کہ اتنی کھلی حقیقت پر اتنا دبیز پردہ اور وہ بھی اتنے عرصے سے، آخر کس طرح ڈالے رکھا گیا ہے؟ بنیادی طور پر یہ سب کچھ مصطلحات کا کھیل ہے بلکہ سپاٹ الفاظ کی مینا کاری کہہ لیجئے۔ مبیّن اور مبرّہن حقیقت پر بے جان جارگن جب اپنا گھیرا ڈال دے تو معانی کی ترسیل پر بند باندھنا ممکن ہوجاتا ہے۔ جس طرح علمائے مذاہب اور علمائے قانون پیچیدہ قانونی موشگافیوں کے ذریعہ تعبیر کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں، اسی طرح معاشی ماہرین نے لین دین کی عام فہم سائنس پر پیچیدہ الفاظ و مصطلحات کا پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ لہٰذا جس طرح تلمودی ماہرین کے بغیر توراۃ کے معانی تک عام انسانوں کی رسائی ممکن نہیں اور جس طرح وکلاء اور فقہاء کے بغیر قانون کی گتھیوں کو سلجھانا ناممکن خیال کیا جاتا ہے اسی طرح معاشیات کا میدان بھی economist حضرات کی خصوصی اجارہ داری بن گئی ہے۔ رہے متخصصین تو ان کی ایک بڑی تعداد مدرسانہ طرزِ فکر کے سبب کسی حد تک مسائل کی سنگینی سے واقف تو ہے لیکن ان کی ذہنی تربیت نظامِ وقت کے ہاتھوں کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ ایک متبادل معاشی نظام کا تصور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا۔ صورتحال اس وقت مزید سنگین ہوجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے عروج وارتقاء کی مکروہ اور بہیمانہ تاریخ مقبول عام تاریخ نویسی سے بڑی حد تک غائب کردی گئی ہے۔ گو کہ گاہے بہ گاہے ایسی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں جنہوں نے ہمیں تاریخ کے مختلف لمحات میں صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا ہے لیکن انھیں ہم تہذیب وثقافت کے باب میں رکھتے ہیں، معاشی تاریخ کا حصہ سمجھ کر اپنے طالب علموں کو پڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر برطانوی اور امریکی سرمایہ داری کا ارتقاء اور عروج جس طرح سیاہ فام غلاموں کے خون سے آلودہ ہے اس سے تو شاید ہمارے دانشور واقف ہوں لیکن ۱۹۴۴ء میں ایرک ولیمس کی کتاب *Capitalism and Slavery* کی اشاعت

سے پہلے اہلِ علم اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ مغرب میں ادارۂ غلامی کا خاتمہ کسی انسانی ہمدردی یا حریت فکری کے سبب نہیں ہوا بلکہ اصل قصہ یہ تھا کہ خودکار مشینوں کے میدان میں آجانے اور غلاموں کی روز افزوں بغاوت اور ان کے اندر پلنے والی خود آگہی کی تحریک کے سبب غلامی ایک منفعت بخش تجارت نہیں رہ گئی تھی سو اس ادارے کا خاتمہ خود سرمایہ داروں کے حق میں تھا۔ حیرت ہے کہ مقبول عام تاریخ Great Depression کے بعد پیش آنے والے وقوعات اور اس کے کردار وعوامل کو تحقیق وتجزیے کا موضوع بنانے سے کیوں گریزاں رہی ہے۔ آج میں آپ کی خدمت میں مکروہ معاشی تاریخ کا فراموش کردہ صرف ایک ورق از راہِ مثال رکھتا ہوں تا کہ معاملہ کی سنگینی کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے۔ Great Depression پر کوئی پون صدی ہونے کو آئی لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے اثرات سے اب تک باہر نہیں آسکے؟۔ جو لوگ ۱۹۲۹ء کے معاشی بحران کے ذمہ دار تھے، آج بھی دنیا ان ہی سرمایہ داروں کے شکنجہ میں ہے۔ گولڈ مین شیس، جے پی مارگن اور اس جیسے دیگر تجارتی ادارے دراصل آدم خور عفریت ہیں جنھوں نے موجودہ معاشی نظام پر کسی آزادانہ علمی گفتگو پر روک لگا رکھی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے معاشی بحران کے نتیجہ میں جب امریکہ میں (25%) پچیس فیصد لوگ بے روزگار ہو گئے تھے اس وقت عوامی بغاوت کی صورتحال تھی، ٹریڈ یونینیں، سوشلسٹ اور کمیونسٹ گروپ متحد تھے۔ لوگ اس نظام سے سخت نالاں تھے جس نے بھکمری کی اس کیفیت کو جنم دیا تھا۔ عین اسی لمحہ جب اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی تحریک شروع ہونے والی تھی ۱۹۳۳ء میں امریکی صدر روز ویلٹ نے سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے عجیب وغریب منصوبہ بندی کی۔ روز ویلٹ معاملہ کی سنگینی کو بھانپ گئے۔ انھوں نے سرمایہ داروں کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ اپنی دولت کا ایک قابل ذکر حصہ فلاحی اسکیموں کے لیے مختص کر دیں تا کہ اس عوامی غیض وغضب پر بند باندھا جا سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ مزدوروں کا کام پر واپس جانا اور پیداوار میں اضافہ دراصل سرمایہ داروں کی منفعت اور ان کی بقا کی ضمانت ہے۔ صدر روز ویلٹ سرمایہ داروں کے ایک بڑے طبقے کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ دیکھتے دیکھتے حکومت نے سوشل سکیوریٹی کا نظام تشکیل دیا، بڑے پیمانے پر نئی نئی اسامیوں پر بے روزگاروں کا تقرر عمل میں آیا اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں کیا گیا جب حکومت معاشی بحران کی بلندیوں پر تھی۔ ان غیر معمولی اقدامات نے سرمایہ داری کے مکروہ چہرے پر فلاحی اسکیموں کا پردہ کچھ اس طرح ڈالا کہ جلد ہی نظامِ معیشت کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات دم توڑ گئے۔ ۱۹۴۲ء میں روز ویلٹ نے مرفہ الحال لوگوں کی آمدنی پر سو فیصد ٹیکس لگا دیا۔ کہا گیا کہ پچیس ہزار ڈالر

سالانہ سے زائد آمدنی پر فرد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ہر زائد ڈالر پر ایک ڈالر حکومت کو ٹیکس کی شکل میں ادا کرے۔ تجارتی اداروں کے لیے یہ شرح ڈیڑھ ڈالر مقرر کی گئی یعنی ڈیڑھ سو فیصد۔ ان اقدامات سے فوری طور پر معاشرے میں سرمایہ کی گردش تیز ہوئی۔ خوشحالی کے مناظر لوٹ آئے اور happy days are here again امریکہ کا مقبول عام نغمہ بن گیا۔ روز ویلٹ گو کہ نظام کو تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ البتہ وہ اپنی عوامی مقبولیت اور خاندانی جاہ وحشم کے سبب سرمایہ کاروں سے negotiate کر سکتے تھے۔ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت سامنے نہ آئی جو سرمایہ داری کے عفریت کو لگام دے سکتی۔ ادھر سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ ٹیکس کے نام پر خطیر رقمیں ادا کرنے کے بجائے کیوں نہ دونوں سیاسی پارٹیوں کو انتخابی چندوں اور مختلف قسم کی اعانتوں کے ذریعہ اپنا رہینِ منّت بنا لیا جائے۔ رفتہ رفتہ بات یہاں تک آ پہنچی کہ ۱۹۹۰ء میں بل کلنٹن کے ہاتھوں ایک ایسے بل پر دستخط ہوگئے جس سے انوسٹمنٹ بینکنگ اور کمرشیل بینکنگ کے دائرے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بل پر ابھی آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۹۹۸ء میں معاشی نظام تہہ و بالا ہوتا نظر آیا۔ کارپوریٹ نے سیاسی نظام کو جب چاہا جس طرح چاہا اپنی منفعت کے لیے استعمال کیا۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ۱۹۴۳ء میں جو تجارتی ادارے ڈیڑھ سو فیصد ٹیکس دیا کرتے تھے آج ان سے صرف پچیس فیصد وصول کیا جاتا ہے۔ متمول افراد جو ۱۹۴۳ء میں ۹۴ فیصد ٹیکس دیا کرتے تھے اب محض ۳۰ فیصد ادا کرنے کے سزاوار ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فلاحی اسکیموں کے لیے فنڈ کی شدید قلّت ہے۔ کارپوریٹ اداروں کے بے مہابا استحصالی رویّے پر حکومت کی کوئی گرفت نہیں۔ وہ جب چاہیں اپنے اخراجات میں کمی اور آمدنی میں اضافہ کے لیے کارکنان کو راتوں رات فارغ کر دیں اور اپنے تجارتی یونٹ دور دراز کے سستے ملکوں میں منتقل کر دیں۔ یہ ہے وہ صورتحال جس نے مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرے کے مستقبل کے سلسلے میں سخت مایوسی کو جنم دیا ہے۔

عزیز دوستو! اب یہ دھوکے کی ٹٹی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ امریکہ میں تو ۱۹۷۳ء سے ہی شرحِ نمو گراوٹ کا شکار رہی ہے۔ یہ جو آپ جاہ وحشم کا طلسم دیکھتے ہیں اور یہ جو امریکی معاشرہ ہالی ووڈ کی انبساط انگیز لہروں میں لپٹا دکھائی دیتا ہے تو یہ سب قرضوں کی سیاست کے سبب ہے۔ جوں ہی Cinematographic اثرات کا منور ہالہ غائب ہوگا آپ دیکھیں گے کہ عام امریکی شہریوں کی حقیقی زندگی بڑی تلخ اور قابل رحم نظر آئے گی۔ مصیبت یہ ہے کہ اصل صورتحال کا عام لوگوں کو ادراک نہیں کہ ہم ایک media

blindness کے عہد میں جی رہے ہیں۔ کومکاسٹ، والٹ ڈزنی، فاکس، ٹائم وارنر، وایا کوم اور سی بی ایس جیسی کمپنیوں نے امریکی میڈیا کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہ میڈیا کمپنیاں امریکہ کی اسّی، نوّے فیصد آبادی کو جو چاہتی ہیں بس وہی دکھاتی ہیں۔ پھر انھیں اصل صورتحال کا علم ہو تو کیسے؟ رہیں یونیورسٹیاں تو ان کا حال یہ ہے کہ وہ روشنی بکھیرنے اور بصیرت عام کرنے کے بجائے ان ہی سرمایہ داروں کے لیے منیجر تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کی تحقیقی ترجیحات اور دانشورانہ زندگی کے غایت و اہداف کا تعین بھی اب وہ سرمایہ دار کرتے ہیں جن کی فنڈنگ سے اب کوئی قابل ذکر یونیورسٹی محفوظ نہیں۔ سچ پوچھیے تو عہد حاضر کا سرمایہ دارانہ معاشرہ زندہ انسانوں کا معاشرہ نہیں، اس کی مثال پردۂ سیمیں پر اُبھرنے والے دلکش اشتہار کی ہے۔ ایک اشتہار جب اپنی اپیل کھو دیتا ہے تو نئے عناوین کے ساتھ نیا اشتہار سامنے آجاتا ہے۔ اس image based سوسائٹی میں بظاہر ہالی ووڈ کی چمک دمک نظر آتی ہے لیکن ہے یہ سب کچھ سنیمائی ٹکنیک کی جادوگری۔ سرمایہ داری نے نہ صرف ہماری معاشرت اور سیاست کو تباہ کیا بلکہ پیداوار میں اضافے کے لیے ماحولیات پر کچھ اس طرح نقب لگایا کہ خود انسانی زندگی کے مستقبل پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرے میں سب کچھ commodity بن جائے، مادی منفعت کے علاوہ کوئی خیال تحریک کا باعث نہ ہو، مقدس اور اخلاقی قدروں کا اعتبار جاتا رہے تو پھر بالآخر انسانوں کو بھی commodity کے طور پر دیکھا جانے لگتا ہے۔ جب کائنات کے امین کا رتبہ اس قدر گھٹ جائے تو پھر انسانی معاشرے میں ایک بے سمتی اور عدم معنویت کا پیدا ہونا فطری ہے۔ کہانی بڑی دل گرفتہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں پوری طرح نقاب الٹ دوں تو کرّۂ ارضی پر انسانوں کی ایک قابل ذکر تعداد زندگی جینے کا حوصلہ ہی کھو دے۔

پروفیسر وولف کی گفتگو توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی۔ ان کے بیانِ دلفریب کے ساتھ اسکرین پر تصویریں، ڈائگرام اور اعداد و شمار کے گوشوارے کچھ اس انداز سے بدلتے رہے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ گھنٹہ بھر کس طرح گذر گیا۔ تصاویر اور گوشوارے ہی کچھ کم نہ تھے، اس پر پروفیسر وولف کی گل افشانیِ گفتار؛ وہ اپنے مخصوص انداز میں بار بار اس نظام کو بدلنے کی بات کرتے۔ Is there an alternative? کی صدا وہ کچھ اس انداز سے بلند کرتے کہ دل میں ایک ہوک سی اٹھتی، یاس و ناامیدی میں گاہے اضافہ ہو جاتا اور گاہے ایسا لگتا جیسے وہ اپنی زنبیل سے جلد ہی کوئی نسخہ برآمد کرنے والے ہوں۔

میں سوچتا رہا، بار الٰہا یہ کیسی عجیب صورتحال ہے کہ جن لوگوں کو تاریخ کی مشکل گھڑی میں متبادل کی

فراہمی کا کام سونپا گیا تھا اور جن سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ وہ حاملین وحی کی حیثیت سے رہتی دنیا تک تاریخ کے انحراف کی درستگی کے لیے سامنے آئیں گے، خود وہ آج سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ طرفہ یہ کہ انھیں صورتحال کی سنگینی کا واقعی اندازہ بھی نہیں بلکہ وہ اقوام غیر کے مقابلے میں دوہری محرومی کے شکار ہیں۔ ایک تو سرمایہ داری کا جابر شکنجہ جس نے دوسروں کی طرح ہمیں بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے دوسری طرف ہماری ذات کے نہاں خانے میں ایک حشر برپا ہے، ایک فکری خانہ جنگی اور نظری تشتت کے سبب ہم اپنی داخلی صف بندی کی پوزیشن میں بھی نہیں۔ علی کودرا کا تجزیہ امت کی تعمیر نو کے سلسلے میں سخت مایوسی کو جنم دینے کا باعث ہوا تھا، اب پروفیسر وولف کے معاشی تجزیوں نے سرمایہ داری کے مکروہ چہرے کو کچھ اس طرح بے نقاب کیا کہ ایک روشن مستقبل کا امکان یکسر جاتا رہا۔

بارالہا! یہ کیسی بے بسی ہے؟ مجھے اپنی طالب علمی کے وہ ایام یاد آئے جب بلند عزائم اور دل شکستہ تجزیوں میں جنگ جاری رہتی۔ ان دنوں ایسے خواب میرے تعاقب میں رہتے جن میں سمت کے کھوئے جانے اور راہوں کے مسدود ہونے کا ایک لامتناہی سلسلہ پایا جاتا۔ کیا دیکھتا کہ ایک بلند و بالا عمارت کے کشادہ زینے سے میں بآسانی نیچے اتر رہا ہوں دفعتاً زینہ تنگ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میرے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھانا مشکل ہو رہا ہے۔ دیواریں چاروں جانب سے سمٹ رہی ہیں، میں سخت حبس کی کیفیت محسوس کرتا، ایسا لگتا جیسے دم گھٹ کر رہ جائے گا اور تبھی آنکھ کھل جاتی۔

راہیں مسدود ہونے کا عذاب اس قدر شدید اور جان لیوا ہوتا ہے اس کا کسی قدر اندازہ مجھے ان خوابوں کے ذریعہ ہوا۔ کیا دیکھتا کہ میں کوئی ادق سی کتاب پڑھ رہا ہوں، مضامین اتنے واضح ہوتے کہ بیداری کے بعد بھی پڑھی ہوئی چیزیں حافظے میں محفوظ رہتیں۔ لیکن یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی کہ یہ وہ کتابیں ہیں جو حقیقی دنیا میں نہیں پائی جاتیں۔ شاید ابھی ان کا لکھا جانا باقی ہو۔ ان خوابوں سے بیداری کے بعد جسمانی اور ذہنی تکان کا یہ عالم ہوتا گویا کسی بڑی مشقت سے فارغ ہوئے ہوں۔ اس سلسلہ نے جب ذرا طول کھینچا تو ایک دن دعائے نیم شبی میں اپنے رب سے یہ شکوہ کر بیٹھا، بارالہا جب راستے مسدود ہیں، سمت کھوئی گئی ہے تو یہ کیا بھید ہے کہ تو ہماری دادرسی کے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیجتا؟

برسوں بعد ایک بوسنیائی طالبہ کی زبان سے بعینہٖ یہی شکوہ سُن کر بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔ ایسا لگا جیسے کہنے والے نے شدت اظہار میں کوئی نامبارک بات، کوئی کلمۂ گناہ زبان سے نکال دیا

ہو۔اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ سخت مایوسی اور ہلا مارنے والی بے بسی فکر ونظر کو کس حد تک ماؤف کرسکتی ہے۔یہ اگست ۱۹۹۸ء کی بات ہے جنگ مخالف تنظیموں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس مجھے کروشیا کے معروف سیاحتی مقام پورِچ میں لے آئی تھی۔ہوٹل پکال میں دھواں دھار تقریروں، پر جوش مناقشوں اور پرعزم مباحثوں کا سلسلہ جاری تھا۔سرب، کروٹ اور بوسنیائی دانشوروں اور رضا کاروں کے علاوہ یوروپ کے دوسرے ملکوں سے مساعی امن کے محرکین، اہنسا کے دعویدار خواتین وحضرات کی ایک قابل ذکر تعداد جمع تھی۔بوسنیا میں گو کہ جنگ ختم ہو چکی تھی، دل و دماغ پر ابھی اس کے زخم تازہ تھے۔ایک قیامت عظمیٰ تھی جو اہل بوسنیا پر گزری تھی۔لیکن ان واقعات کی تفصیلات جب خود ان کی زبانی سننے کو ملتے جو کسی طرح خوش قسمتی سے اس جہنم سے بچ نکلے تھے تو شارکین کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ایک مہذب معاشرے میں انسانوں کے ہاتھوں ظلم و بربریت کے ایسے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔

اِلمینہ یہی کوئی بیس بائیس سال کی لڑکی رہی ہوگی۔کتابی چہرہ، روشن آنکھیں، جن میں کبھی ذہانت اور امیدوں کی غیر معمولی رمق دکھائی دیتی اور جو کبھی دور خلا میں کسی موہوم چیز کی تلاش میں محو نظر آتی۔کانفرنس میں جب اس نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو ایسا لگتا تھا کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہو، جیسے وہ فضاؤں کی بلندی سے اقوام عالم کو کوئی اہم پیغام دینا چاہتی ہو۔اس کا اعتماد اور لہجہ کی بلند آہنگی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ عام انسانوں کی قبیل سے نہیں جو حالات کی پیداوار ہوتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے عزم وحوصلے حالات کو جنم دیتے اور اس کا رخ موڑ دیتے ہیں۔لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک سربرنیکا کے بیان پر اس کی آواز کچھ بجھ سی گئی۔ایسا لگا جیسے جملے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے ہوں اور اپنی چھوٹی بہن امینہ کے ذکر پر تو وہ کچھ اس طرح آبدیدہ ہوئی کہ آگے اس کے لیے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔اہل مجلس آبدیدہ تھے مگر اسے ان کی آبدیدگی پر سخت شکوہ تھا، بلکہ شدید غصہ۔روہانسی آواز پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے اس نے بمشکل اتنا کہا: معاف کیجیے گا میرا مقصد ہمدردیوں کا حصول نہیں۔میں اسے اپنی عزت نفس کی سخت توہین سمجھتی ہوں کہ لوگ میرے حالات پر ترس کھائیں مجھے اور میری قوم کو ترحم بھری نگاہوں سے دیکھیں۔آپ حضرات للہ اپنی ہمدردیوں کو سمیٹ کر رکھیں۔مجھے ذلت کی اس سطح پر نہ لائیں۔اِلمینہ بظاہر اپنے اس ادھورے خطاب میں وہ سب کچھ کہہ گئی جس کے بیان کی تاب قادر الکلام خطیبوں کو نہیں ہوتی۔

۸

سر کٹا میراث

ہوٹل پکال ساحل سمندر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ ایک دن ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتا ہوا ذرا دور تک نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ واک وے سے ذرا ہٹ کر پتھریلے ساحل کے قریب جہاں پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں جنگ عظیم دوم کے متروکہ بنکروں سے مل کر ایک پلیٹ فارم سا بناتی ہیں ان پر درختوں کی ترچھی شاخوں نے سائبان بنا رکھا ہے جس کے زیر سایہ کچھ لوگ فرشی مجلس پر بیٹھے ہیں۔ میں اس مجلس سے اسی طرح بے اعتنائی کے ساتھ آگے گزر جاتا کہ جا بجا ساحل کے مامن گوشوں اور فطرت کی آغوش میں سیاحوں کے غول اور نوجوان ہنستے مسکراتے جوڑوں کی چلت پھرت معمول کی بات تھی، لیکن تبھی ایک بلند آہنگ سلام نے میرا راستہ روکا۔ سترہ اٹھارہ سال کا ایک نوجوان میری طرف تیز تیز قدموں سے بڑھتا ہوا آیا۔ گرم جوش مصافحہ کے بعد کہنے لگا کیا آپ ہماری مجلس میں بیٹھنا پسند کریں گے۔ اب جو میں نے نظر اٹھائی اور ذرا غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ کانفرنس کے نوجوان شرکاء کی ایک ٹولی درختوں کے سائبان تلے فطرت کا لطف لے رہی ہے۔ پتھریلے فرش پر ایک چادر بچھی ہے جس پر خورونوش کی کچھ اشیاء رکھی ہیں۔ کنارے ایک خالی تھیلا اوندھا پڑا ہے، ایسا لگتا تھا جیسے نوجوانوں کی یہ ٹولی کسی پکنک پر آئی ہو۔

اچھا تو المینہ آپ یہاں ہیں؟ میں نے مسرت کا اظہار کیا۔

وہ میرے احترام میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ آیئے تشریف لایئے، اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ اتنی دور ہندوستان سے تشریف لائے ہیں۔ اس دن آپ کی گفتگو سُن کر مجھے بڑا حوصلہ ملا۔ بوسنیائی مشن میں آپ کی دلچسپی اور شرکت نے مجھے اس احساس سے سرشار کیا کہ میں محرومی اور مایوسی کے اس سمندر میں اکیلی نہیں، ایک بڑی امت کا حصہ ہوں اور ہاں آپ کیا پینا چاہیں گے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے

جوس کا کاغذی گلاس میری طرف بڑھا دیا۔اور ہاں یہ مچھلی کے قتلے ہیں۔ان سے بھی شغل کیجئے۔

شکریہ بہت بہت، میرے لیے یہی کافی ہے۔میں نے جوس اس کے ہاتھوں سے لیا اور وہیں چادر کے ایک کونے پر اپنی نشست سنبھالی۔

جی ہاں ملنا تو میں بھی چاہتا تھا۔اس دن آپ کی تقریر ادھوری رہ گئی تھی۔

ادھوری تقریر کے ذکر پر المینہ کے چہرے پر پریشانی کے کچھ آثار ہویدا ہوئے۔پھر ایسا لگا جیسے اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا ہو۔ایک خوشگوار مگر پھیکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر واپس آ گئی۔ان سے ملیے یہ ہیں ایمان۔یہ بھی بوسنیا کی رہنے والی ہیں۔اس نے پاس بیٹھی ہوئی ایک ہم عمر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔اور میرا نام لوسیہ ہے، میں زغرب کی رہنے والی ہوں، یہ کہتے ہوئے لوسیہ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔اور یہ ہے حسن میرا چھوٹا بھائی، میری کل کائنات۔یہ کہتے ہوئے المینہ نے اس نوجوان کو، جس کے سلام نے میرا راستہ روکا تھا، اپنی آغوش میں بھینچ سا لیا۔گفتگو کا سلسلہ جب ذرا دراز ہوا تو پتا چلا کہ المینہ، ایمان اور حسن زغرب کے اسلامی مرکز میں پناہ گزینوں کی حیثیت سے مقیم ہیں۔لوسیہ خاص زغرب کی رہنے والی کروٹ عیسائی فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور وہاں مساعیٔ امن کی کسی تنظیم سے وابستہ ہے۔

'کتنا خوبصورت ہے یہاں سے پرانے شہر کا منظر'۔میں نے ایک نگاہ سمندر کی دوسری جانب خاموش فطرت کی آغوش میں چرچ کے قدیم ٹاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'لیکن ان ہی عمارتوں سے پرے چند میل کے فاصلے پر، جہاں بوسنیا کی سرحد شروع ہوتی ہے، زندگی آج بھی ایک جہنم سے کم نہیں'۔ایمان نے پورچ کے قدیم شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تو کیا آپ کا آبائی شہر یہیں کہیں قریب واقع ہے؟

نہیں، اتنا قریب بھی نہیں۔میں تو پریدور کی رہنے والی ہوں، پریدور کا نام سُنا ہے آپ نے؟

جی ہاں پچھلے دنوں اجتماعی قبروں کی دریافت کے سبب پریدور خبروں کی سرخیوں میں تھا۔سنا تھا کہ جنگی جرائم کی تحقیق کے لیے اجتماعی قبروں سے لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔اس قضیے کا کیا بنا؟

بولی: لاشوں کی یافت کا کام جاری ہے۔بڑا ہی اندوہناک ہے یہ منظر۔کیا پتہ کب کس کے باپ کا پاؤں اور کس کی ماں کی کلائی ان قبروں سے کس حالت میں برآمد ہو۔

کیا مطلب؟ کیا یہ لاشیں اب قابل شناخت حالت میں نہیں رہ گئیں؟ میں نے صورتحال جاننے کی

کوشش کی۔

بولی میرا ایک ماموں زاد بھائی جو پیشے سے ڈاکٹر ہے، جنگی جرائم کی تحقیق کرنے والی اقوام متحدہ کی ٹیم میں شامل تھا۔ پچھلے دنوں زغرب کے اسلامی مرکز میں پریدور کے رفیوجیوں سے حلفیہ بیانات قلم بند کرنے والی ٹیم کے ساتھ آیا تھا، کہنے لگا کہ اجتماعی قبروں سے مسخ شدہ لاشوں کے ٹکڑے نکالے جاتے، کبھی پورا جسم ایک ساتھ برآمد ہوتا، کبھی سر اور پیر کی ہڈیاں الگ ہوتیں۔ تفتیشی ٹیم انہیں ایک سفید کپڑے پر مکمل طور سے سجاتی، ہر لاش کو ایک نمبر دیا جاتا، اس طرح لاشوں کی گنتی کا کام آگے بڑھتا۔ اسی دوران جب ایک لاش چادر پر سجائی گئی تو میرے ماموں زاد بھائی پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ لاش کے پیروں میں جوتا ابھی موجود تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر پہچاننے کی کوشش کی، پنجہ تو اندر ہی رہ گیا۔ پنڈلیوں کی ہڈی اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ارے یہ تو شولر کا وہی جوتا ہے جو وہ اپنے والد کے لیے گراز سے لے کر آیا تھا۔ میرا بھائی اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتی ہوں مجھے اپنے زندہ بچ جانے پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر ایمان نے ایک جھرجھری سی لی اور اس کی نگاہیں چرچ کے عقب میں دور آسمانوں میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

پریدور کے اس حادثے کے وقت تم کہاں تھیں؟

تھی تو پریدور ہی میں، کاش کہ میں زندہ نہ بچتی، شاید انھوں نے مجھے نشانِ عبرت کے طور پر چھوڑ دیا۔ میں اور میری ایک بہن جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ایک رات چیتنک (سرب نیشنلسٹ) کے ہاتھوں گھر سے جبراً اٹھا لیے گئے۔ کہا گیا کہ ضروری تفتیش کے بعد ہمیں رہائی مل جائے گی۔ ہم ایک فوجی کیمپ میں لائے گئے جہاں خونخوار چیتنک دستے ہماری آبرو کے تعاقب میں تھے، میری بہن کو برابر والے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ میرے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کے بیان کی مجھ میں تاب نہیں۔ ان درندوں نے میرے منھ میں اس زور کا جھٹکا دیا کہ میرا دم گھٹنے لگا، میرا vocal chord مجروح ہو گیا۔ میں کئی دنوں تک آواز سے محروم رہی۔ یہ کہتے ہوئے اسے ایک اُبکائی سی آئی، اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ہائے میری بہن! اس کی چیخ و پکار کی آواز میں نے اس رات آخری بار سنی۔ چار پانچ دنوں کے بعد جب مجھے واپس گھر بھیجا گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ در و دیوار پر گولیوں کے نشانات تھے۔ کھڑکیاں اور دروازے نیم جلی ہوئی حالت میں ویرانی کا سماں پیش کر رہے تھے۔ نہ جانے اس سرب ڈرائیور کے دل میں کیا آیا کہ وہ مجھے ایک امدادی کیمپ میں چھوڑ آیا۔ کیا پتا میری بہن بھی ان ہی اجتماعی قبروں میں دفن ہو اور کیا پتا کہ میری ماں بھی۔ والد کے بارے میں تو سنا تھا کہ گولہ

باری کے دوران ہی محلے کے دوسرے مردوں کے ساتھ مارے گئے تھے۔

ایمان کے دردناک بیان نے مجلس پرغم واندوہ کا ماحول طاری کردیا تھا۔'ایمان! حوصلہ نہ ہارو'، لوسیہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ میں شرمندہ ہوں کہ یہ سرب نیشنلسٹ میرے ہم مذہب ہیں لیکن ان پر تو قومیت کا بھوت سوار تھا۔ انھوں نے ہم کروٹوں کو بھی کب برداشت کیا۔ آؤ پچھلی تلخ یادیں بھلا کر نئے مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ نفرت اور انتقام کی آگ میں جلنے کے بجائے انھیں معاف کردینا ہی بہتر ہے۔

'لیکن نئی ابتداء کیسے ہوسکتی ہے جب قاتل آج بھی ان شہروں میں کھلے عام دندناتے پھرتے ہوں، حکومت کی مشنری پر ان کا قبضہ ہو اور انھیں اپنی اس بربریت پر قطعی ندامت بھی نہ ہو'۔ ایمان نے لوسیہ کے نقطۂ نظر کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

ایمان تمہاری بات بالکل صحیح ہے۔ معاف کرنا کچھ آسان نہیں، خاص طور پر جب ظلم کی legacy مسلسل ہمارے تعاقب میں ہو، جب کسی کے باپ کا مسخ شدہ پاؤں جوتوں سمیت اس کے ہاتھ میں آجائے تو اس کے لیے ان مجرموں کو معاف کرنا کچھ آسان نہیں جنہوں نے تدفین کے بنیادی حق سے بھی اس کے باپ کو محروم رکھا ہو لیکن ایمان یہ جان لو کہ ہم ہمیشہ صرف اس لیے کسی کو معاف نہیں کرتے کہ ہم بے ضرر روحانی لوگ ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ہم ایک نئے مستقبل کی تعمیر کے لیے ان یادوں کے تعاقب سے بچنا چاہتے ہیں جو ہمارے مستقبل کی منصوبہ بندی پر روک لگادیں۔

حسن جو اب تک اس داستانِ غم کو بڑی توجہ سے سن رہا تھا اور جس کی آنکھوں میں بیک وقت شرارت اور ذہانت کے چراغ روشن تھے اور جس نے بظاہر اپنے آپ کو لڑکپن کی قبا میں چھپا رکھا تھا، کسی قدر بزرگوں والے بردبار اور سنجیدہ لہجہ میں بولا، ہمارا ماضی تو دشمنوں نے تباہ کرہی دیا۔ اب اگر ان تلخ یادوں سے مستقبل بھی کھوٹا ہوجائے تو یہ ہمارے دشمنوں کی فتح ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ

we cannot forget but certaintly we can forgive

اس نے اپنی بند مُٹھی ہلاتے ہوئے مقرروں کے سے انداز میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا۔ بولا اب ہمیں اپنے لیے نہیں جینا ہے بلکہ ان مظلوموں کے لیے جن کے لیے یہ دنیا جہنم بنادی گئی ہے تاکہ کل کوئی دوبارہ اس عذاب سے نہ گزرے۔'

حسن کی معصوم تقریر جاری تھی، اس دوران المینہ اپنے بھائی کی طرف تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتی

رہی۔حسن کی پرعزم گفتگو سے المینہ کے چہرے پر اطمینان اوراعتماد کی وہ کیفیت واپس آ گئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی رمق دیکھی جو اس دن اس کی تقریر کے دوران دکھائی دی تھی، وہی بہت کچھ کر گزرنے والا انداز،فضاؤں سے پیغام نشر کرنے والا لہجہ، بولی: ہماری کمزوری اور بے بسی ہی ہمارا ہتھیار ہے۔ ہمارے پاس اب کھونے کو کچھ بھی نہیں، بزدل تو وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں جان و مال لٹ جانے کا ڈر ہوتا ہے۔سربرنیکا کے بعد ایک اور سربرنیکا ہی تو ہوسکتا ہے، جولوگ ایک سربرنیکا کو جھیل سکتے ہیں ان کے عزم وحوصلہ کو کوئی اور سربرنیکا شکست نہیں دے سکتا۔تعذیب کی اس سے شدید کیفیت وجود میں نہیں لائی جاسکتی۔

المینہ کی گفتگو سے اس بات کا تو پہلے ہی اندازہ ہو چلا تھا کہ سربرنیکا کے پناہ گزیں کیمپ سے اس کا کوئی گہرا تعلق رہا ہے جہاں کوئی آٹھ ہزار مردوں کو سرب فوجیوں نے جرمن نازیوں کے سے انداز سے قتل کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد انسانوں کے اس قدر بہیمانہ اور منصوبہ بند قتل عام کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔جی تو چاہتا تھا کہ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے المینہ کی زبانی سربرنیکا میں پیش آنے والے بوسنیائی مسلمانوں کے غم واندوہ کا بیان سُنا جائے لیکن خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ ان باتوں کے ذکر سے اس پر مایوسی کی وہی کیفیت لوٹ آئے۔اور یہ سب کچھ آنسوؤں میں گم ہو جائے۔سو اس خیال سے میں نے اپنی گفتگو کو بعض عمومی سوالوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔

المینہ! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جولوگ عرصہ ہائے دراز سے اپنے تمام مذہبی اور ثقافتی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے ہوں حتیٰ کہ بین المذاہب شادیاں بھی ہوتی رہی ہوں وہاں سربوں کے دلوں میں اچانک مسلمانوں کے خلاف نفرت کا اس قدر شدید داعیہ آخر کیسے پیدا ہو گیا۔سرب نیشنلزم کے اس جارحانہ تیور کا آخر سبب کیا تھا؟

بولی: سابق یوگوسلاویہ میں سربوں، کروٹوں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو انگیز کر رکھا تھا۔ کمیونسٹ نظام جبر میں کھلی گفتگو کا کوئی موقع نہ تھا سو ہر قوم نے اپنی شناخت کو بچائے رکھنے اور اسے مسلسل صیقل کرنے کے لیے اپنے طور پر مختلف مذہبی حکایات اور تاریخی اساطیر کو کام پر لگائے رکھا۔ یہ سب کچھ چونکہ زیرِ زمین ہوتا رہا اس لیے ان تاریخی اساطیر پر کسی علمی، تحقیقی یا تجزیاتی محاکے کا کوئی موقع نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظام جبر کے رخصت ہوتے ہی زیرزمین از بر کرائی جانے والی تراشیدہ تاریخ اور گمراہ کن اساطیر منظر عام پر آ گئے۔ بوسنیائی شہروں پر سربوں کے حملوں کے دوران ان کی فوجوں اور مقامی سرب ملیشیا کی زبان پر ماؤنٹن ریتھ

(The Mountain Wreath) کے رجزیہ اشعار ہوتے۔

گویا ایک عرصے سے سرب قوم پرست اپنے بچوں کو مسلمانوں کے خلاف نفرت پر اُکسار ہے تھے؟

جی ہاں! ورنہ انیسویں صدی کے وسط میں لکھا جانے والا پٹروؤک نگوس کا یہ زہریلا رزمیہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں انھیں بوسنیائی مسلمانوں کے قتل عام پر کیوں اُکساتا۔

کیا پس منظر ہے اس نظم کا؟ میں نے تفصیل جاننے کی کوشش کی۔

بولی: یہ نظم ان سربوں کی مذمت میں ہے جنھوں نے ترکوں کے زیراثر اپنی اصل ملّی شناخت سے بغاوت کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔ یہ نظم انھیں سرب نیشنلزم کا غدار قرار دیتی ہے اور بوسنیائی مسلمانوں کو اس غداری کی سزا کے طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہے تا کہ دوبارہ سرب اپنی اصل قومی شناخت کے ساتھ دنیا میں سر اُٹھا کر جی سکیں۔

گویا جو لوگ مسلمانوں کی نسل کشی میں پیش پیش تھے وہ دراصل اس کام کو سربوں کے قومی فریضے کی حیثیت سے انجام دے رہے تھے۔

جی ہاں بالکل صحیح فرمایا آپ نے، سربوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ سابق یوگوسلاویہ میں 'ترکوں کی معنوی اور ناجائز اولاد' اپنی کوئی علیحدہ ریاست بنالے۔ وہ اسے اپنی قومی اور نسلی توہین کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ اب انھیں کون بتائے کہ پیٹروؤک نگوس کی نظم میں ترکوں کی مفروضہ بربریت اور سربوں کے جبراً مسلمان بنائے جانے کی باتیں دراصل ایک تراشیدہ کہانی تھی۔ یہ تاریخ نہیں بلکہ ایک تراشیدہ اسطورہ تھا جس نے سربوں کے دل ودماغ کو مسموم کر رکھا تھا۔

تو کیا مسلمانوں کو نفرت کی اس مہم کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا؟

شاید اس قدر نہیں کہ مسلمان اپنی شناخت کے تحفظ کی فکر میں تھے۔ نقشبندی اسلام نے دعا، درود اور اوراد و وظائف کو دین کا ماحصل باور کرا رکھا تھا۔ ہم جب درونِ خانہ کسی مکالمے کی پوزیشن ہی میں نہ تھے تو دوسری قوموں سے افہام وتفہیم کی بات کیسے سوچی جاسکتی تھی۔

'گویا مسلمان پڑوسیوں اور ہمسایوں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے میں ناکام رہے۔'

جی ہاں! کمیونسٹ ریاست میں اولاً اس کی اجازت نہ تھی۔ ثانیاً نقشبندی اسلام نے اوراد و وظائف اور رسومات کو جس طرح دین کے ماحصل کے طور پر پیش کیا تھا اس میں عام لوگوں کو اس بات کا خیال بھی نہ آتا

تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے اپنے ہم سایوں اور غیر مذاہب کے لوگوں کے تئیں بھی ہماری کوئی دینی اور دعوتی ذمہ داری ہے۔ جس طرح سرب اور کروٹ چرچ اپنے ہم قوموں تک اپنی سرگرمیوں کا دائرہ مرکوز رکھتے اسی طرح مسجدوں اور خانقاہوں کا دائرۂ عمل بھی صرف مسلمانوں تک محدود تھا۔ شروع میں جب سربوں کی طرف سے جارحیت کے واقعات پیش آئے تو ہمارے دانشور صورتِ حال کی واقعی سنگینی اور اس کے پس پردہ تاریخی محرکات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ یوں سمجھئے کہ طوفان نے ہمیں اچانک آ لیا۔ ہم مہذب دنیا سے بہت کچھ توقع لگائے بیٹھے تھے۔ یہ سب کچھ ایک دھوکہ ثابت ہوا۔ یقین جانیے یہ مہذب لوگ نہیں ہیں۔ یوروپی معاشرہ وحشیوں کا معاشرہ ہے ورنہ یہ لوگ مسلسل پانچ سالوں تک ایک منصوبہ بند طریقے سے اپنے ہی جیسے انسانوں کی نسل کشی کے مرتکب نہ ہوتے۔ کاش کہ بوسنیائی مسلمانوں پر یہ حقیقت روزِ اوّل سے منکشف ہوتی تو شاید ہمارا اتنا بُرا حال نہ ہوتا۔

اِلمینہ کا پُرسکون اور سنجیدہ لہجہ اب کسی قدر جھنجھلاہٹ میں بدل گیا تھا، بولی: ہمارے اکابرین آخر آخر تک ایک سراب میں جیتے رہے۔ سربرینکا کے پناہ گزیں کیمپ میں، جہاں میں خود بھی مقیم تھی، یہ غلط فہمی عام تھی کہ ہم لوگ اقوام متحدہ کی امن فوج کی محافظت میں ہیں۔ چالیس ہزار انسانوں کے اس انبوہِ عظیم پر سرب حملہ آور نہیں ہوں گے کہ دنیا دیکھ رہی ہے، ذرائع ابلاغ کی نگاہیں لگی ہیں۔ یہ ایک بڑا فریب تھا جس کے ہم شکار ہوئے۔ دنیا دیکھتی رہی اور ہماری لاشیں اُٹھتی رہیں۔ بہت سا وقت موہوم امداد کے انتظار میں ضائع ہوا۔

'لیکن مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا'، میں نے المینہ کے دانشورانہ ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔

بولی: اگر روزِ اول سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ ہمیں اپنی جنگ تن تنہا لڑنی ہے تو یقیناً ہماری اسٹریٹیجی مختلف ہوتی۔ سربرینکا کے کیمپ میں ہمیں بار بار یہ یقین دلایا جاتا رہا کہ اقوام متحدہ کی فوجیں ہماری حفاظت پر مامور ہیں۔ سرب حملہ آور شہر کی طرف مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے روز یہ امید دلائی جاتی کہ آج ناٹو کے ہوائی جہاز سربوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بمباری کریں گے۔ بہت کچھ انتظار کے بعد دو علامتی بم گرائے گئے جو سربوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے قطعاً ناکافی تھے۔ پھر جب سرب جنرل ملادِک اپنی فوجوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا تو اقوام متحدہ کے حفاظتی دستوں نے ہماری مدافعت میں ایک گولی چلائے بغیر ہمیں ان کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک بڑا دھوکہ تھا جس سے ہمارے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اس سے بڑا دھوکہ اس وقت

پیش آیا جب ملادِک نے ہمارے سرکردہ لوگوں کو مذاکرات کے لیے بلایا، ان سے اس شرط پر بحفاظت شہر بدر کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اپنے اسلحے سربوں کے حوالے کر دیں۔ کیمپ میں کچھ زیادہ اسلحہ نہ تھا لیکن چند بندوقیں بھی اس وقت بڑا سہارا معلوم ہوتی تھیں۔ میرے والد حب اس میٹنگ سے واپس آئے تو وہ بہت پریشان تھے۔ وہ کسی طرح اسلحہ حوالہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، عورتیں اور بچّے تو شہر سے باہر بھیج دیے گئے لیکن مردوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ مجھے آج بھی وہ منظر بھولا نہیں جاتا جب بس پر سوار ہوتے ہوئے میرے والد قطار سے الگ کر لیے گئے، یہ کہتے ہوئے المینہ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے اسکارف کے کونے سے آنسو خشک کیے، سنبھالا لینے کی کوشش کی، ایک آہِ سرد بھری، پھر بولی: انتظار میں بڑا وقت ضائع ہوا بلکہ امت ضائع ہوگئی۔ سربرینکا کے کیمپ میں شب و روز طرح طرح کی افواہیں اُڑتیں۔ بہت سے لوگ اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ دعائیں قبول کروانے کے فارمولے آزمائے جاتے۔ کوئی کہتا سُلوبُدَن ملاوچ وقت کا دجّال اعظم ہے۔ جس کے استیصال کے لیے عنقریب پردۂ غیب سے مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ مذہبی معاملات پر جتنی بحث سربرینکا کے کیمپ میں ہوتی اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد میں نے کہیں اور سُنی۔ ہر کوئی ایک معجزہ کا طلبگار تھا۔ ایک دن میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ ہم لوگوں کو یہ ساری سزا مسلمان ہونے کے سبب ہی مل رہی ہے نا۔ پھر خدا کو ہمارے اوپر ترس کیوں نہیں آتا، کیا وہ ہماری دادرسی کے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیج سکتا؟ والد میرے اس سوال پر خاموش رہے۔ کرب کی ایک لہر ان کے چہرے پر ہویدا ہوئی۔ میں سہم سی گئی، شاید میں نے انھیں دکھی کر دیا تھا۔ پھر کسی قدر تسلی آمیز مگر باحوصلہ لہجہ میں بولے، المینہ! ہمت نہ ہارو، خدا ضرور غیب سے کوئی انتظام کرے گا۔ دشمنوں نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ خدا نہ کرے کہ ہمارا ایمان بھی ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ یہ کہتے ہوئے والد روہانسے سے ہو گئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جنرل ملادِک نے مذاکرات کی میز پر ان سے برملا کہا تھا کہ لوگو تمہارا اللہ تمہاری مدد نہیں کر سکتا ہاں جنرل ملادک ضرور تمہاری مدد کر سکتا ہے بشرطیکہ تم اپنے اسلحے ہمارے حوالے کر دو۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے والد پہلے ہی سے اس نظری سوال سے نبرد آزما تھے۔ اگر مجھے ذرا بھی اس بات کا اندازہ ہوتا تو میں انہیں ہرگز زچ نہ کرتی۔

اِلمینہ کے سوالات نے ان ایام کی یاد تازہ کر دی تھی جب خدا مستقل میرے سوالات کی زد میں ہوتا۔ آج ان سوالات کی دھار کچھ زیادہ ہی تیز معلوم ہوئی۔ ایسا لگا جیسے ہماری صدیوں پرانی دانشوری مہر بہ

لب ہو، قیل وقال کے پُرانے انداز پُچھتے سوالوں کے جواب فراہم کرنے سے قاصر ہوں۔

کیا خدا نے واقعی اپنی وفاداری تبدیل کر لی ہے؟ کیا اس نے کسی اور قوم کو امتِ مختار کے منصب پر فائز کر دیا ہے؟ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ صرف مسلمان ہونے کی پاداش میں ڈھائی تین لاکھ لوگ جن میں معصوم بچے بھی تھے اور بے بس عورتیں بھی، ایک منصوبہ بند قتل عام کا نشانہ بنتے رہے اور خدا ان کی مدد کو نہیں آیا؟

تب اِلمینہ کے ایمان شکن سوالات نے مروجہ دینیاتی طرز فکر پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ آج پروفیسر وولف کی گفتگو ایک نیا چیلنج بن کر میرے سامنے آئی۔

عشاء کی نماز کے بعد دیر تک مصّلے پر بیٹھا ان ہی سوالات سے نبرد آزما رہا۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ خدا کے سلسلے میں میرا ذاتی تجربہ یکسر مختلف تھا۔ زندگی کے ہر نشیب وفراز کو خدا کی معیت میں جینے بلکہ سفر وحضر میں اسے اپنے ساتھ لیے پھرنے کا جو اعزاز حاصل رہا ہے سو میرے لیے خدا کی اس بے التفاتی پر یقین کرنا مشکل تھا۔ خدا اگر کسی توفیق زدہ انسان کی جھولی میں اپنی نصرت وحمایت کے چند سکّے ڈال دے تو وہ فرد تاریخ کے بہتے دھارے کا رخ موڑ دیتا ہے۔ اس کام کے لیے پیمبری لازم نہیں۔ سقراط سے لے کر مارکس تک اور زرتشت سے لے کر گاندھی تک اصلاحِ احوال کے لیے جو لوگ بھی وقتاً وقتاً اٹھتے رہے ہیں اگر ان کی توفیقِ فکر وعمل خدا کی نصرت وحمایت سے مملو نہ ہوتی تو اصلاح احوال کی یہ تمام کوششیں بار آور ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتیں۔ رہے انبیاء اور ان کے متبعین تو ان کا کام محض تاریخ کی نوک پلک کو درست کرنا نہیں بلکہ از سرِنو تاریخ رقم کرنے کا ہے۔ پھر اگر وہ خود اٹھ کھڑے ہوئے تو بھلا ان کی پیش قدمی کو کون روک پائے گا۔

بورل کے مختلف پروگراموں میں بحث ومباحثے کی میز پر اکثر یہ خیال آتا کہ ان مضطرب نفسوں کو جن کا تعلق مختلف اقوام وملل سے تھا اور جو ایک نئی انبساط انگیز دنیا کے متلاشی تھے شاید انھیں شدت سے کسی کی آمد کا انتظار ہو۔ بعضے کہتے کہ آخری ساعت کے آثار اب نمایاں ہونے کو ہیں، حق وباطل کے بیچ فیصلہ کن معرکہ آرائی کا وقت اب قریب آپہنچا ہے۔ آرمیگادون، مسیح کی آمد ثانی اور نہ جانے کیا کیا قیاس آرائیاں۔ ایسے میں المینہ کی معصومانہ جرح کہ خدا ہماری رہنمائی کے لیے اب کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجتا؟ کی یاد اکثر تازہ ہو جاتی۔

رات خاصی ڈھل چکی تھی لیکن دن بھر کی تھکان کے باوجود طبیعت سونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ایک ناآسودہ اضطراب تھا جو میرے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ اسی دوران کاسل کے مرکزی دالان سے

شور وشغب سنائی دیا۔ زندگی سے معمور قہقہوں کی آواز گونجی۔ غالباً شرکاء کا کوئی نیا قافلہ آپہنچا تھا۔ غیر ارادی طور پر شمع ہاتھ میں لیے نیچے آیا۔ قلعہ کے بیرونی دروازے پر کچھ لوگ اب بھی بس سے اتر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ پرسوں سے شروع ہونے والی آرٹ اور تجارت کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے شارکین کا کوئی قافلہ لندن سے آپہنچا تھا۔ لیکن ناکافی روشنی کے سبب آنے والوں کی صورت شکل پوری طرح ہویدا نہ تھی۔ چاندنی رات میں قندیلوں کی ہلکی روشنی میں بس اتنا لگتا تھا گویا یہ قدسی نفوس کسی اور دنیا سے آئے ہوں جن کے گرد رات کی چاندنی نے سرّیت اور تقدس کا ہالہ قائم کر رکھا ہو۔

چاندنی رات میں فطرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے مانوس پگڈنڈی پر چلتا ہوا قلعہ کے باہر نشیبی سڑک پر نکل آیا۔ باہر ایک ہُو کا عالم تھا۔ اس پراسرار سناٹے میں ہوا کے ارتعاش سے درختوں کے پتے جب کھڑکھڑاتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے فطرت کلام کر رہی ہو۔ ابھی کچھ دور ہی چلا تھا کہ سامنے پہاڑی کے عقب سے ایک پراسرار دیوہیکل انسانی ہیولا آتا دکھائی دیا۔ بارالہا یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ دیوہیکل شخص کون ہے اور اتنی بڑی ٹرالی کو چاندنی رات میں کیوں کھینچے چلا آتا ہے؟ اور ہاں اس کے شانوں کے اوپر تو کچھ بھی نہیں۔ کیا یہی وہ سرکٹا میراژ (Meras) تو نہیں جس کی بابت سلوینیا کی لوک کہانیوں میں یہ خیال عام ہے کہ ظالموں اور غاصبوں کی سرکٹی روحیں آدھی رات کے وقت مسروقہ مال لے کر ان کے مالکوں کو لوٹانے کے لیے نکل آتی ہیں اور پوچھتی پھرتی ہیں: اے مال کے اصل حقدارو! بتاؤ میں اسے کہاں چھوڑ جاؤں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس وقت ہمت جٹائے اور یہ کہہ دے کہ اسے وہیں پہنچا دو جہاں سے تم نے لیا تھا تو اس سرکٹی بدروح کو نجات مل جاتی ہے۔ میں نے اس کی طرف نگاہیں جمائیں، کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر متعینہ راستہ پر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ پہاڑی کے اگلے سرے پر چرچ کے ٹاور سے نکلنے والی برقی لیمپ کی روشنی نے ماحول کی پراسراریت کو کسی قدر لگام دے رکھی تھی۔ البتہ آگے جنگل کی خاموشی تھی بلند و بالا درخت اور اس کے بیچ ایک پختہ شاہراہ۔ ابھی گذشتہ شب یہاں پارسی فال کی آمد کا جشن بپا تھا، ڈرامے کی اساطیری فضا عہد وسطیٰ سے مملو تھی۔ آج ان درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا تھا کہ نہ جانے کب کس گوشے سے کوئی میراژ سامنے آجائے اور میرا راستہ روک لے۔ وہ پراسرار سرکٹا ہیولا جو نصف شب کو دشت و بیابان میں آج بھی آواز لگاتا ہے، یہ کس کا غصب شدہ مال ہے اور اسے کہاں لوٹاؤں؟ میں نے سوچا کاش کہ میں اپنے اندر اتنی ہمت پاتا اور اس سے پوچھتا کہ تم آخری امت کے وقار کو اس کے اصل حقداروں تک کیوں نہیں لوٹاتے؟

۹

بے منار کی مسجد

دوسرے دن یہی کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا، کاسل بورل کے شمالی مرغزار میں جہاں سے ایک مختصر راستہ پگڈنڈی کی شکل میں نیچے دریائے ڈراوا کو جاتا ہے اور جہاں کانفرنس کے بعض شارکین نے نشیبی حصّوں میں اپنے خیمے نصب کر رکھے تھے، ہم لوگ ایک درخت کے جھلملے سائے تلے پتھریلی بنچوں پر بیٹھے ہربل چائے کا لطف لے رہے تھے۔ بہت سے شارکین کے لئے آج کانفرنس کا آخری دن تھا۔ بعض شرکاء اگلی کانفرنس سے پہلے تازہ دم ہونے کا پلان بنا رہے تھے۔ علی کودرا آج کچھ خاموش سے تھے۔ پروفیسر پریووک کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ لبلیانہ چلوں جہاں وہ سلووینیائی مسلمانوں کی انجمن میں میری گفتگو رکھنا چاہتے تھے۔ کہنے لگے سلووینیا میں کوئی تیس ہزار مسلمان ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ یہاں اب تک باقاعدہ کوئی مسجد نہیں تھی۔ گذشتہ چالیس برسوں سے مسلمان مسجد کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے لیکن سخت عوامی مخالفت اور ردِعمل کے خوف سے یہ پروجیکٹ آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ اب بڑی مشکل سے افہام و تفہیم کی صورت نکلی ہے۔ بہت سے روشن خیال مقامی عیسائی باشندے مسجد کی حمایت میں پیش پیش ہیں۔ آپ کی آمد سے بین الملّی اتحاد کو تقویت پہنچے گی۔ ڈاکٹر پیا بھی پچھلے کئی دنوں سے سلووینیائی مفکر سلووک ژیژک کے ساتھ ایک ملاقات پر اصرار کر رہی تھیں۔

میں نے پروفیسر پریووک سے پوچھا کہ مسجد کے سلسلے میں اس قدر عوامی مخالفت کا آخر سبب کیا ہے؟ کیا واقعی سلووینیائی عوام مسلمانوں سے خائف ہیں؟

بولے: مسلمانوں سے نہیں، مسلمان تو ان کے درمیان عرصے سے رہتے آئے ہیں، عام گوشت پوست کے انسانوں سے انھیں ڈر نہیں لگتا۔ وہ ان علامتوں سے خائف ہیں جو انھیں ترکوں کے سیاسی غلبہ

(Turkish Dominance) کی یاد دلاتی ہیں۔آپ نے سُنا ہوگا ابھی چند سال پہلے سوئٹزرلینڈ میں مسجد کے مینار پر تنازع تھا۔مقامی آبادی بلند میناروں کو Islamic Dominance کی علامت سمجھتی ہے اس لیے اسے کھلے دل سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ پروفیسر پریووک ابھی مسئلہ پر روشنی ڈال ہی رہے تھے کہ یہ سلسلہ ایک بلند آہنگ نسوانی آواز کے سبب ٹوٹ گیا:

Howiye lads? What's the craic?

یہ مارلن وارنر تھیں ہمیشہ کی طرح شوخ وشنگ، زندگی سے بھرپور۔

آیئے تشریف لایئے How are you cutting? میں نے جواباً کہا۔ بات لبلیانہ میں مسجد کی تعمیر کی چل رہی تھی اور پروفیسر پریووک کا کہنا ہے کہ مقامی آبادی مسلمانوں سے نہیں بلکہ ان علامتوں سے خوف زدہ ہے جوانھیں مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی یاد دلاتی ہیں۔

جی ہاں میرا خیال تو یہی ہے کہ یہ سب علامتوں کا کھیل ہے۔ مذہب فی نفسہ یہاں زیر بحث ہے ہی نہیں۔مسلمان چرچ کے بلند و بالا ٹاور کو اپنے معاشرے میں اجنبی مداخلت کی علامت سمجھتے ہیں اور اسی طرح عیسائیوں پر یہ امر شاق گزرتا ہے کہ ان کے شہروں میں بلند و بالا میناروں سے پانچ وقت اذان کی آواز بلند ہو۔

پھر مسلمان بے میناروں والی مسجد کیوں نہیں بنا لیتے ؟ علی کودرا نے مسئلہ کے ممکنہ حل کی طرف اشارہ کیا۔

'اس طرح کی ایک عارضی مسجد تو ایک ویر ہاؤس میں پہلے سے ہی چل رہی ہے۔مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی طرزِ تعمیر کے مطابق ان کے پاس purposely built مسجد ہو' ، پروفیسر پریووک نے وضاحت کی۔

'کیا آپ کے خیال میں بغیر میناروں کے بھی کوئی مسجد بنائی جاسکتی ہے' ، انھوں نے مزید پوچھا۔

'جی ہاں! کیوں نہیں۔ بھلا میناروں کا اسلام سے کیا تعلق؟ یہ جسے ہم اسلامی طرزِ تعمیر کہتے ہیں اس کا بھی فی نفسہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے ارتقاء کا پتا دیتا ہے جس میں گذشتہ تہذیبوں کے بہترین اجزاء شامل کر لیے گئے ہیں۔ مدینہ میں رسول اللہ نے اپنی آمد کے بعد جو مسجد بنائی وہ قبّوں اور میناروں سے خالی تھی۔ رسول علامتوں کا بت نہیں بناتا بلکہ والہانہ عبودیت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ مختلف اقوام وملل کو ربّانیت کی لڑی میں پروتا ہے اسے یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ دوسری اقوام پر اپنے ہم

قوموں کے غلبہ کی علامتیں تراشئے، میں نے علی کودرا کی حمایت کی۔

'بات اصولی طور پر شاید صحیح ہو لیکن کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ اس طرح ایک سیکولر معاشرے میں مذاہب کا جاہ وحشم اور خدائی آواز کا تفوق جاتا رہے گا۔ عام عمارتوں اور معابد میں پھر کیا فرق رہ جائے گا؟' ڈاکٹر پیا نے مسئلہ کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔

'نہ رہے۔ جب خدا کو مسجدوں کے مینارے اور چرچ کے بل ٹاور (Bell Tower) مطلوب ہی نہیں تو پھر انھیں مذہب کی اساس قرار دے کر باہمی جھگڑوں کی بنیاد بنانے کا آخر کیا جواز ہے؟ مسجد کے مینارے دراصل ماذنہ کے طور پر وجود میں آئے تھے اور (Bell Tower) کی بلندی کا بھی جواز یہ تھا کہ دور تک گھنٹیوں کی آواز سنائی دے۔ اب فی زمانہ مائکروفون کی ایجاد کے بعد ان کی افادیت جاتی رہی۔ اب یہ محض علامتیں ہیں۔ خدائے واحد کی بزرگی کی علامت نہیں بلکہ اپنے اپنے قومی افتخار کی علامت۔ لیکن افسوس کہ انسانوں کی ایک قابل ذکر تعداد نے ان علامتوں کی تراش خراش بلکہ اس کی تقدیس وتکبیر کو ہی غایت عبودیت قرار دے ڈالا ہے۔' علی کودرا نے مزید وضاحت کی۔

'جی ہاں آپ صحیح کہتے ہیں، جوشِ عبودیت اور غلو بڑے مسائل پیدا کرتے ہیں، اب دیکھیے مذاہب کی تاریخ میں جتنی بھی علامتیں ہیں اور جنھیں مختلف قوموں نے اپنے اوپر اوڑھ رکھا ہے ان کا فی نفسہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں، عیسائیوں کی صلیب، یہودیوں کا menorah یا ستارۂ داؤدی، ہندوؤں کا سواستک یا اوم یا مسلمانوں کا ہلال، یہ سب تاریخ کے مختلف ادوار میں رفتہ رفتہ ملی علامتوں کے طور پر متعارف ہوئے'، پروفیسر پریووک نے تائیداً کہا۔

جی ہاں ایک بات بتاؤں؟ شاید آپ کی حیرت میں اضافہ ہو کہ مسلمان ہلال کی جس علامت کو آج صلیب کے مقابلے میں اپنا قومی شعار سمجھتے ہیں تاریخی طور پر یہ علامت ان کے دشمنوں کے استعمال میں رہی ہے۔ میرے اس انکشاف پر مارلن نے حیرت سے ہائیں کی آواز بلند کی اور پروفیسر پریووک سنبھل کر بیٹھ گئے۔

واقعی؟

'جی ہاں ماقبل اسلام کے مکہ میں چاند کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ قریش کے قومی جھنڈے پر چاند کا نشان ثبت تھا اس لیے جب اسلام کو کفارِ قریش کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی تو اس وقوعہ کا ذکر

قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا: اقتربت الساعة و انشق القمر ۔یعنی بالآخر وہ گھڑی قریب آ گئی اور چاند ٹوٹ گیا۔'

اچھا یہ پس منظر ہے اس آیت کا،علی کودرانے حیرت کا اظہار کیا۔ بولے: بات تو دل کو لگتی ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس آیت کے گرد دیو مالائی کہانیوں کی جو فصیل کھڑی کر دی ہے تو اب اس اہم واقعہ کی طرف بالکل ذہن نہیں جاتا۔

مارلن جواب تک اس گفتگو کو بڑی دلچسپی اور انہماک سے سن رہی تھی اور جو کبھی تائید میں سر ہلاتی اور کبھی تفکرات میں ڈوب جاتی، ایسا لگتا تھا جیسے کسی گہرے تحلیل و تجزیہ میں مصروف ہو۔

'جیّا ارسوائیل (Dia ar sabhail) خدا سلامت رکھے'، اس نے بالآخر مداخلت کی کوشش کی ۔ بولی: کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مذہبی علامتیں جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں ان کی مؤثر سرکوبی کی جا سکے۔کیا مذہبی دائرۂ فکر سے ان کا انخلاء ممکن ہے؟

'ہاں کیوں نہیں، دنیا میں ہر پیغمبر دراصل ان ہی تراشیدہ بتوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور سبھی نے قومی اور ملی افتخار کے بتوں کو پاش پاش کرنے اور خدا کے بندوں کو ربّانیت کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔لیکن یہ علامتیں بڑی سخت جان ہوتی ہیں ۔ نئے نئے ناموں اور نئے نئے حوالوں سے قومی اور مسلکی افتخار کے بت پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں ۔قرآن اس صورت حال کو شرک سے تعبیر کرتا ہے ۔اس کے نزدیک اہل ایمان کا فرقوں میں بٹ جانا شرک سے عبارت ہے ۔لیکن اس سخت وعید کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج خود کو دیندار مسلمانوں میں شمار کرنے والے لوگ بھی فرقوں میں منقسم ہیں ۔مسلمانوں میں شیعہ، سنّی کی فرقہ بندیاں اور پھر ان فرقوں میں دسیوں ذیلی فرقے ۔عیسائیت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے علاوہ بے شمار فرقوں کا ظہور بھی اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ فرقہ بندی اور دین کے نام پر جنگ و جدل اہل مذاہب کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لیے اس مسئلہ پر کھلے دل سے غور وفکر کی ضرورت ہے جبھی ہم مذہب کی اصل روح سے آگاہ ہوسکیں گے'۔میں نے روح عبودیت کو بین المذاہبی تناظر میں سمجھانے کی کوشش کی ۔

بولی: آپ کے ہاں تو مذہبی زندگی کی چہل پہل ابھی باقی ہے، مذہب انسانوں کی سماجی زندگی میں ایک عامل کے طور پر دخیل ہے اس لیے اگر مذہبی جھگڑے وقتاً فوقتاً معمول کی زندگی میں مزاحم ہوتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔البتہ ہمارے ہاں عیسائی معاشرے میں جہاں مذہب کا عنصر عام لوگوں کی زندگی سے

غائب ہوگیا ہے وہاں بھی مسلکی علامتیں ایک دوسرے سے مسلسل ٹکراتی رہتی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ مذہب محض ایک جذباتی سہارا ہو جسے دونوں فریق اپنے قومی افتخار کی جنگ میں علامت کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میری مراد ناردرن آئرلینڈ کی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک خانہ جنگیوں سے ہے جس پر صدیوں سے کوشش بسیار کے باوجود اب تک قابو نہیں پایا جاسکا ہے۔

'جی ہاں علامت جب علَم بن جائے تو قومی افتخار کے بت کو مسموم اور تراشیدہ تاریخ کا سہارا مل جاتا ہے۔اور ایک بار اگر قومیں اپنی تراشیدہ تاریخ کی اسیر بن گئیں تو پھر ان کا اپنے ہی تعمیر کردہ حصار سے باہر نکلنا سخت مشکل ہوجاتا ہے۔مگر آپ کے ہاں ناردرن آئرلینڈ میں تو سُنا ہے کہ پچھلے دنوں کسی مصالحتی فارمولے پر اتفاق ہوگیا ہے' علی کودرا نے جواب طلب نگاہوں سے مارلن کی طرف دیکھا۔

جی ہاں دس بارہ سال پہلے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے بیچ باضابطہ قیام امن کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے لیکن ہر سال ۱۲/جولائی کو اورینج مین (Orange Man) کے جلوس کے موقع پر پرانی دشمنیاں پھر سے زندہ ہوجاتی ہیں۔

اورینج مین؟ کیا یہ کوئی مذہبی فرقہ ہے؟

میرے اس سوال پر مارلن نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولی: ناردرن آئرلینڈ میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح ہے۔کوئی تین سو سال پہلے پروٹسٹنٹ حکمراں ولیم آف اورینج کے ہاتھوں آئرلینڈ کے کیتھولک بادشاہ کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس کے بعد آنے والے دنوں میں انگلینڈ کی پروٹسٹنٹ حکمرانی انگریزی استعمار کی علامت کے طور پر دیکھی جاتی رہی۔مقامی کیتھولک باشندوں نے پچھلے تین سو سالوں میں پروٹسٹنٹ جبر کے خاتمے کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔اس سے اتنا تو ہوا کہ ریپبلک آف آئرلینڈ کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت مل گئی لیکن ناردرن آئرلینڈ کا خطہ جہاں پروٹسٹنٹ آبادی کی ایک قابل ذکر تعداد رہتی ہے، آج بھی برطانیہ کے زیر تسلط ہے۔ ہر سال بارہ جولائی کو پروٹسٹنٹ آبادی ولیم آف اورینج کی تاریخی فتح کا جلوس نکالتی ہے۔ بڑا زبردست ہجوم ہوتا ہے۔سازندوں کی فوج اور ڈھول باجوں کے جلوس کے ساتھ نارنگی پٹیاں لگائے پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ جب اپنی فتح کا نعرہ لگاتے ہوئے کیتھولک علاقوں سے گزرتے ہیں تو کیتھولک آبادی کو ایسا لگتا ہے جیسے ان کے قومی وقار کی تذلیل کی جارہی ہو لہٰذا فسادات پھوٹ پڑتے ہیں۔

پھر حکومت اس قسم کے اشتعال انگیز جلوس پر پابندی کیوں نہیں عائد کر دیتی؟

کیسے کرے؟ برسہا برس سے جلوس کی یہ روایت قائم ہے۔ ماضی میں انگلینڈ کے پروٹسٹنٹ حکمراں اس قسم کے جلوس سے اپنی سیاسی قوت کی دھاک بٹھانے کا کام لیتے تھے۔ ان کے پیش نظر اس طرح مقامی کیتھولک آبادی کو ان کی بے بسی اور کمزوری کا یقین دلانا مقصود تھا۔ اب جلوس کی یہ روایت پروٹسٹنٹ فرقہ کی مذہبی شناخت کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے جس سے وہ کسی طور پر بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔

کیا کیتھولک آبادی بھی اس قسم کا کوئی جلوس نکالتی ہے؟ میں نے صورتحال کو جاننے کی کوشش کی۔

بولی: جی ہاں کیتھولک آبادی کے پاس بھی اپنے ہیروز ہیں۔ ہر سال ۱۷۹۸ء کی بغاوت کی یاد میں اس تحریک کے روح رواں تھیوبالڈ وولف ٹون کی قبر پر ریپبلکن کیتھولک اکابرین ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہیں۔ گویا یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ پروٹسٹنٹ حملہ آوروں کے خلاف تھیوبالڈ کی انقلابی تحریک آج بھی جاری ہے۔

ان مسلکی جلسوں کو عام لوگ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ناردرن آئرلینڈ کے منظر نامے میں میری اس قدر دلچسپی کو دیکھ کر وہ بولی: بس یہ سمجھو جیسے تمہارے ہاں مختلف مذہبی مواقع پر شیعہ سنّی فرقے ایک دوسرے سے مسلسل ٹکراتے رہتے ہیں یہاں بھی دونوں فرقوں کے پاس ایک دوسرے کے ذریعہ ڈھائے گئے مظالم کی تاریخ ہے جسے ہر فرقہ اپنے حق میں کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ فریق مخالف کے خلاف اس کے بغض وعناد اور فتنہ وفساد کو جواز ملتا رہے۔ پروٹسٹنٹ بچوں کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس میں ۱۷ویں صدی کے وسط میں مقامی کیتھولک آبادی کے ہاتھوں پروٹسٹنٹ آبادی پر ڈھائے جانے والے ظلم کا مبالغہ آمیز بیان ہوتا ہے۔ دوسری طرف کیتھولک اپنے بچوں کو یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح صدیوں سے انگلینڈ کے پروٹسٹنٹ حملہ آوروں نے آئرلینڈ کی گیلک تہذیب اور زبان و ادب کو تباہ کیا۔ کس طرح مقامی کیتھولک باشندوں سے ان کی زمینیں چھینی گئیں، لاکھوں لوگ فقر وفاقہ کا شکار ہوئے، ایک قابل ذکر تعداد اس صورتِ حال سے تنگ آکر امریکہ کو ہجرت کر گئی۔ آج بھی ناردرن آئرلینڈ پر برطانیہ کی حکمرانی آئرش قومیت کا تمسخر اُڑا رہی ہے۔ دونوں طرف تاریخ کی یہ دو مختلف تعبیریں دونوں فرقوں کو اس بات پر اُکساتی رہتی ہیں کہ وہ مستقبل کی فرقہ وارانہ جنگ کے لیے خود کو تیار رکھیں۔

پھر حکومت اپنے اسکولوں میں بچوں کو معتدل تاریخ کیوں نہیں پڑھاتی؟

کیسے پڑھائے؟ معاملہ یہ ہے کہ کیتھولک فرقہ کے اسکول الگ ہیں اور پرٹسٹنٹ فرقہ کے الگ۔مشترکہ اسکول کا ڈول ڈالا گیا ہے لیکن ان میں اب تک بچوں کی تعداد پانچ چھ فیصد سے زیادہ نہیں بڑھ پائی ہے۔کبھی موقع ہو تو بیلفاسٹ ہو آیئے، آپ کو حیرت ہوگی کہ یہاں ایک ہی شہر میں دونوں فرقے الگ الگ دنیا میں جیتے ہیں۔ان کے اسکول الگ، ان کی بائبل الگ، ان کے شراب خانے الگ۔حتیٰ کہ ان کی آبادیاں الگ الگ علاقوں میں رہتی ہیں۔ان کے باہمی جھگڑوں کو روکنے کے لیے بعض جگہوں پر ان دو آبادیوں کے بیچ دیوار بھی کھینچ دی گئی ہے جسے دیوارِامن کا نام دیا گیا ہے۔بالکل اسی طرح جیسے لبنان کے شہر تریپولی میں نہر ابوعلی کے ایک طرف شیعہ آبادی کا علاقہ ہے اور دوسری طرف سُنّی آبادی رہتی ہے۔البتہ بیلفاسٹ میں تریپولی کے مقابلے میں اور بھی بہت کچھ ہے جو دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف دن رات تشدد پر اکساتا رہتا ہے۔

وہ کیا؟

مارلن کی تقابلی گفتگو میں گو کہ میرے لیے ایک بڑا طنز پوشیدہ تھا لیکن میری دلچسپی اس بات میں تھی کہ ذرا دیکھوں تو سہی انگریزوں کے شیعہ، سُنّی آخر آپس میں کس طرح لڑتے جھگڑتے ہیں۔کہنے لگی، میں کینیڈا سے جب بھی ناردرن آئرلینڈ جاتی ہوں، بیلفاسٹ کے در و دیوار مجھ پر ایک عجیب تاثر مرتب کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے پروٹسٹنٹ حملہ آوروں کی تین سوسالہ پرانی تاریخ مجھے مسلسل انتقام لینے پر اُکساتی رہتی ہو۔شہر میں ہر طرف دونوں فرقوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اپنے مشاہیر کی یادگاریں قائم کر رکھی ہیں، در و دیوار مختلف قسم کی یادگار تصویروں (Maurals)، نعروں اور اقوال سے مزین ہیں۔مثال کے طور پر Falls Road جو کیتھولک علاقے میں واقع ہے یہاں آپ کو Bobby Sands کی تصویریں آویزاں دکھائی دیں گی جو ۱۹۸۱ء میں حالتِ اسیری میں بھوک ہڑتال کے سبب شہید ہوئے۔دوسری طرف پروٹسٹنٹ علاقے Shankhill Road پر یونینسٹ پروٹسٹنٹ ہیروز کی تصویریں آویزاں ملیں گی۔شہر میں جدھر جایئے تصویروں، یادگاروں اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت آمیز بیانات کا ایک لامتناہی سلسلہ ملے گا۔اور جس شہر میں مسموم تاریخ اس طرح زندہ نظر آئے وہاں عام آدمی کے لیے اس کے علاوہ اور کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ایک فریق کے ساتھ وابستہ کر لے۔

’تاریخ بڑا خطرناک اسلحہ ہے اسے اگر احتیاط کے ساتھ نہ برتا جائے تو یہ اکثر backfire کر دیتا

ہے۔ انسان تاریخ کے مسموم بیانات سے تلمیحات اور علامتوں میں جان ڈالتا ہے، انہیں اپنے مقاصد لیے استعمال کرتا ہے لیکن یہی علامتیں جب گزرتے وقتوں کے ساتھ زندہ روایت کا حصہ بن جاتی ہیں تو انسان کا ان پر اختیار نہیں رہ جاتا' علی کودرانے اپنی رائے ظاہر کی۔

مارلن کا بیان گو کہ ابھی جاری تھا، میں سوچ رہا تھا واقعی تاریخ کتنی خطرناک چیز ہے، تراشیدہ مسموم بیانات انسانی دل و دماغ کو کس قدر ماؤف کر دیتے ہیں۔ سرب نیشنلسٹ The Mountain Wreath کی تراشیدہ تاریخ کے زیر اثر انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ تاریخ کے گمراہ کن بیانات نے انھیں درندوں میں تبدیل کر دیا۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک تاریخ نویسی نے ناردرن آئرلینڈ کی سرزمین کو فرقہ وارانہ جنگ کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ مساعی امن کی ہر کوشش مسموم تاریخی بیانات کو لگام دینے سے قاصر ہے۔ ہم مسلمانوں کے ہاں شیعیوں اور سنّیوں کی باہمی تفرقہ بازیاں بھی تاریخ کے سہارے ہی زندہ ہیں--- وہ تاریخ جسے اب تحلیل و تجزیہ سے ماوراء سمجھا جاتا ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کی باہمی رقابتوں بلکہ منافرت اور جدال وقتال کی تمام بنیادی روایتیں جن میں حضرت عمر کو فاطمہ اور علی کے دشمن کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور جن کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے گویا رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی آپؐ کے قریب ترین اصحاب رُحماء بینھم کی صفت سے خالی ہو گئے تھے اور جس کے سبب آج تک مسلمان اپنے آپ کو ابوبکر وعلی کے کیمپ میں بٹا ہوا پاتے ہیں۔ یہ سارے تراشیدہ فسانے اور متحارب تاریخی بیانات بڑی حد تک سیاسی پروپگنڈوں کی پیداوار ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ گمراہ کن روایتیں مسلمانوں کی تقدیسی تاریخ میں ایک ایسا مقام حاصل کر چکی ہیں کہ اب انھیں تحلیل و تجزیہ کی میز پر لانا خلاف ایمان سمجھا جاتا ہے۔

مجلس سے رخصت ہوتے ہوئے علی کودرانے میرا شانہ تھپتھپایا، بولے: تراشیدہ تاریخ ریچھ کے کمبل کی طرح ہے۔ آپ اسے چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ آپ کو نہیں چھوڑتا۔

۱۰

تہذیبی حبس

کاسل کے صدر دروازے پر آج چہل پہل کچھ زیادہ تھی۔ قہوہ خانے سے متصل وسیع وعریض سبزہ زار پر دور تک گول چھتریوں والی میزیں سجی تھیں۔ الوداعی لنچ کے اس ہنگامے میں وہ نو واردان بھی شامل تھے جو کل سے شروع ہونے والی فنون وتجارت کی کانفرنس میں شرکت کے لیے آپہنچے تھے۔ قریب ہی ایئرپورٹ جانے کے لیے ایک بس منتظر تھی جہاں 'سی یو، بائی، ٹیک کیئر' کے ہنگاموں میں الوداعی مصافحوں اور معانقوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کھانے کی میز پر آج گفتگو میں وہ پہلی سی گرمجوشی نہ تھی۔ پروفیسر پریووک کچھ بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے۔ علی کودرا کسی خیال میں گم تھے۔ ایک نامحسوس حزن تھا جس نے ہر شئ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر پیا کسی نو وارد کو ساتھ لیے چلی آتی ہیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگیں: دیکھئے میں کتنی دور سے آپ کے دوست کو لائی ہوں۔'

بااااسم؟ ارے یہ تو باسم البنا ہیں' میرے منھ سے بیساختہ نکلا۔

باسم نے فرط محبت میں یا مولانا کی صدائے دلگیر بلند کی اور بغل گیر ہوگئے۔ بولے میرا پروگرام تو شام تک یہاں پہونچنے کا تھا لیکن ایئرپورٹ سے نکلتے ہی کانفرنس کی استقبالیہ میز کے قریب ڈاکٹر پیا سے ملاقات ہوگئی جو غالبًا کسی کو چھوڑنے کے لیے ایئرپورٹ گئی تھیں، سو ان کے ساتھ سیدھا چلا آیا۔ شام تک لبلیانہ یونیورسٹی کے بعض طلباء اور مقامی احباب بھی آجائیں گے۔

باسم کی آمد سے مجلس میں ایک نئی جان سی پڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کی گفتگو نے حزن کی اس کیفیت کو ختم کر دیا تھا جو کسی اجڑتی محفل کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔

باسم یوں تو ایک کامیاب تاجر ہیں لیکن آپ کی دلچسپی کا اصل میدان تجارت سے کہیں زیادہ امورِ

امت ہے۔ آپ مصر کے ان نوجوانوں میں ہیں جنھوں نے انتہائی قلیل مدت میں آئی ٹی انڈسٹری میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی، یوروپ اور امریکہ کے بازاروں تک رسائی حاصل کی البتہ تجارت کے اس پورے سفر میں وہ ایک مضطرب قلب کے ساتھ امت کی شیرازہ بندی کے لیے بھی سرگرم رہے۔

تو کیا آپ براہ راست قاہرہ سے تشریف لا رہے ہیں؟

پروفیسر پریووک جواب تک باسم سے خاصے متعارف ہو چکے تھے، نے غالباً گفتگو میں جان ڈالنے کے لیے اس رسمی سوال کا سہارا لیا۔

براہ راست تو نہیں، براہ لندن آیا ہوں۔

کیسی لگتی ہے دنیا قاہرہ سے؟ میرا مطلب ہے کہ قاہرہ والے دنیا کو کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ پروفیسر پریووک نے اپنے سوال کو صیقل کرنے کی کوشش کی۔

باسم جواب تک سوال کی تہہ تک پہنچ چکے تھے، بولے: بڑی دلچسپ بات پوچھی ہے آپ نے۔ بس یہ سمجھئے ایک خلا ہو مسلسل خلا۔ قاہرہ پر ہی کیا موقوف مشرق کے وہ تمام مراکز جنھیں کبھی عالمی دارالسلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے خواہ وہ مدینہ ہو یا دمشق، بغداد ہو یا قاہرہ، تہران ہو یا غرناطہ، دہلی ہو یا استنبول ان سبھی شہروں میں ایسا لگتا ہے جیسے زندگی حقیقی ڈسکورس سے خالی ہو۔ سرگرمیاں تو ہیں۔ لیکن اس احساس کے ساتھ کہ

نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

'واقعی؟' پروفیسر پریووک نے پہلو بدلا۔ 'مشرق میں اگر یہ احساس ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں، یہاں تو بلقان کے اس علاقے میں ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم تہذیب کے حاشیہ پر ہوں، زندگی کا رخ متعین کرنے میں ہمارا کوئی رول نہ ہو۔'

'لیکن یہ احساس تو ہم مشرق والوں کے لئے خاص ہے جو عرصہ سے تہذیب کے مرکز ثقل کی منتقلی پر ماتم کناں ہیں، جنھیں دنیا کا موجودہ منظرنامہ، طلوع و غروب کے زائچے، حتیٰ کہ معیاری وقت بھی یوروسینٹرک لگتا ہے۔'

بولے: یوروسینٹرک نہ کہو یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ اب تو دنیا کا وہی منظرنامہ مستند ہے جو Ninth Avenue سے نظر آتا ہے۔

Ninth Avenue? علی کودرا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

بولے: ایک زمانے میں سول اسٹین برگ (Saul Sternberg) کی ایک ڈرائنگ بھی تو بہت مشہور ہوئی تھی جس میں دنیامین ہیٹن سینٹرک (Manhattan centric) دکھائی گئی تھی۔نویں ایوینو پر رہنے والوں کو دریائے ہڈسن سے آگے کا سارا منظر نامہ دھندلا دکھائی دیتا ہے، ان کے نزدیک مہذب دنیا کی سرحدیں دریا کے اِس پار ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

'کودرا! آپ درست کہہ رہے ہیں۔مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور کیا دیکھ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟' دل و دماغ پر اگر تعصب کی دھند دبیز ہو جائے تو تہذیبیں نرگسیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔آفاقی کے بجائے مقامی تہذیبیں جنم لیتی ہیں جن کے مابین باہمی کشاکش اور چپقلش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر یہ صورتحال ایک طرح کی تہذیبی نابینگی (civilizatinal blindness) کو جنم دیتی ہے۔ پتہ نہیں پوسٹ ماڈرن لفظیات میں اس صورتحال کو کیا کہتے ہوں گے۔میں نے پروفیسر پریووک سے پوچھا۔

بولے: میرے خیال میں تہذیبی حبس کی اس کیفیت کا ابھی پوری طرح ادراک نہیں ہو پایا ہے۔ ہنٹنگٹن اور فوکویاما کی تحریریں خود اسی تہذیبی حبس کی پیداوار ہیں جو یہ نہیں بتاتیں کہ مقامی نوعیت کی یوروپی اور امریکی ثقافتیں خود کو مکمل تہذیب سمجھنے کی غلط فہمی میں کیوں کر مبتلا ہو گئیں۔

'میرے خیال میں مسئلہ کا تہذیبی سے کہیں زیادہ تجارتی پہلو بھی ہے'۔کودرا نے مداخلت کی۔

بولے: مغرب کے شعر و نغمہ، فلم و موسیقی حتیٰ کہ اکل و شرب کے ذوق کو بھی جس طرح اشیائے تجارت کی حیثیت سے پوری دنیا میں ایکسپورٹ کرنے کی کوشش کی گئی، اس کا بھی بڑا رول ہے شرق و غرب کے اس تصادم کو جنم دینے میں۔یہ جو ہم ثقافت کی یک رنگی اور برگر کنگ اور میک ڈولنڈ کی بدمزگی سے عاجز ہیں اس کا سبب بھی تو یہی ہے کہ ہم نامحسوس طور پر اپنے لاشعور میں اس تہذیبی حملہ پر غضبناک ہیں۔ابتداء میں تو اکل و شرب کے امریکی عادات واطوار اور شعر و نغمہ کے ہاؤ ہو پر ایک جشن کا گمان ہوتا تھا لیکن اب اہل مشرق کو ایسا لگتا ہے جیسے فاسٹ فوڈ کے یہ ریسٹوراں استعمار کی علامتیں ہوں۔اس صورتحال نے مشرق و مغرب کی چپقلش کو دھماکہ خیز بنا دیا ہے۔

باسم جو اب تک خاموشی سے یہ باتیں سن رہے تھے، علی کودرا کے اس تجزیے پر پھڑک اٹھے۔

بولے: جی ہاں! ایک اضطراب تو ہے۔قاہرہ میں ہوں یا دمشق میں، بغداد میں ہوں یا تہران میں ہر جگہ اہل نظر

کی مجلسوں میں ایک سراسیمگی سی پائی جاتی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ بہت جلد کچھ ہونے والا ہے۔

'کیا لگتا ہے آپ کو عالم عرب میں کوئی بڑا دھماکہ ہونے کو ہے'؟۔ علی کو درانے باسم کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔

جی ہاں! لگتا تو ہے۔ آج کل بلاد عرب میں جس انداز کی چیزیں لکھی جا رہی ہیں اور آثار و روایات سے انھیں جس طرح منزّہ کیا جا رہا ہے تو اسے یکسر نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں۔

سعید ایوب کو تو آپ جانتے ہوں گے؟ جن کی کتاب المسیح الدجال جو غالباً پہلی مرتبہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی تھی، ایسا لگتا ہے کہ اب کی ان پیشن گوئیوں کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے۔

'عجیب! تو گویا اس بخار میں عالم عرب بھی مبتلا ہے'؟ پروفیسر پریووک نے حیرت اور دلچسپی سے پوچھا۔

جی ہاں! ہمارے یہاں تو اس خیال کی مذہبی بنیاد بھی ہے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے علاوہ دجّال کا اقتدار پوری دنیا پر قائم ہو جائے گا۔

تو کیا آپ کے ہاں بھی واقعات کی ترتیب وہی ہے جس کا بیان عیسائی مبلغین اکثر کرتے رہتے ہیں؟ کیا عالم اسلام کو بھی مسیح کی آمد ثانی کا شدت سے انتظار ہے؟ پروفیسر پریووک نے تخصیص کے ساتھ جاننا چاہا۔

جی ہاں! دمشق میں سفید منارے پر بادلوں کے درمیان مسیح کے نزول کا تذکرہ تو ہماری کتابوں میں پہلے سے ہی لکھا چلا آتا ہے البتہ سعید ایوب نے پہلی مرتبہ عیسائی اور مسلم مآخذ کے مابین کچھ اس طرح تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مستقبل کا پورا منظر نامہ بڑی باریک بینی کے ساتھ سامنے آ گیا ہے۔ سعید کے مطابق دجّال ایک فرد بھی ہے اور تہذیب بھی جس کی چھاپ یوروپی عیسائی تاریخ کے ہر مرحلے میں نظر آتی ہے۔ یوروپ میں عیسائیت کا فروغ، صلیبی جنگیں، صنعتی انقلاب، تحریک تنویر اور دو بڑی عالمی جنگیں اور اس کے بعد خلیج کی جنگوں کا سلسلہ یہ سب کچھ دراصل دجّالی اسکیم کی پے بہ پے کامیابی کا بولتا ثبوت ہے۔ بڑا منظّم ہے یہ دجّالی مکر و فریب Free Masons, Mormons, Jehovah's Witnesses اور ان جیسے نہ جانے کتنے ادارے اور تحریکیں دجّالی نظام کے لیے شب و روز سرگرم ہیں'

مگر ان باتوں کی علمی بنیاد کیا ہے؟ پروفیسر پریووک نے اعتراض وارد کیا۔

'ان باتوں کی تصدیق بائبل کی کتب Ezekiel, Danial, Revelation اور Isaiah سے حرف بہ حرف ہوتی ہے، اور اگر سعید کی تعبیر درست ہے تو کتاب Revelation میں New Jerusalem سے مراد کعبہ ہے جہاں زندگی کا سرچشمہ River of Life زمزم کی شکل میں آج بھی جاری ہے اور کیا عجب کہ مسیح کی آمد ثانی بھی محض ایک استعارہ ہو کہ اگر ایک نئے یروشلم سے مکہ کی طرف اشارہ مقصود ہے تو مسیح کی آمد ثانی کو ظہور محمدیؐ یا دین محمدیؐ کے غلبہ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

'عجیب!' پروفیسر پریووک نے سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔ یہ باتیں میرے لیے نئی ہیں۔ کیا محمدؐ کی آمد ثانی کا بھی کوئی عقیدہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے؟ پروفیسر پریووک نے مجھ سے تصدیق چاہی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا باسم نے خود ہی وضاحت کر دی۔ بولے: 'نہیں یہ مسلمانوں کا عقیدہ نہیں، یہ تو بس سعید ایوب کا گمان ہے جس کی وجہ سے ان پر بڑی لے دے بھی ہوئی۔ گو کہ وہ اس تعبیر کو محض اپنا خیال کہتے ہیں لیکن مآخذ و آثار پر جیسی کہ ان کی نظر ہے اور تورات وانجیل اور اس کے متعلقات کا جتنا کچھ انھیں علم ہے تو ان کی باتوں کو یکسر خارج بھی نہیں کیا جا سکتا اور حالات بھی تو اسی سمت بڑھ رہے ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ امام مہدی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ایک صاحب ہیں میرے ہی ہم نام باسم جرار، حماس کے معروف لیڈر ہیں، ان کی کتاب زوال اسرائیل ۲۰۲۲ء جب سے منظر عام پر آئی ہے ایسا لگتا ہے جیسے ایک خدائی اسکیم کے تحت دجالی تہذیب اپنے عبرت ناک انجام کی طرف بڑھ رہی ہو'۔

'باسم جرار؟' کودرا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اسطورہ ہے یہ سب کچھ اسطورہ، کودرا نے کسی قدر فیصلہ کن انداز میں زور دیتے ہوئے کہا۔

'مگر واقعات جس طرح پیش آ رہے ہیں اس کی صداقت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں'۔ باسم نے اپنے ہم نام مفکر کی مدافعت کی کوشش کی۔ بولے: جرار کا کہنا ہے کہ ریاست اسرائیل صرف ۷۶ سال (قمری) قائم رہ پائے گی۔ یہ مدت انیس سال کے چار ادوار پر مشتمل ہوگی۔ ۳۶واں سال اس کے عروج کا منتہیٰ ہوگا اور پھر اس کے بعد ریاست کا زوال شروع ہو جائے گا۔ اور بالآخر ۲۰۲۲ء میں اسرائیلی ریاست تحلیل ہو جائے گی۔

'قصہ کہانیاں ہیں یہ باتیں، میرے بھائی!' کودرا کے لہجے میں اچانک نرمی سی آ گئی۔ بولے: جن انجیلی مآخذ اور فارق العقل عیسائی تعبیرات کو مسلمان علماء نے کبھی لائق اعتنا نہ سمجھا، آج ان رطب و یابس کی بنا پر

مستقبل بینی کی کوشش ہمیں ایک نئے نظریاتی دھندلکے سے دوچار کردے گی'۔

'مگر اس قسم کی باتیں تو ہماری کتبِ آثار میں بھی پائی جاتی ہیں، ہمارے تراث کا حصہ سمجھی جاتی ہیں'، باسم نے اپنی باتوں میں علمی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

'تراث؟ بہت برمحل لفظ استعمال کیا ہے آپ نے۔ دین کی بنیاد تراث پر نہیں بلکہ وحی پر ہوتی ہے۔ تراث تو کسی قوم کا اجتماعی خزینہ ہوتا ہے جہاں مختلف مآخذ سے، دنیا جہان کی چیزیں ہمارے اجتماعی شعور میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں علم وحکمت کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور الّم غلّم قسم کے رطب و یابس بھی۔ اہلِ علم کا کام ہمیں ان رطب و یابس پر مطلع کرنا ہے۔

پھر ہمارے اہلِ علم یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ باسم نے کسی قدر زچ ہوتے ہوئے کہا۔

'جی...... بھئی اہلِ علم کو الزام دینا درست نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض باتیں امانی کے قبیل کی ہوتی ہیں جن کی زوال زدہ قومیں خوگر ہو جاتی ہیں، وہ انہیں ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ ورنہ ابن حزم سے لے کر ابن خلدون تک ہمارے کبار محققین نے آمدِ مہدی و مسیح کے عقیدے کی سخت نکیر کی ہے'۔

'اور دور کیوں جایئے ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے اساطیری طرزِ فکر کے سخت مخالف تھے۔ مفتی محمود شلتوت، عبید اللہ سندھی، ابوالکلام آزاد جیسے اصحابِ فکر نے اس خیال کا شدت سے ابطال کیا ہے'۔

'اور محمد اقبال کا بھی تو ایک مشہور شعر ہے

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ   اب انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

میں نے شعرِ اقبال کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔

'اقبال لاہوری! عبقری تھا عبقری' علی کودرا نے اس جوش سے اقبال کا نام لیا جیسے انہیں سند مل گئی ہو۔ بولے: شاید آپ کو یاد ہو کہ خلیج کی جنگ میں جب صدام حسین کے مقابلے میں اتحادی افواج خلیج میں اتر آئی تھیں اس وقت عربی اخبارات میں ایک نامانوس سی حدیث شائع ہوتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب سفید فام (بنوالاسفر) اور عیسائی اقوام (روم) مصر کے ساتھ مل کر صادم (صدام) نام کے ایک شخص کے مقابلے پر آئیں گی۔ ان میں سے کوئی بھی واپس نہ جا پائے گا۔ ان دنوں اس روایت کی اشاعت سے اساطیری طرزِ فکر میں خاصا ابال آ گیا تھا۔ آج بھی عرب مسلم دانشوری وہیں کھڑی

ہے' یہ کہتے ہوئے کودرا کے لہجے کا کرب نمایاں ہوگیا۔

کہنے لگے ہم آج بھی ایک اساطیری طرزِ فکر کے خوگر ہیں۔ اور یہ معاملہ ہما شما کا نہیں، ہمارے مفکرین کا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کودرا ایک لمحہ کے لیے رکے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہے ہوں۔ پھر کسی قدر توقف کے بعد بولے: آپ کو شاید حیرت ہوگی کہ ۱۹۹۳ء میں جب معاہدۂ اوسلو کے نتیجے میں غزہ اور جریکو (اریحہ) پر مشتمل ایک نئی فلسطینی ریاست کے قیام کا امکان پیدا ہوا تو اساطیری مفکرین کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ اس وقت بھی انھوں نے اپنے طرز فکر کی درستگی کے بجائے اساطیری گنبد میں پناہ لینے میں عافیت جانی۔ اريحة: المدينة الملعونة کے مصنف محمد عزت عارف نے نئی فلسطینی ریاست کے قیام کو بھی دجالی اسکیم کا حصہ قرار دیا، جو بقول ان کے، فلسطینیوں کو اس لیے دیا جارہا تھا کہ وہ ایک ملعون جگہ ہے جسے دوبارہ آباد کرنے والوں پر Joshua 6:26 میں خدا کی لعنت آئی ہے'۔

'عجیب!' میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

بولے: 'جی ہاں! شاید آپ کو حیرت ہو، یار لوگوں نے تو فلسطینی انتفاضہ کا ذکر بھی بائبل کے صفحات میں ڈھونڈ نکالا جو بقول ان حضرات کے Isaiah 8:18 میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ Jeremiah 50:2 میں تو بقول شخصے امریکی صدر بل کلنٹن کا تذکرہ بھی ڈھونڈھ نکالا گیا۔ کہا گیا کہ I will punish Bel in Babylon میں Bel سے مراد بل کلنٹن اور Babylon سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ دل و دماغ پر جب اساطیر کی دھند گہری ہوجائے تو ہر طرف وہی کچھ نظر آتا ہے جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں، وہی کچھ سنائی دیتا ہے جس کے لیے آپ کے کان آمادہ ہوں'۔ کودرا نے مفتیانہ انداز سے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ کسی قدر بیزاری اور خفگی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے ان باتوں سے تنگ آگئے ہوں، اپنا تھیلا کندھے سے لٹکایا اور قیام گاہ کی جانب چل دیے۔

میں نے سوچا باسم ایک دردمند اور مضطرب مسلمان ہیں، کودرا کی بے لاگ باتوں سے بجھ نہ جائیں سو میں نے ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا باسم! پانی بہت گہرا ہے اور یہ کودرا آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز بھی نہیں۔

پروفیسر پریووک شاید یہ چاہتے تھے کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ اور دراز ہو لیکن ائیرپورٹ جانے والی بس اب متحرک ہوا چاہتی تھی سو ہم لوگ بچھڑتے شارکین سے الوداعی سلام کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

۱۱

طفلانہ مسکراہٹ

آج شام کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ سوچا کیوں نہ اگلی گفتگو کے لیے کچھ نکات مرتب کرلوں۔ بعض ضروری کاغذات سمیٹے متعلقہ نوٹس کو فولڈر میں رکھا اور پائیں باغ کی جانب چل پڑا۔ آج پائیں باغ میں مکمل سناٹا تھا۔ ڈھلتی دھوپ میں پہاڑی کی چوٹی سے دریائے ڈراوا کا منظر بڑا دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ دور افق پر سیاہ بادلوں کے قلب، ایسا لگتا تھا، سنہری شعاعوں سے منور ہو گئے ہوں اور اس پر مستزاد تنہائی، سناٹا اور مکمل خاموشی۔ میں پائیں باغ سے اتر کر اس عمودی ٹیلہ پر آ بیٹھا جہاں بیٹھ کر دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ آنے کا احساس ہوتا ہے۔ بالکل unplugged ہو جانے کا اتنا مکمل تجربہ مجھے یا تو کبھی فن لینڈ کے جزیرہ ماری ہام کے آرکی پلیگو کی سیر کرتے ہوئے ہوا یا آج بورل میں، جہاں ایسا لگتا تھا، جیسے رواں دواں، رقصاں و گرداں سیارۂ زمین سے چپکے سے نیچے اتر آئے ہوں۔ آگے پیچھے، شمال جنوب، اوپر نیچے ہر جانب سے مہیب اور پراسرار فطرت نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا ہو۔ گاہے پرندوں کی چہچہاہٹ سے ماحول میں صوتی ارتعاش پیدا ہوتا لیکن یہ آوازیں مخل ہونے کے بجائے، ایسا لگتا تھا، جیسے بیک گراؤنڈ سمفنی میں ڈھل گئی ہوں۔ میں اس منظر نامے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کچھ ایسا کھویا کہ فائل کھلنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ حظ کی ایک ناقابل بیان لہر میرے قلب و نظر سے مس کرتی ہوئی گزر جاتی، ایسا لگتا جیسے میں خود بھی اسی منظر نامے کا حصہ ہوں۔ جیسے خدا کی کائنات کا یہ حصہ، پہاڑی کی اس چوٹی سے دریائے ڈراوا کے افق کا یہ منظر نامہ، میرے بغیر ہر روز نامکمل رہتا ہوگا۔

میں نہ جانے کب تک اسی طرح مبہوت رہتا کہ اچانک ایک مانوس نسوانی آواز نے ارتکاز نفس کے اس سلسلے کو درہم برہم کر دیا۔

'بہت خوب! تو آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں'۔ یہ مارلن کی آواز تھی۔ بولی: میں آپ کو دیر سے تلاش کر رہی ہوں، آپ کے دوستوں کو کیفے ٹیریا میں بٹھا آئی ہوں۔

میں نے فولڈر اٹھایا، احتیاط سے ناہموار پتھروں کو عبور کرتا ہوا پائیں باغ میں واپس آیا، ایسا لگتا تھا جیسے اچانک کسی نے مجھے ماخذ ہیبت وجبروت سے منقطع کر دیا ہو۔ ایک بار پھر مڑ کر افق پر نگاہ ڈالی۔ ایک طلسم تھا جس کی ہیبت اور سریت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ واپس آتے ہوئے مسرت اور طمانیت کی ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا، انگ انگ توانائی سے معمور، پیر زمین پر پڑتے نہ تھے۔ ایک بے خودی کا عالم، جی چاہتا تھا پہروں اچھلتا رہوں۔

کیفے ٹیریا کے بیرونی حصے میں گول چھتریوں والی میزیں ابھی تک آویزاں تھیں۔ باسم جو دو تین نوجوانوں کے ساتھ محو گفتگو تھے فرط محبت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے: ان سے ملیے، یہ میرے عزیز ہیں یاسر۔ آپ لُبلیانہ یونیورسٹی میں مینجمنٹ کے طالب علم ہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ اور آپ ہیں عبدالحمید۔

'جی میرا تعلق کشمیر سے ہے، میں یہاں ایکسچینج پروگرام کے تحت آیا ہوں'۔ ایک الجھے بالوں والے خوبرو نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

'اور میرا نام محمد فالح ہے کوسووو کا رہنے والا ہوں'۔

تو کیا آپ حضرات اس کانفرنس میں باضابطہ شرکت کے ارادے سے آئے ہیں؟

'جی ہاں! ہمارے شعبہ سے بہت سے طلباء و اساتذہ، بلکہ آرٹ اور موسیقی سے بھی خاصے لوگوں کی شرکت متوقع ہے۔ ہمارے دوست محمد فالح یہ بنیادی طور پر آرٹسٹ ہیں'۔

'بہت خوب'! میں نے محمد فالح کی طرف تحسیناً دیکھتے ہوئے کہا۔

'کیا بناتے ہیں آپ اپنی پینٹنگ میں'؟ میں نے ان کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ان کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ بولے: 'مسکراہٹ'۔

جی کیا مطلب؟ میں نے مزید کریدنے کی کوشش کی۔ کہنے لگے: 'پچھلے چھ سات سالوں سے میں ایک ایسا چہرہ پینٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس پر فطری اور بے ساختہ مسکراہٹ پائی جاتی ہو لیکن اب تک اس ہدف میں کامیابی نہیں ملی۔ حالانکہ جن لوگوں نے میری پینٹنگ دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ میری تصویریں

مسکراتی ہیں لیکن مجھے ہر تصویر کی تکمیل پر ایسا لگتا ہے جیسے ایک بے ساختہ فطری مسکراہٹ میری گرفت میں بس آتے آتے رہ گئی ہو'۔

آخر کیا وجہ ہے آپ کی اس تشنگی کی، کبھی آپ نے تجزیہ کرنے کی کوشش کی؟

بولے: 'مسکراہٹ میں جب تک وارفتگی نہ ہو، قلب و نظر سے اس کے سُوتے نہ پھوٹتے ہوں، اس پر سیلز گرل کی مصنوعی مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے۔

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دن آپ کا برش حقیقی مسکراہٹ کو گرفت میں لے آئے گا؟

'شاید نہیں'۔ فالح کے اس غیر متوقع جواب سے میں چونکا۔

'پھر آپ اس ہدف کو ترک کیوں نہیں کر دیتے'؟

بولے: 'ممکن نہیں۔ شاید پھر میں زندہ نہ رہ سکوں'۔

فالح کے اس جواب سے میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ شاید میرے بڑھتے استعجاب کو بھانپ گئے تھے۔ بولے: میرے لیے مسکراہٹوں کی پینٹنگ بنانا تفننِ طبع کے سبب نہیں بلکہ حیات و زیست کا مسئلہ ہے، معنویت کی تلاش کی ایک موہوم سی کوشش ہے۔ جو لوگ حقیقی مسکراہٹوں سے محروم کر دیے جاتے ہیں ان کے لیے اس کے علاوہ اور کیا راستہ بچتا ہے کہ وہ قرطاس و قلم کی مدد سے مسکراہٹوں سے اپنا تعلق قائم رکھیں۔ یہ کہتے ہوئے فالح کچھ آبدیدہ سے ہو گئے۔ چند ثانیے توقف اختیار کیا، دور فضا میں دیکھتے رہے، جیسے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

پھر بولے: جو لوگ حقیقی مسکراہٹ کا تجربہ نہیں کر سکتے وہ بھلا اسے پینٹ کیسے کر سکتے ہیں، یہ کہتے ہوئے فالح کی آواز بھرّا گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مزید کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کسی وجہ سے احساس و بیان پر بند باندھ کر بیٹھ گئے ہوں۔

مغرب کا وقت ہو چلا تھا یاسر جواب تک صورتحال کی نزاکت بھانپ چکے تھے، گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولے: 'کیوں نہ یہیں سبزہ زار پر نماز پڑھ لی جائے'۔ عبدالحمید اپنی کار سے ایک سرخ رنگ کی مخملی چادر نکال لائے۔ بورل کی سرزمین پر بڑے دنوں بعد کھلے آسمان کے نیچے باجماعت نماز پڑھتے ہوئے ذہن بار بار پارسی فال کے اسطورہ سے الجھتا رہا۔ کسے معلوم تھا کہ ہزار سال بعد صلیبی مجاہد کے اس قلعہ میں ایک دن اذان کی آواز گونجے گی۔

فالح ابھی سنتوں کی ادائیگی میں مصروف تھے۔انھیں اس طرح غرق عبادت دیکھ کران پر بے پناہ پیار آیا۔ بلقان کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری ہے اس نے ان کے اندرون کو ہمیشہ ہمیش کے لیے کچھ اس طرح مجروح کر دیا ہے کہ ان کے لیے شاید اب کبھی بھی ایک فطری اور بے ساختہ مسکراہٹ کا حصول ممکن نہ ہو۔ کم از کم اس جنریشن کے لیے تو نہیں۔ میرے ذہن میں اس طفل شیر خوار کی تصویر ابھر آئی جو سر برنیکا کے قتل عام کے بعد اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ پدرانہ ہاتھوں کے درمیان ایک مردہ طفل معصوم کا چہرہ جس کے چہرے پر ایک ایسی پراسرار مسکراہٹ طاری تھی جسے دیکھ کر اچھے اچھے شیر دل لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ یہ طفلانہ مسکراہٹ اجتماعی قبروں کی کھدائی سے برآمد ہوئی تھی۔ میں نے سوچا فالح سچ ہی کہتے ہیں جب تک اس امت کو دنیا کے مختلف خطوں میں ہر لمحہ ایک نیا سر بر ینکا درپیش ہے اس کے فرزندوں کے لبوں پر حقیقی مسکراہٹ کیسے واپس آ سکتی ہے ۔لیکن معاملہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ بقول کودرا مسلمانوں کے اندرون میں کوئی بنیادی نوعیت کی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بائی پولر، اسپلٹ پرسنالیٹی، ملٹی پولر فرقہ بندیاں، یہ سب نفسیاتی یا ذہنی امراض نہیں بلکہ نظری تشتت کی علامتیں ہیں۔ گویا ہمارے ملی وجود کو داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر ایک سر بر ینکا درپیش ہے۔ باہر کے سر بر ینکا پر تو ہم مطلع ہو جاتے ہیں لیکن اندر کے سر بر ینکا کا ہم میں سے اکثر ادراک بھی نہیں کر پاتے۔

۱۲

سامری کا بچھڑا

نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ کاسل کے بیرونی دالان میں پہنچے جہاں سے ایک مختصر سی تنگ راہداری چیپل (chapel) کو جاتی تھی۔ اندر پرانی طرز کی لالٹینوں میں برقی شمعیں روشن تھیں۔ پروفیسر پریووک اور علی کودرا وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ چیپل کیا تھا ایک پورا طلسم خانہ تھا۔ لالٹینوں سے نکلنے والی روشنی ماحول کو روشن کرنے کے بجائے اسے کہیں زیادہ پراسرار بنا رہی تھی۔ درودیوار کی سجاوٹ اور جا بجا اساطیری انداز کی ایستادہ گھنٹیاں، زائچے، نقوش، مختلف رنگوں کی تسبیحیں اور نہ جانے کیا کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم لوگ اہرام مصر کے کسی تہہ خانے میں اتر آئے ہوں یا اصحاب کہف کی قبیل کا کوئی غار ہو جہاں مدت سے کوئی تبدیلی نہ آئی ہو۔ جہاں وقت تھم کر رہ گیا ہو۔ آنکھیں ذرا مانوس ہوئیں تو پتا چلا کہ یہ محض ایک chapel نہیں بلکہ اچھا خاصا روحانی میوزیم ہے جہاں راہبوں کے آثار اور عابدین کی نشانیاں بڑے التزام کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ میں نے سامنے طاق میں پڑی قدیم طرز کی ایک لاکٹ اٹھائی۔ دیکھنے میں یہ جیبی گھڑی سے مشابہ تھی البتہ اندر گھڑی کی جگہ سینٹ پیڈرے پیو (St. Padre Pio) کے خلعت کا ایک انتہائی مختصر سی کترن بطور تبرک محفوظ کی گئی تھی۔ کترن کا حجم کوئی آدھ پون سینٹی میٹر کے قریب رہا ہوگا جس کے ٹھیک اوپر صلیب کا نشان ثبت تھا۔ لاکٹ کے کنارے دائروی شکل میں مرقوم تھا: Postulator Generalis O.F.M. Cap Rome۔ گویا یہ اس بات کی سند تھی کہ سینٹ پیڈرے کی یہ نشانی اصلی ہے جس کی پیڈرے پیو کے روحانی سلسلے نے خود تصدیق کی ہے۔ لاکٹ کی دوسری جانب پیڈرے پیو کی تصویر بنی تھی۔ چیپل کے مرکزی ستون سے متصل ایک سنہرے اسٹینڈ پر شیشے کے فریم میں ہڈیوں کے کچھ بوسیدہ ٹکڑے، جنھیں لال فیتوں سے باندھ کر یکجا کیا گیا تھا، آویزاں تھے۔

اس طلسم خانۂ روح وآ ثار میں میری محویت دیکھ کر مارلن میرا تاثر جاننے کے لیے بیتاب تھیں۔ کہنے لگیں: ڈاکٹر شاز کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان آ ثار کو چھو کر یا ان کی طرف معجزہ طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اگر کوئی دعا مانگی جائے تو یہ ضرور قبول ہوتی ہے'۔

'مگر شرط یہ ہے کہ سالک کا یقین نا قابل متزلزل ہو'۔ علی کودرا نے زیرلب مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔

'میں تو یہ سمجھتا تھا کہ یورپ کے سیکولر معاشرے میں مذہب کا عمل دخل اب واجبی سا ہے لیکن سلووینیا میں چرچ کی بجتی گھنٹیاں اور بورل میں چیپل کی سج دھج دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ جدید مغربی معاشرے میں عہد وسطیٰ کے اوہام وتصورات آج بھی زندہ ہیں'۔

'زندہ ہی نہیں بلکہ اب اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے'، پروفیسر پریووک نے تبصرہ کیا۔ کہنے لگے آپ کو حیرت ہوگی یہیں قریب میدی گوریئے نام کی ایک جگہ ہے، یہ کروٹ عیسائیوں کا علاقہ ہے۔ زیادہ دن نہیں ہوئے ۱۹۸۱ء کے موسم بہار میں کچھ بچوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انھیں سرینکا کی پہاڑیوں پر حضرت مریم کا دیدار ہوا ہے۔ ایک دو دن نہیں، مسلسل کئی دنوں تک۔ ان بچوں کا کہنا تھا کہ ایک دن حضرت مریم ایک طفل نومولود کو گود میں لئے ظاہر ہوئیں۔ وہ بے انتہا خوبصورت تھیں، آسمانی حسن سے معمور۔ انھوں نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم حضرت مسیح کے پیغام کو عام کریں کہ دنیا میں بڑھتی تاریکی دور کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ دیکھتے دیکھتے یہ باتیں عوامی ڈسکورس (discourse) کا حصہ بن گئیں۔ مقامی بشپ نے عوامی مقبولیت اور جوش وخروش کے سبب اسے اپنی سرپرستی عطا کر دی۔ اس وقت کی کمیونسٹ حکومت کی دھر پکڑ اور مقامی بشپ کی گرفتاری کے باوجود میدی گوریئے میں حضرت مریم کے ظہور کے اس غلغلہ پر روک نہ لگائی جا سکی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اس جگہ حضرت مریم کا ایک سرو قامت مجسمہ نصب کر دیا گیا ہے۔ زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ چھوٹا سا دورافتادہ گاؤں جہاں کل تک کچھ بھی نہ تھا، آج سیکڑوں ہوٹلوں پر مشتمل ایک مقبول عام زیارت گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر سال ایک ملین سے زیادہ لوگ اس مجسمہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

'جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ میدے گوریئے کا اسطورہ تو ہماری نگاہوں کے سامنے ہی تشکیل پایا ہے۔ یہ سب یقین کا کاروبار ہے اور یقین کے آگے عقل کی ایک نہیں چلتی'، یہ کہتے ہوئے مارلن نے کافی کا پیالہ اٹھایا، کرسی کو کھینچتے ہوئے مرکز میں آ بیٹھیں جیسے اچانک کوئی اہم خیال ان کے ذہن میں آیا ہو۔ ان کے

چہرے پر ایک شرارت آمیز لہر ہویدا ہوئی۔ بولیں: شاید آپ حضرات کو سینٹ روزالیہ کے واقعہ کا علم نہ ہو۔ روزالیہ ایک عابدہ وزاہدہ دوشیزہ تھی جو برسوں ایک غار میں محوِ عبادت رہی اور جو کثرتِ مجاہدہ اور شوقِ مشاہدہ کی تاب نہ لا کر عین عالم شباب میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ صدیوں اس کی ہڈیاں اسی غار میں دفن رہیں یہاں تک کہ ۱۶۲۴ء میں (Palermo) بلرم میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ بہت سے لوگوں کو خواب میں اس نوجوان راہبہ کا دیدار ہوا جو کہتی تھی میرے پاس اس وبا سے نجات کا نسخہ موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے غار کھود کر اس کی ہڈّیاں برآمد کیں۔ بلرم کی شاہراہوں سے ان ہڈّیوں کے جلو میں عقیدت مندوں کا جلوس گزرا اور طاعون کی وبا پر فی الفور لگام لگ گئی۔ عرصہ تک راہبہ کی یہ ہڈیاں اہل سسلی کے لیے عقیدت کا مرکز بنی رہیں۔ لوگ اس سے برکتیں حاصل کرتے رہے اور اس کے معجزات کا خلق میں چرچا رہا۔ ۱۸۲۵ء میں ایک برطانوی محقق ولیم بلکلینڈ جب وہاں پہنچا اور اس نے ان ہڈیوں کا قریبی معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ دراصل یہ انسانی ہڈیاں نہیں بلکہ کسی بکری کی ہڈی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ بلرم کے اس چرچ میں آج بھی بکری کی ان ہڈیوں کو راہبہ کے مقدس آثار کی حیثیت حاصل ہے اور حصولِ برکت کے کاروبار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے'۔

'چرچ کا اس بارے میں کیا موقف ہے؟' میں نے پروفیسر پریووک سے حقیقتِ حال جاننے کی کوشش کی۔

بولے: 'عرصہ ہوا ہمارے یہاں عیسائی مشائخیت ایک اخلاقی مخمصے کا شکار ہے۔ اسے اپنے انحرافات کی اصلاح خود اپنے وجود کی نفی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ جرمنی میں تو بعض ایسی خانقاہیں ہیں جہاں عیسائی راہبوں کے مکمل ڈھانچے سونے، چاندی، زر و جواہر سے مرصع شیشے کے خوبصورت فریموں میں زائرین کے لیے رکھے ہیں۔ جس خانقاہ یا چرچ میں ایسے آثار یا اشیاء برکت زیادہ ہیں وہاں زائرین کا ہجوم ہے'۔

'تو کیا آثار بزرگان کا یہ کاروبار پوری عیسائی دنیا میں پھیلا ہوا ہے؟' عبدالحمید نے، جواب تک عالم حیرت میں ہم لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے، طالب علمانہ وارفتگی سے پوچھا۔

جی ہاں کیتھولک چرچ کی جھولی میں اس کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟ مارلن نے فکرمندی کے لہجے میں کہا۔ 'بولیں اب اسی میدے گوریئے کے واقعہ کو لیجئے جہاں چند نابالغوں کے کشف یا ہلو سے کے نتیجے میں دیکھتے دیکھتے روحانیت کا ایک نیا مرکز وجود میں آ گیا۔ کیتھولک چرچ اس بارے میں کھل کر کچھ کہنے کی پوزیشن

میں نہیں۔ سنا تھا کہ روم سے عیسائی علماء کی کوئی اعلیٰ سطحی ٹیم صورتحال کے جائزے کے لیے آئی تھی لیکن ان کے لیے بھی ظہورِ مریم کے واقعہ کی تصدیق یا تردید کرنا ممکن نہ ہوسکا۔

بات یہ ہے کہ کیتھولک چرچ خود ان ہی نازک بنیادوں پر کھڑا ہے کشف وکرامات اور ظہور مسیح وظہور مریم کے واقعات کے عوامی قصے کہانیوں کی بساط اگر لپیٹ دی جائے تو چرچ کے پاس کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ پیا نے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔

کودرا، جو کافی کے پیالے کو سلوینیائی شہد سے دوآتشہ کرنے میں مصروف تھے، بولے بھئی اہل یقین کو خوب معلوم ہے کہ ان کی روحانی دنیا بارود کے ڈھیر پر قائم ہے۔ یہ دراصل آگ اور ڈائنامائٹ کا کھیل ہے۔ چرچ اور چرچ سے باہر مشاہدے اور مکاشفے کے دعویدار جب تک ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہیں گے یہ کاروبار چلتا رہے گا۔ آگ اور بارود دونوں ہی کے حق میں ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو تسلیم کریں کہ ان کا آپس میں ٹکرانا دونوں ہی کے لیے موت ہے۔

'مگر یہ جو آپ نے فرمایا کہ ان آثار کی برکت سے دعائیں قبول ہوتی ہیں تو کیا یہ اہل کلیسا کا مقبول عام عقیدہ ہے؟' عبدالحمید نے مارلن کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

'عقیدہ نہیں، خوش عقیدگی کہو۔ عقیدہ جب زوال پذیر ہوجاتا ہے تب خوش عقیدگی مومن کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے اور پھر اس طرح کے روحانی طلسم خانے وجود میں آتے ہیں جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں'۔ مارلن کے لہجہ میں اب خاصی سنجیدگی آ گئی تھی۔

نہیں میں یہ بات اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں کشمیر میں بھی ربیع الاول کے موقع پر جب رسول اللہؐ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی ہے اور جب ہزاروں کے مجمع کو مینار کی بلندی سے موئے مبارک کا دیدار کرایا جاتا ہے، بڑا دلگیر ہوتا ہے وہ منظر۔ مومنین آہیں بھرتے، گریہ وزاری کرتے اور آہ وبکا کا وہ سماں بندھتا ہے کہ بس بیان سے باہر۔ کہتے ہیں کہ موئے مبارک پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اب یہ جو پتا چلا کہ کچھ اسی قسم کا خیال عیسائی آثار کے بارے میں اہل کلیسا کا بھی ہے تو کچھ عجیب سی حیرت ہوئی۔

'جی ہاں یہ ادھر ہی کا مال ہے جو ادھر منتقل ہوگیا ہے'۔ کودرا نے گتھی سلجھانے کی کوشش کی۔ بولے: ہمارے ہاں آثار کی تقدیس کا تصور خاصے بعد کی پیداوار ہے۔ صدر اول میں اس قسم کے واقعات تو دسیوں ملتے

ہیں جب رسول اللہؐ نے کسی کی تالیف قلب یا اس کے احترام اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنی قبا اتار کر دے دی یا کسی کے اکرام میں اپنی چادر بچھا دی۔ البتہ یہ خیال کہ فی نفسہ ان عطا کردہ اشیاء سے برکتوں کا حصول ممکن ہے، تو اس خیال کے منزہ ہونے میں کوئی ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا ہے اور اس کے پیچھے بھی دراصل سیاسی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ میرے خیال میں پہلا شخص جس نے آثار رسولؐ کی بنیاد پر اپنی خلافت کے استحقاق کا دعویٰ کیا وہ عباسی خلیفہ المنصور تھا۔ نہ جانے کہاں سے منصور کو رسول اللہؐ کی چادر اور دوسرے آثار مل گئے۔ نسب کے اعتبار سے آل عباس ہونے کا اس کا دعویٰ تھا۔ سو ۱۳۲ھ کی ایک شب تاریک میں کوفہ کی مسجد میں نئی خلافت کے اعلان کے لیے یہ اسباب کافی سمجھے گئے۔ پھر تو ان آثار کی اہمیت اتنی بڑھی کہ بڑھتی ہی چلی گئی اور اب بھی جب خلافت کا ادارہ مدت سے خوابیدہ ہے مختلف زاویوں اور خانقاہوں میں روحانی سیادت کے دعویداران مفروضہ تبرکات سے مسلسل برکتیں کشید کر رہے ہیں۔

'مگر برکت تو ہے نا ان آثار میں؟' عبدالحمید نے جذباتی طور پر سنبھالا لینے کی کوشش کی۔

'صرف ان کے لیے جن کی خوش عقیدگی کا درجۂ حرارت بلند رہتا ہو'۔

'کیا مطلب؟' باسم نے مداخلت کی کوشش کی۔ بولے: آثار کا تو ایک مقام ہے نا؟ اور پھر آپ اس واقعہ کی کیا توجیہہ کریں گے کہ حضرت معاویہ نے مرتے وقت جو یہ وصیت کی تھی کہ انھیں رسول اللہؐ کی عطا کردہ قمیص میں دفن کیا جائے اور آپؐ کے ناخن اور موئے مبارک کو ان کے منہ، آنکھوں اور سجدہ کی جگہ پر رکھ دیا جائے۔ سو اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

'بھلا مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ واقعہ خود اپنے آپ پر ایک چشم کشا تبصرہ ہے۔ معاویہ جیسے جلیل القدر صحابی کو جو کاتبین وحی میں سے ہیں اور جنھیں اسلام کے عہد اول میں قافلۂ اسلامی کی شیرازہ بندی کا شرف حاصل ہے۔ بھلا ان کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے پیشرووں کے برعکس اپنی نجات کے لیے تبرکات کا راستہ اختیار کریں۔ یہ دراصل مخالف کیمپ کی تراشیدہ روایتیں ہیں جو معاویہ کو ایک دنیادار حکمراں کے طور پر پیش کرتی ہیں، جنھیں اپنی غلط کاریوں کے ازالے کے لیے مرتے وقت تبرکات رسولؐ کے سہارے کی تلاش ہوتی ہے۔

'عجیب؟' لیکن بات صرف معاویہ کی نہیں۔ سنن و آثار کی کتابوں میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جہاں آپؐ کے جسمانی تبرکات مثلاً موئے مبارک، لعاب دہن، ناخن اور پسینہ جیسی اشیاء کو برکت کا حامل بتایا

گیا ہے۔ بعد کے زمانے میں مختلف بلاد وامصار میں ان تبرکات کی مقبولیت کا چرچا رہا اور ہاں مجھے ایک روایت ام سلمٰی کے حوالے سے یاد آرہی ہے کہ آپ کے پاس رسول اللہؐ کے دو بال تھے جو حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہؐ کے سر منڈانے کے سبب انھیں حاصل ہوئے تھے۔ام سلمٰی ان بالوں کو بڑی حفاظت سے رکھتیں اور جب کوئی بیمار ہوتا تو ان بالوں کو پانی میں ڈبو کر مریض کو دیتیں اور مریض شفا پا جاتا۔اور ام سلیم بنت ملحان کے بارے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ وہ آپؐ کے وضو کے استعمال شدہ پانی کو اپنے جسم پر مل لیتیں۔ باسم نے اپنے نقطۂ نظر کو حوالوں سے منزہ کرنے کی کوشش کی۔

'جی ہاں! آپ بالکل صحیح جگہ پہنچے'۔ یہ کہتے ہوئے کودرا نے پہلو بدلا، ان کے چہرے پر تبسم کی وہ لہر ہویدا ہوئی جو بالعموم کسی ذہین طالب علم کے سوال پوچھنے پر استاد کے چہرے پر ہوتی ہے۔ بولے: بس پانی یہیں مرتا ہے۔ روایات وآثار کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ کبار صحابہ اور ازواج رسولؐ کے پاس نہ تو بال ہیں اور نہ ناخن اور نہ ہی کسی کو آپؐ کا پسینہ جمع کرنے کا خیال آیا۔ ذرا غور کیجیے ام سلمی کے پاس تو صرف دو بال ہیں اور وہ بھی انھیں بقول راویان، حدیبیہ میں مل پائے، جبکہ وہ زوجۂ رسول ہیں۔اس کے برعکس ام سلیم بنت ملحن اوران کے شوہر ابوطلحہ کے پاس آپؐ کے آدھے سر کے بال ہیں جو ان روایوں کے بقول آپؐ نے انھیں حجتہ الوداع میں سر منڈاتے وقت عطا کیے۔

'یہ ام سلیم ہیں کون؟' عبدالحمید نے جواب تک اس گفتگو کو بڑی حیرانی سے سن رہے تھے، نے استفسار کیا۔

ام سلیم کو نہیں جانتے؟ آپ انس بن مالک کی والدہ تھیں۔

اچھا! وہ موطا امام مالک والے؟ باسم نے وضاحت چاہی۔

'نہیں! نہیں! یہ انس بن مالک ہیں جنھیں رسول اللہؐ کے خادم ہونے کا شرف حاصل ہے، جن کے والد مالک بن نذر کے حالت کفر میں انتقال کے بعد ان کی والدہ ام سلیم نے ابوطلحہ بن ثابت سے شادی کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انس بن مالک آخری صحابی تھے جن کا انتقال ایک سوتین سال کی عمر میں بصرہ میں ۹۳ھ میں ہوا'۔کودرا کی گفتگو میں اب ایک محدثانہ رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ فالح اور عبدالحمید محو حیرت تھے کہ دیکھئے اب آگے کیا آتا ہے۔

'ارے آپ تو سب کچھ الٹے دے رہے ہیں'، باسم نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔ بولے: اگر

آثار کی یہ اہمیت نہ ہوتی تو بقول صاحبِ کشف المحجوب شیخ رودباری نے صرف دو موئے مبارک کے عوض اپنی تمام دولت کیوں بخش دی ہوتی۔ اور ہاں دلائل النبوۃ تو دیکھی ہوگی آپ نے، ابوبکر البیہقی والی۔ کیسے کیسے واقعات مرقوم ہیں۔ آپ ؐ کا استعمال شدہ پانی مریضوں کے حق میں شفاء تھا، لعاب دہن سے زخم مندمل ہو جاتا تھا اور عبدالقادر جیلانی کا جو یہ دعویٰ ہے کہ رسول اللہؐ نے خواب میں ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا اور انھیں درس و ارشاد کی اجازت دے دی۔ یہ جو برکت کا تصور ہے اگر اس سرالاسرار کو آپ نے مذہب سے نکال دیا تو پھر نہ اسلام میں کچھ بچے گا نہ عیسائیت میں۔

'نہ بچے۔ اسلام تو چاہتا ہی یہی ہے۔ اشیاء میں جو اس کے خواص ہیں یہی اس کی برکت ہے۔ مثلاً ٹھنڈا، تازہ، ناآلودہ، آبشار سے بہتا ہوا پانی ہماری پیاس کو بجھاتا اور ہمیں شکر و سکینت کے احساس سے دوچار کرتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ اس نعمت کی یہی برکت ہے۔ کائنات میں چاروں طرف جدھر بھی نظر ڈالئے برکتوں کا ظہور ہے، ایسا لگتا ہے جیسے پوری کائنات آپ کے لیے سامانِ زیست مہیا کرنے میں مصروف ہو۔ درختوں پر شیریں پھلوں کا آنا، شہد کی مکھی کی تگ و دو، بادِ صبا کے جھونکے، صبح کا طلوع اور پھر رات کا چادر خواب میں ڈھک دینا۔ گویا برکتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس سے ہم نامحسوس طور پر مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ فلاں بزرگ کے کوزے سے پانی پینے یا ان کی عطا کردہ مصری کی ڈلی کھانے کے بعد کسی کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہوں یا روحانیت کی سطح بلند ہونے کا احساس ہوتا ہو تو سمجھئے کہ آپ کے نہاں خانۂ دل میں کوئی بت جاگزیں ہو گیا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس پر اگر آپ فی الفور آگاہ نہ ہوئے تو یہ رفتہ رفتہ آپ کو غیر اللہ کی پرستش کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اسلام تو آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ بندے کا تعلق اس کے خالق سے براہ راست جوڑ دے۔ ہم میں سے ہر شخص لائقِ اکرام اور صاحبِ کشف ہے۔ اکرام آدمیت کے قرآنی منشور کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی متروکہ اشیا اور فرضی آثار میں برکتیں تلاش کرنے کے بجائے اشیاء کے خواص اور اس کی ترتیب نو کی برکتوں پر مطلع ہو'۔

'گویا آپ کے خیال میں برکت ورکت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ محض اشیاء کے خواص ہیں جنھیں آپ برکت کہتے ہیں، پھر تو یہ نری مادہ پرستی ہوگئی۔

میں نے ایک بات اور بھی کہی شاید آپ نے توجہ نہیں دی کہ ان اشیاء کی ترتیب نو سے نئی برکتوں کا ظہور بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً دریا کی لہروں کو آپ ٹائیڈ انرجی میں تبدیل کرتے اور اسے آب پاشی کے کام میں

لگا دیتے ہیں۔ تیز و تند ہوا میں برکتوں کی دریافت ہماری بادبانی کشتیوں کو متحرک کر دیتی ہے۔ سورج کی تپتی شعاعوں کو آپ سولر انرجی کی برکتوں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ گویا کائنات کی ان نشانیوں پر جس قدر غور کیجئے آپ خود کو نئی نئی حیران کن برکتوں کے جلو میں پائیں گے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے غور و فکر کریں اور کائنات کے راز ہائے سربستہ میں پوشیدہ برکتوں سے خود بھی متمتع ہوں اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کریں۔ قرآن پڑھیے قرآن۔ یہ کہتے ہوئے کودرا نے کافی کے پیالے کو پہلو بدلتے ہوئے کچھ اس زور سے میز پر رکھا جیسے وہ کوئی آخری فتویٰ صادر کرنے والے ہوں۔ سنریهم آیا تنا فی الآفاق و فی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق گویا برکتوں کا ظہور ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ جس قدر غور کیجئے خالق کائنات کی صناعی، اس کی حکمت اور بندوں کے تئیں اس کی ربوبیت کا احساس گہرا ہوتا جاتا ہے، سر سجدۂ شکر سے جھک جاتے ہیں۔ انه هو الحق کہے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا'۔

یہ تو آپ نے بہت بڑی برکت کی بات کہہ دی، عظیم برکت، پروفیسر پریووک نے تبصرہ کیا۔

باسم ایسا لگتا تھا جیسے برکت کی اس تعبیر سے ڈھ سے گئے ہوں۔ بولے: میری نگاہوں سے اب تک یہ پہلو اوجھل تھا۔

'بات یہ ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی مفروضہ اور تراشیدہ برکتوں کے حصول میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انھیں خدا کی کائنات میں ہر لمحہ ظہور پذیر برکتوں کا پتہ بھی نہیں چل پاتا۔ مفروضہ برکتیں ہمیں بڑی برکتوں کے حصول سے روک دیتی ہیں۔ یہ ہمیں شرک کے راستے پر لیے چلتی ہیں، ان کا سب سے پہلا ہدف یہ ہوتا ہے کہ ہم سوچنا بند کر دیں'۔ پروفیسر پریووک نے مزید وضاحت کی۔ بولے: اب اسی آثارِ مسیح کے مسئلہ کو لیجئے۔ ہر کسی کو دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اس اصلی صلیب کی باقیات موجود ہے جس پر حضرت مسیحؑ مصلوب ہوئے۔ بقول Erasmus یورپ کے مختلف گرجا گھروں میں اس قدر حقیقی صلیب کے باقیات موجود ہیں کہ ان کی مدد سے کئی مکمل گھر بنائے جا سکتے ہیں۔ آثار و تبرک کے اس ہنگامے میں پتا نہیں چلتا کہ حقیقت کہاں کھوئی گئی۔ لیکن طالبینِ برکت کو اس سے کیا غرض۔ انھیں تو لکڑی کے ہر مفروضہ ٹکڑے سے برکت حاصل ہو رہی ہے۔ اور ہاں ایک بات اور بتاؤں، ایک طرف تو عیسائی اسکالر ابھی اس قضیہ کو فیصل نہیں کر پائے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دینے میں تین کیلیں استعمال ہوئی تھیں یا چار لیکن یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ صرف یورپ کے مختلف گرجا گھروں میں تیس ایسی مقدس کیلیں موجود ہیں جن کے بارے میں عام اعتقاد ہے کہ یہ

اصل ہیں، مستند ہیں۔

عجیب! باسم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

پھر تو تبرک و آثار کی کوئی حقیقت ہی نہ ہوئی؟ اس سے پہلے کہ پروفیسر پریووک اپنی فاضلانہ گفتگو مکمل کرتے عبدالحمید نے کودرا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شاید وہ اب تک برکت کی کودرائی تعبیر سے خود کو ہم آہنگ نہ کر پائے تھے۔

حقیقت کیوں نہیں جب تک ہم برکتوں کی اصل حقیقت پر آگاہ تھے ہم نے عقل وخرد پر مبنی ایک طلسم خانۂ جہاں کو وجود بخشا۔ جابر بن حیان کا نام سنا ہوگا آپ نے؟ جس کی مسلم شناخت پر اہل مغرب نے Gaber کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ جابر نے اشیاء کے خواص بلکہ کہئے کہ اس کی پوشیدہ برکتوں کے راز سے کچھ اس طرح پردہ اٹھایا کہ اشیاء کی نئی ترتیب وتدوین سے کیمیا کا پراسرار اور حیران کن علم وجود میں آ گیا۔ ایسے محلول وجود میں آئے جو فولاد جیسی ٹھوس شئی کو بھی گھلا ڈالتے۔ بنوموسیٰ کی کتاب الحیل دیکھئے۔ اب تو انگریزی میں بھی دستیاب ہے آپ کو لائبریری میں مل جائے گی۔ کتاب کیا ہے خودکار مشینوں کا ایک طلسم خانہ۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں نے اس عہد میں کیا جب یورپ عہد تاریک میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب تک ہم اکتشافی اور عقلی ذہن کے حامل رہے خدا کی کائنات میں خود کو ہر لمحہ بے شمار برکتوں کے جلو میں پاتے۔ تجلی کی ایک کیفیت تھی جس سے ہمارا وجود عبارت تھا۔ عین جالوت پر جب ہم نے منگولوں کے حملوں کو لگام دی اور ان کا رخ عالم اسلام سے پھیر دیا اس وقت منگول حملہ آور اس سرالاسرار کو نہیں سمجھ پائے کہ مسلمانوں کے پاس وہ آتشی گولے کہاں سے آئے جس کے سبب منگولوں کے گھوڑے کچھ اس طرح بدکے کہ وہ پھر میدان جنگ میں ٹک نہ سکے۔ تب ہم نائٹریٹ اور چارکول کے مختلف تناسب کی برکتوں پر آگاہ تھے اور انھیں ہنگامی حالات میں دشمنوں کے خلاف استعمال کرنے کے فن سے واقف تھے۔ بارہویں تیرہویں صدی کے وہ سائنسی رسالے دیکھئے جس میں بارود کے استعمال اور ان سے متعلقہ اشیاء کے تناسب کے خواص لکھے ہیں۔ جب تک ہم ان برکتوں پر آگاہ رہے سیادت ہمارے ہاتھ میں رہی لیکن جب ہمارے اندر اس خیال نے جنم لیا کہ خالد بن ولید کی تمام فتوحات اس موئے مبارک کے سبب تھیں جو وہ اپنی کلاہ میں جنگ پر جاتے ہوئے رکھ لیتے تھے۔ یا جب آخری عباسی خلیفہ اس بات پر یقین کر بیٹھا کہ اس کے پاس رسول اللہ کی جو ردائے مبارک ہے اسے اوڑھ لینے کے بعد دشمن اسے گزند نہیں پہنچا سکتا تو آپ نے دیکھا کہ جب وہ مارا گیا ہے تو اسی ردائے مبارک میں لپٹا ہوا تھا۔

اگر بال یا چادر میں ضرر سے بچنے کا کوئی پہلو ہوتا تو خود رسولؐ اللہ کو احد میں کیوں ہزیمت اٹھانی پڑتی۔ کبھی موقع ملے تو توپ کا پی سرائے ہو آیئے، عبرت کا بڑا سامان ہے وہاں۔ تعویذی قرآن مجید سے لے کر ایسے ملبوسات جن پر پورا قرآن مرقوم ہے۔ عثمانی خلفاء یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان تعویذی ملبوسات کو جسم پر ڈال کر میدان جنگ میں جانے والا گزند سے محفوظ رہے گا۔ عسکری کامیابی کے لیے زائچوں، وفق اور نقوش کا ایک پورا دبستان وجود میں آ گیا لیکن ترکوں کی پسپائی رو کے نہ رکی یہاں تک کہ آخری خلیفہ عبدالحمید کو عبرتناک جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ یہ ہے مفروضہ برکتوں کی وہ داستان۔ یہ کہتے ہوئے کودرا کچھ نمناک سے ہو گئے۔ خاص طور پر خلیفہ عبدالحمید کے تذکرے پر وہ اپنی روہانسی آواز کو چھپا نہ سکے جیسے اچانک ان کا کرب باہر آ گیا ہو۔ انھوں نے ایک سرد آہ بھری، بولے کیا بتاؤں دراصل ان ہی برکتوں نے ہمارا بیڑہ غرق کیا ہے۔ ہم جنھیں برکت کہتے ہیں یہ دراصل توہمات ہیں۔ نرے توہمات'۔

کودرا کی آواز اب بلند ہو چکی تھی، ان کے لہجہ میں ایک طرح کا مفتیانہ رنگ غالب آ گیا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو رکے، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بولے: اٹھارویں صدی کے اواخر میں نپولین نے جب مصر پر حملہ کیا تو ہم نے اسلحوں اور گولے بارود کے مقابلے میں ان ہی مفروضہ برکتوں کا سہارا لیا۔ خدیو مصر نے علمائے الازہر سے پوچھا کہ دشمن قریب آ چکا ہے، حالات سخت ہیں اب کیا کیا جائے۔ علمائے ازہر نے ختم بخاری کا مشورہ دیا کہ شاید اس کی برکتوں سے آنے والی مصیبتیں ٹل جائیں۔ ادھر امت ختم بخاری میں لگی رہی ادھر دشمن کی فوجیں مصر پر قابض ہو گئیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسی فوجوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان کا اہتمام کیا جائے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ادھر روسی فوجیں شہر میں داخل ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مسلمان عملی تدابیر کے بجائے ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلب القلوب کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہائے ان مفروضہ برکتوں نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

'میرے خیال میں آپ درست کہہ رہے ہیں'، باسم کے لہجہ میں اب جرح کے بجائے ایک طالب علمانہ انکسار آ گیا تھا۔ کہنے لگے مگر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ برکت اگر واقعی ایک غیر عقلی رویہ ہے اور اس سے توہمات کو جلا ملتی ہے تو تاریخ و آثار کی کتابوں میں سلف صالحین کے حوالے سے آثار کی دینی اہمیت اور اس کی برکتوں کے حصول کا ذکر کیوں ملتا ہے؟

اس کی وجہ خالصاً سیاسی ہے بلکہ یہ کہیے کہ یہ سامری کا بچھڑا ہے۔ مجہول الفکر لوگوں کو ایک ایسے بچھڑے کی تلاش ہوتی ہے جسے وہ الہ کہہ سکیں، جس کے گرد لوگ اکھٹے ہوسکیں۔ البتہ اگر آپ ایک بار اس راہ پر چل نکلے تو پھر عقل اور توہم کے بیچ پائی جانے والی حد فاصل باقی نہیں رہ پاتی۔ اب ان ہی روایتوں کو لیجئے جس میں ام سلیم کو رسول اللہؐ کا پسینہ جمع کرتے دکھایا گیا ہے۔ مسلم کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ ام سلیم کے گھر میں جاتے (یدخل بیت ام سلیم فینام علی فراشیھا، ولیست فیه) ان کے بچھونوں پہ سو رہتے جبکہ وہ گھر میں نہیں ہوتیں۔ ایک دن جب آپؐ سوئے ہوئے تھے ام سلیم آئیں، دیکھا تو آپؐ کو پسینہ آیا ہوا ہے جو چمڑے کے بچھونوں پر جمع ہوگیا ہے۔ ام سلیم نے اپنا ڈبہ کھولا اور پسینہ پونچھ پونچھ کر شیشیوں میں بھرنے لگیں۔ رسول اللہؐ اچانک اٹھ بیٹھے فرمایا ماتصنعین؟ یا ام سلیم۔ اے ام سلیم کیا کررہی ہو؟ بولیں: یارسول اللہؐ نرجو برکته لصبیانا یعنی ہم اپنے بچوں کے لیے اس سے برکت کی امید رکھتے ہیں۔ محدثین نے اس طرح کی روایتوں کو جس طرح بے سوچے سمجھے اپنی کتابوں میں نقل کرلیا ہے اس نے بعد میں آنے والوں کے لیے بڑے مسائل پیدا کردیئے ہیں۔ حالانکہ سوچنے والوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ برکت کے اس کاروبار میں ازواج مطہرات اور کبار صحابہ آخر کیوں شامل نہیں ہیں۔ زوجۂ نبیؐ ام سلمٰی کے حصے میں صرف دو بال اور ام سلیم کے حصے میں ڈھیر سارے موئے مبارک آنے کی آخر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ رسول اللہؐ جیسے نفیس ترین انسان کے بارے میں راویوں کا یہ کہنا کہ جب کسی انسان کو تکلیف ہوتی یا کوئی زخم ہوتا تو وہ اپنا لعاب دہن مٹی کے ساتھ ملا کر لگاتے اور یہ پڑھتے جاتے: بسم اللّٰه تربته ارضنا بریقه بعضنا یشفی سقیمنا باذن ربنا یعنی ہماری زمین کی مٹی اور ہم میں سے بعض کا لعاب اللہ کے حکم سے ہمارے مریض کو شفا دیتا ہے۔ دراصل اس عقلی رویے کی نفی ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے'۔

'پھر آثار وتبرکات پر اتنی لمبی چوڑی بحثیں ہماری کتابوں میں کہاں سے در آئی ہیں؟' باسم نے پھر مداخلت کی کوشش کی۔ بولے: بخاری کی بعض روایتوں میں تو اس طرح کی باتیں بھی موجود ہیں کہ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اس میں چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور اس میں کلی کی۔ پھر ابوموسیٰ اشعری اور بلال سے کہا تم اس میں سے کچھ پانی نوش کرلو، کچھ اپنے چہرے پر چھڑک لو۔ اس کے بعد انھوں نے پیالہ لیا اور آپؐ کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور بخاری کوئی عام کتاب نہیں سو کیا کہیں گے آپ؟

'دیکھئے بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کیجیے، یہ دیکھئے کہ آثار اور اس کی مفروضہ برکتوں کا پرنالہ آخر

گرتا کہاں ہے؟

آپ تو کہتے ہیں کہ اس کے محرکات سیاسی رہے ہیں، عبدالحمید نے لقمہ دیا۔

'جی ہاں آپ صحیح سمجھے، اب میں اسی طرف آتا ہوں۔ خلافت اور آثار کا تعلق بڑا گہرا رہا ہے۔ بعد کے دنوں میں جب عالم اسلام میں تین تین خلافتیں وجود میں آ گئیں، بغداد میں عباسی خلافت، قاہرہ میں فاطمی خلافت اور ادھر اندلس میں امویوں نے اپنی خلافت کا علم بلند کیا تو ہر ایک کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے استحقاقِ خلافت پر آثار و تبرکات رسولؐ سے دلالت قائم کرے۔ عباسی خلفاء ایک طرف تو رسول اللہؐ سے قرابت کے دعویدار تھے اور دوسری طرف ان کا کہنا تھا کہ ان کے پاس آپؐ کی ردائے مبارک اور دوسرے آثار بطور ورثہ منتقل ہوئے ہیں۔ سو ان آثار کی تولیت کے سبب انھیں مسلمانوں کی قیادت کا حق حاصل ہے۔ ہلال الصابی نے رسوم دارالخلافۃ میں عباسی خلفاء کے دربار کے تذکرے میں لکھا ہے کہ خلیفہ ایک سیاہ عمامہ میں ملبوس ہوتا، اس کے ہاتھ میں رسول اللہؐ کی سیف مبارک ہوتی، سامنے مصحف عثمان آویزاں ہوتا، اور اس کے شانے رسول اللہؐ کی ردائے مبارک سے مزین ہوتے۔ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں سقوط خلافت کے بعد ردائے مبارک تو ضائع ہو گئی البتہ ۱۲۶۱ء میں ممالیک کے ہاتھوں جب دوبارہ عباسی خلافت کا احیاء ہوا تو اس خانوادے کا فرد ہونا فی نفسہ استحقاق کی علامت بن گیا'۔

'کیا مطلب! منگولوں کے حملوں کے بعد ان مقدس آثار میں سے کچھ بھی نہ بچ پایا؟

یہ کہنا تو مشکل ہے البتہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تین سال بعد ۱۲۶۱ء میں جب دوبارہ مصر میں عباسی خلافت قائم ہوئی ہے تو اس کے پیچھے کون لوگ تھے اور اس کے اصل محرکات کیا تھے؟

ممالیک کی بات کر رہے ہیں نا آپ۔ ان کی تو بڑی خدمات ہیں۔ انھوں نے بڑے نازک وقت میں امت کو سہارا دیا۔

درست فرمایا! لیکن بیبرس کو آخر کیا ضرورت پیش آئی کہ وہ آل عباس کے ایک غیر معروف شخص کو خلافت کی زمام کار سونپ دے۔ بیبرس نے اپنے سلجوقی آقاؤں کی بساط لپیٹی تھی۔ اس نے منگول حملہ آوروں کے بڑھتے قدم روکے تھے۔ عین جالوت پر بیبرس کے ہاتھوں منگولوں کی شکست نے بیبرس کے قد و قامت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ اسے اقتدار پر قبضہ کا جواز نہیں بخش سکتے تھے سو اس نے عباسی خانوادے کے ایک غیر معروف شخص کو خلافت کے منصب پر فائز کیا اور اس خلیفہ نے ایک عوامی تقریب میں

بیبرس کو سلطانی کے کامل امور تفویض کر دیئے۔ گویا تنصیب خلافت کی یہ ساری کاروائی دراصل بیبرس کی اپنی سلطانی کو جواز بخشنے کے لیے تھی۔ یہاں آل عباس کا ایک فرد خود ہی آثار تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کے قبضہ میں رسول اللہؐ کے دیگر آثار بھی موجود تھے۔

۱۵۱۷ء میں جب ترکوں نے قاہرہ کی عباسی خلافت کا چراغ گل کر دیا تو وہ اپنے ساتھ آخری عباسی خلیفہ المتوکل ثالث کو بھی لے گئے اور اس طرح خلافت کا ادارہ آل عباس سے عثمانی ترکوں کو منتقل ہو گیا۔

'جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ ہماری نظری پراگندگی میں آثار کی سیاست کا بڑا دخل ہے اور ان ممالیک حکمرانوں نے تو اپنی سیاست کی خاطر دین کا قالب ہی بدل ڈالا'۔

وہ کیسے؟ باسم نے میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

'بات لمبی ہو جائے گی، بس اتنا جانئے کہ ہمارا فکری انتشار عہد بیبرس میں ہی منتج ہوا۔ بیبرس ایک غاصب جرنیل تھا جس نے بزور شمشیر اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے اپنی سلطانی کو جواز بخشنے کے لیے صرف مجہول خلیفہ کو اقتدار ہی نہیں سونپا بلکہ علیحدہ علیحدہ چار فقہاء کے قضاۃ مقرر کر دیئے۔ آگے چل کر فرح بن برقوق کے عہد میں حرم کعبہ میں چار مصلوں کا قیام عمل میں آ گیا۔ اور اس طرح متبعین محمدؐ کی وحدت ہمیشہ ہمیش کے لیے پارہ پارہ ہو گئی۔

مگر بیبرس کو بیک وقت چار متبادل قضاۃ کے تعین کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

اس کے پیچھے بھی داخلی سیاست کارفرما تھی۔ بیبرس نے جب مصر پر قبضہ کیا اور بغداد کی تاراجی کے سبب عالم اسلام کی قیادت اس کے ہاتھوں میں آ گئی اس وقت قاہرہ میں شافعی قاضی کا بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ ان کو قابو میں کرنا کچھ آسان نہ تھا سو بیبرس نے ان کی مرکزیت کو تحلیل کرنے کی غرض سے حنفی، حنبلی اور مالکی قضاۃ کے متبادل ادارے قائم کر دیئے۔ اس طرح فقہی گروہ بندی کو سرکاری سرپرستی ملنے کے سبب آنے والے دنوں میں مسلمان چار فقہی خانوں میں بٹ کر رہ گئے۔ دیکھئے وقتی سیاست بھی کیا گل کھلاتی ہے اور اس کے اثرات کتنے جان لیوا اور کتنے دور رس ہوتے ہیں۔

تو کیا مصر کے فاطمی خلفاء کے پاس بھی رسول اللہؐ کی کوئی ردائے مبارک تھی؟ یاسر نے گفتگو کو آثار و نوادر تک مرکوز رکھنے کی اپنی سی سعی کی۔

'ویسے تو انھیں کسی آثار کی ضرورت نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ خلافت پر صرف اولاد فاطمہ کا حق

ہے۔مگر ہر سامری کو ایک بچھڑے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ فاطمین نے یہ کام رأس حسینؓ سے لیا۔ ۵۴۹ھ میں عسقلان سے حسین ابن علی کا راس مبارک بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ قاہرہ لے جایا گیا تاکہ حسین کے سچے نام لیواؤں کی سیادت معتبر ٹھہرے اور عوام الناس اس سے برکت حاصل کر سکیں۔ آج بھی مسجد سیدنا حسین کی برکت ان ہی آثار کے دم سے قائم ہے۔ اہل بیت کے وہ دعویدار بھی جن کی خلافت باضابطہ قائم نہ ہو سکی ان کا دعویٰ رہا ہے کہ اصل مصحف حضرت علی سے ہوتا ہوا ائمہ اثنا عشر کو منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ بارہویں امام اسے اپنی تحویل میں لے کر روپوش ہو گئے۔

’پھر تو عام مسلمانوں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہوگا کہ وہ خلافت کے اصل دعویدار کو پہچانیں‘۔ یاسر نے تشویش ظاہر کی۔

جی ہاں فاطمی داعیوں نے آل فاطمہ کی فضیلت کا چرچا کیا۔ اب دیکھئے حدیث کساء کے دو متبادل ورژن ہیں۔ ایک کے مطابق رسول اللہؐ نے اپنی چادر میں آل علی کو ڈھانپ لیا جبکہ دوسری روایت آل عباس کو اس شرف کا حامل بتاتی ہے۔ سیاسی پروپیگنڈے کے اس شور میں عام مسلمانوں کے لیے یہ کچھ آسان نہ تھا کہ وہ ان متبادل اور متحارب روایات کی حقیقت پر مطلع ہو پاتے۔

خیر یہ تو عباسی اور فاطمی خلافت کی بات ہوئی۔ دونوں کے پاس حدیث کساء موجود تھی مگر اموی خلافت اپنے جواز پر کہاں سے دلائل لاتی تھی؟ ان کی بابت تو کوئی حدیث کساء سننے میں نہیں آتی عبدالحمید نے اپنے سوال کو صیقل کرتے ہوئے کہا۔

کودرا مسکرائے، بولے انھیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انھیں خلافت کا ادارہ حضرت حسن کے رضا کارانہ میدان سے ہٹ جانے کے سبب ملا تھا۔ انھیں اپنی خلافت کے قیام کے لیے فاطمین کی طرح کسی زیر زمین تحریک کا سہارا نہیں لینا پڑا اور نہ ہی عباسیوں کی طرح مختلف بلاد و امصار میں الرضا من آل محمد کی تحریک چلانی پڑی۔ البتہ جب اندلس میں اموی خلافت کا ظہور ہوا تو اس کے تزک و احتشام کی بنیاد ان ہی آثار کے حوالے سے مستحکم ہو سکی۔

عبدالرحمٰن الداخل کی بات کر رہے ہیں آپ؟

نہیں! داخل تو صرف ایک امیر تھے جو عباسیوں کے حملے سے بچتے بچاتے کسی طرح اندلس پہنچے اور یہاں انھوں نے اپنی امارت قائم کر لی۔ خلافت کا باقاعدہ اعلان تو عبدالرحمٰن الثالث نے کیا جس کی فاطمی

خلافت سے جھڑپیں رہیں سواس نے یہ مناسب جانا کہ عباسیوں اور فاطمیوں کے مقابلہ میں محض ایک امیر منطقہ ہونے کے بجائے اپنی خلافت کا دعویٰ پیش کرے۔ سواس کام کے لیے اندلس میں مصحف عثمان اور بعض روایتوں کے مطابق مصحف امام کی موجودگی کا شہرہ ہوا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے امیر المومنین کی حیثیت سے الناصر لدین اللہ کا لقب اختیار کیا۔ مسجد میں اس مقصد کے لیے ایک مقصورہ خاص اس مصحف کے لیے بنوایا گیا۔ ادریسی نے نزھة المشتاق فی اختراق الآفاق میں لکھا ہے کہ یہ وہی مصحف تھا جو عثمان بن عفان نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا اور جس کی تلاوت کرتے ہوئے آپ شہید ہوئے تھے۔ سورہ بقرہ کی آیت فسیکفیھم اللّٰہ پر خونِ عثمان کے دھبّے موجود تھے کہتے ہیں کہ جب یہ نسخہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تو اس کے پیچھے ایک بڑا جلوس چلتا۔ سیف رسولؐ اور مصحف عثمان کے حوالے سے عبدالرحمٰن کی خلافت کا دعویٰ مختلف بلاد وامصار میں کچھ اس طرح پھیلا کہ ۱۱۵۷ء میں جب موحدین نے قرطبہ پر حملہ کیا تو وہ اس مصحف کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ مصحف کی موجودگی جوازِ خلافت کی دلیل بن گئی۔

'اچھا! باسم جو بہت غور سے مصحف امام کی بابت سن رہے تھے بولے، مجھے اموی اندلس کے اس سیاسی پہلو کا اندازہ نہ تھا، کہاں ملے گی یہ تفصیلات؟

تاریخ کی کسی بھی کتاب میں دیکھئے۔ ابن خلدون سے پہلے ابن عبدالملک (متوفی ۷۰۳ھ)، ابن مرزوقی (متوفی ۷۸۱ھ) کو دیکھ جایئے یا عبدالواحد المراکشی کی مشہور زمانہ تالیف المعجب فی تلخیص اخبار المشرق ملاحظہ کیجئے۔ بڑی چشم کشا ہیں یہ کتابیں۔ پتا چلتا ہے کہ کس طرح آثار سے حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کا کام لیا۔ عبدالرحمٰن الثالث جنگوں میں مصحف اور دوسرے آثار بڑے اہتمام کے ساتھ لے جاتے۔ بعد میں یہی روایت موحدون نے بھی برقرار رکھی۔ کبھی یہ مصحف دشمنوں کے قبضہ میں چلا جاتا جیسا کہ عبدالرحمٰن الثالث کے عہد میں ہوا اور کبھی خود مسلمانوں کی باہمی رزم آرائیوں میں گم ہو جاتا۔ بقول ابن عبدالملک مراقش کے موحّدون، تونس کے حفصیون اور غرناطہ کے بنونصر حکمراں مسلسل اس تاک میں رہتے کہ کب کس طرح مصحف عثمان ان کے قبضہ میں آجائے۔

'پھر تو اس کا بھی امکان تھا کہ اصل مصحفِ عثمان کے تعین کے بجائے مختلف قدیم نسخوں کو استحقاق خلافت کے اس کام میں لگایا جائے'۔

'جی ہاں بالکل صحیح کہا آپ نے اور ایسا ہوا بھی'۔ کودرانے باسم کے اس اندیشے سے اتفاق کرتے

ہوئے کہا۔ بولے عثمان کا خون تو کسی ایک ہی مصحف پر گرا ہوگا لیکن خون کے دھبّے کم از کم چار پانچ نسخوں پہ پائے جاتے ہیں جو قاہرہ، بصرہ، استنبول اور تاشقند میں رکھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب آثار حصولِ سیادت کی سیڑھی بن جائے تو پھر اس کی حرمت کا برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ موحدین کے عہد میں شعراء کے قصائد دیکھئے، یہ کہتے ہوئے کودرا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں۔ بولے مجھے پورا قصیدہ تو یاد نہیں۔ ابن حبوس الفاسی کے کچھ اشعار یاد رہ گئے ہیں۔

هــذا كتــاب الــلّــه جـل اسـمــه — بــخــط عثـمــان وفــي رحــلــه
خيـــر امـــــام آجـــر اجــــاءهٔ — خيـــر امـــام كـــان مـــن قبـلـــه
اليـــه يـنـــمـی كـلّـمـا مـصـحف — تـــانــق الــعـــالـم فـي نـقـلـــه

اور یہ ایک دو شاعروں کی بات نہیں بلکہ اس عہد کا مذہبی مزاج ہے۔ ابن طفیل جیسا عبقری بھی آثار کے اسی سحر میں گرفتار نظر آتا ہے۔

بـمـصـحف عثـمـان الشهيد وجـمـعـه — تبيـن ان الـحـق بـالـحـق يـعـضد
تـحـامتــه ايـديـی الـروم بـعـد انسافـه — وقــد كـــاد ولـــولا ســعـــده يـــدُ

کودرا اب شعر و قصائد سنانے کے موڈ میں نظر آرہے تھے۔ باسم کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ عہد بہ عہد کی شاعری اور شعر و قصائد کے لامتناہی ذخیرے سے کودرا بروقت اور برمحل اشعار کیسے نکال لاتے ہیں۔ پوچھا کیا آثار و تبرکات کبھی آپ کے تخصص کا موضوع رہے ہیں؟

کودرا اس غیر متوقع سوال پر مسکرائے لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کہتے عبدالحمید نے ایک دوسرا سوال داغ دیا۔ 'مصحف عثمان کے علاوہ اور کیا کیا چیزیں تھیں جنھیں استحقاق خلافت کی دلیل سمجھا جانے لگا تھا؟'

بولے: ایک تو یہی مصحف جس کے اصل نسخہ کا تحویل میں ہونا خلافت کی شانِ عظیم بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ عصائے مبارک اور سیف رسولؐ خلیفہ کی نظری اور روحانی قوت کی دلیل سمجھی جاتی تھی اور کسی کے پاس اگر رداء پاک بھی ہوتو پھر کیا کہنے۔

لیکن اموی سلسلے میں، جیسا کہ روایتیں بتاتی ہیں، قمیصِ رسولؐ کو امیر معاویہ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ تو کیا امویوں کو قمیص رسولؐ کی اس سیاسی اہمیت کا اندازہ نہ تھا؟ عبدالحمید نے پوچھا۔

بولے: شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ معاویہ کے عہد تک آثار کی سیاسی اہمیت منقح نہ ہو پائی تھی۔ پہلی بار آثار کی سیاست عباسی داعیوں نے کی جنھیں اپنے استحقاق خلافت پر دلیل لانے کے لیے ردائے مبارک کی

ضرورت محسوس ہوئی اور پھر یہ خیال راسخ ہوا کہ ردائے مبارک کی نسلاً بعد نسل عباسی خلفاء میں منتقلی گویا اسی خلافت کا تسلسل ہے جس کا سرا آپؐ کی ذاتِ گرامی سے جا ملتا ہے۔

پھر یہ جو موئے مبارک اور قدم مبارک کے نشانات جا بجا پائے جاتے ہیں اس کے پیچھے بھی کوئی سیاسی محرک رہا ہے؟

جی ہاں آپ بالکل صحیح سمجھے۔ مصحف عثمان، عصائے مبارک اور سیف رسولؐ جیسی چیزیں تو قوت کے علامیہ کے طور پر سامنے آئیں جنھیں خلفاء نے اپنی خلافت کے استحقاق کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ رہے قدمِ مبارک، نعلین مبارک اور موئے مبارک جیسی چیزیں تو اسے روحانی سیادت کے دعویداروں نے اپنے استناد کے لیے استعمال کیا۔ اور آپ کو حیرت ہوگی کہ اسلام میں آثار کی تقدیس کا یہ سارا کاروبار اضمحلال خلافت کے دور میں انجام پایا ہے۔ اہل سیاست اور اہل مذہب دونوں اس راز سے واقف تھے کہ رسول اللہؐ کے تئیں عام مسلمانوں میں جو والہانہ محبت پائی جاتی ہے اس کے سبب آپؐ کی ذات سے منسوب کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کے جذبات واحساسات کی دنیا تہہ وبالا کر سکتی ہے۔ اہل سیاست نے اگر اپنے اقتدار کے لیے ردائے مبارک کا سہارا لیا تو اہل طریقت نے خرقۂ رسولؐ کو اویس قرنی کے حوالے سے حاصل کیا اور اہل شریعت یعنی علمائے ظاہر نے نعلین مبارک اور موئے مبارک جیسی علامتوں کو اپنی تصویب وتائید کے لیے استعمال کیا۔

نعلین مبارک کا ظہور کب ہوا؟ ہمارے ہاں کشمیر میں تو اس کی شبیہیں بازاروں میں ملتی ہیں، لوگ برکت کے لیے خریدتے ہیں۔

اور وہاں توپ کاپی سرائے میں بھی تو رکھی ہے، باسم نے لقمہ دیا۔

جی ہاں نعلین کا بھی ایک سیاسی پس منظر ہے۔ یہ کہتے ہوئے کو درا ایک بار پھر زیر لب مسکرائے۔ بولے: عباسی آثار رسولؐ کے سہارے اقتدار میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو آثارِ رسولؐ کے امین اور محافظ کے طور پر پیش کیا تھا۔ ان کے لیے یہ مشکل تھا کہ آثار رسولؐ کے دوسرے دعویداروں کو یکسر مسترد کر دیں۔ وہ جن بنیادوں پر خود کھڑے تھے اس کی نفی نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عباسی خلیفہ المہدی کے زمانے میں ایک مجہول سا آدمی اس کے دربار میں آیا، اس کے ہاتھوں میں ایک چپل تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ رسولؐ کی نعلین مبارک ہے جو اس کے پاس مختلف ثقہ واسطوں سے پہنچی ہے۔ بھرے دربار میں نعلین مبارک کے

اس تحفہ کو مسترد کرنا خلیفۂ وقت کے لیے کچھ آسان نہ تھا۔ اگر اسے نقلی قرار دے کر مسترد کرتا تو خطرہ تھا کہ خوش عقیدہ مسلمان اسے توہین رسالت کا مرتکب جانتے۔ مہدی امور سیاست سے واقف تھا۔ اس نے فی الفور اس ہدیہ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ قبول کیا۔ اور ہدیہ پیش کرنے والے کی خدمت میں شکر و امتنان کے طور پر دس ہزار درہم پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد، جیسا کہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے، مہدی نے اپنے مصاحبین سے کہا کہ ہم نے دس ہزار درہم میں اس کی زبان خرید لی، اس کا ہدیہ قبول کیا، اس کے دعوے سے تعرض نہ کیا، ہمارے لیے اس سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

'جی ہاں! اب بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ جب حکمراں خود کمزور بنیادوں پر کھڑے تھے تو وہ دوسروں کو آثار کی سیاست سے کیسے روک سکتے تھے۔

اتنا ہی نہیں جو لوگ امت کی سیادت پر بزور بازو قابض ہو گئے تھے ان کے لیے آثار رسولؐ کا حصول بھی استحکام سیادت کا حصہ بن گیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں ایسے دسیوں واقعات ہیں، کہاں تک گناؤں۔ دمشق کے ایوبی حکمراں الملک الاشرف موسیٰ (عہد ۶۳۵۔۶۲۶) کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ انھوں نے دمشق کے ایک محدث سے نعلین مبارک حاصل کی تا کہ اس سے برکت حاصل کر سکیں۔ الملک الاشرف نے اس خاص نعلین کے لیے ایک عمارت بنوائی اور اس کی دیکھ ریکھ کے لیے تنخواہ دار ملازم مقرر کر دئے۔ آگے چل کر تعلیم حدیث کا ایک بڑا مرکز بھی اس عمارت کے گرد قائم ہو گیا۔ نعلین مبارک کے سبب اس مدرسہ کی خاص شان تھی۔ لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے۔ بارہویں صدی عیسوی تک تو یہ صورتحال ہوگئی کہ علماء نعلین مبارک کے کاغذی تمثال جاری کرنے لگے۔ سو دور دراز کے لوگ اس کاغذی تمثال کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اسے بابرکت سمجھتے۔

'گویا نعلین کی یہ شبیہیں کوئی نیا تازہ عمل نہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ ہمارے دور کی بدعت ہے، عبدالحمید نے حیرت کا اظہار کیا۔

نہیں! اس عمل پر صدیاں گزر یں ہیں۔ ابن عساکر (متوفی ۶۸۶ھ) نے جزء تمثال نعل النبی اور المقرّی نے فتح المتعال فی مدح النعال میں نعل مبارک کی مقبولیت کا بڑا چشم کشا تذکرہ کیا ہے۔ نعلین مبارک کے تمثال کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ اس عہد کے بعض علماء و محدثین کی شہرت اسی دم سے قائم تھی کہ ان کے پاس نعلین مبارک کی مصدقہ نقل اور مستند کاپی موجود ہے۔ تاریخی مصادر میں اسکندریہ کے

ابوطاہرالیافی (م ۵۷۶ھ) دمشق کے حبط اللہ الاکفافی (م ۵۲۴ھ) اور اصفہان کے احمد الفزاری کی شہرت اسی نعلین مبارک کے سبب ہے۔

نعلین مبارک کی تقدیس تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کے تمثالوں کی اس قدر مقبولیت کی آخر کیا وجہ تھی؟

وہی برکت۔ امراء وسلاطین اس کی برکت سے اپنی سیادت مستحکم کرتے اور عامۃ الناس اسے بیماریوں سے نجات کے لیے نسخۂ شفا جانتے۔ شمالی افریقہ کے بعض ملکوں میں یہ خیال عام تھا کہ اگر اندھے کی آنکھ پر یہ تمثال رکھ دی جائے تو اس کی بینائی واپس آجاتی ہے۔ ابن عساکر نے کسی شیخ ابوجعفر کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک طالب علم کو نعلین مبارک کا تمثال عطا کیا۔ اس کی بیوی درد سے دوہری ہوئی جاتی تھی۔ اس نے درد کی جگہ تمثال رکھا اور دعا کی کہ اے خدا صاحبِ نعلین کی برکتوں کا دیدار ہمیں بھی کرا۔ کہتے ہیں کہ چشم زدن میں اس کی تکلیف جاتی رہی۔

یہ کس عہد کا واقعہ ہے۔ عبدالحمید نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

بولے: ابن عساکر تو بارہویں صدی کے آدمی ہیں البتہ المقری کی کتاب فتح المتعال فی مدح النعال گیارہویں صدی کی تصنیف ہے۔

گویا یہ سب کچھ ایک ہزار سال پرانا عمل ہے۔

جی ہاں امت کے مزاج میں اس تبدیلی پر ہزار سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ تو کہیے کہ اب وہ شدت نظر نہیں آتی جس سے تیرہویں اور چودھویں صدی کا اسلام عبارت ہے۔ زاہدان باصفا ہوں یا علمائے ظاہر، اس عہد میں بڑے بڑے جغادری نعلین مبارک کو بوسہ دیتے اور اس سے برکت طلب کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ القسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) نے المواھب میں لکھا ہے کہ جس کے پاس نعلین ہو وہ دشمنوں کی بغاوت سے محفوظ رہتا ہے، اسے شیاطین ضرر نہیں پہنچا سکتے، وہ حاسدوں کی نظر بد سے محفوظ رہتا ہے۔ بقول القسطلانی نعلین کے مجربات میں سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عورت دردزہ کے وقت اسے اپنے دائیں ہاتھ میں رکھے تو اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

'عجیب!' باسم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔

'بولے! جی ہاں حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ المقری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دمشق کے لوگ مصیبت

کی گھڑی میں نعل مبارک کے توسط سے دعا مانگتے۔

تو کیا دمشق کی کسی خانقاہ میں یہ نعلین مبارک آج بھی موجود ہے؟ عبدالحمید نے کچھ اس بے تابی سے پوچھا جیسے اچانک دمشق کے سفر کا کوئی منصوبہ ان کے ذہن میں آیا ہو۔

'فرمایا: تاریخی مصادر سے پتا چلتا ہے کہ تیرہویں صدی کے آخر آخر تک دمشق میں نعلین مبارک موجود تھا۔ ۱۴۰۱ء میں جب تیمور لنگ نے دمشق کا محاصرہ کیا تو وہ اپنے ساتھ نعلین مبارک بھی لے گیا'۔

'ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، یہ آج کل کی بات نہیں، ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اس عہد میں، اس قدر پہلے، امت کے مزاج میں اتنی بڑی اور بنیادی تبدیلی کیسے آ گئی؟ سلف صالحین نے اس صورتحال کو کنٹرول کرنے کی کیا کوئی کوشش نہیں کی؟ باسم نے پوچھا۔

'یقیناً اس رویے کے ناقدین ہر دور میں موجود رہے ہیں لیکن آثار کی عوامی مقبولیت کے آگے بھلا ان کی کیا چلتی۔ سکّہ تو ان بزرگوں کا چل رہا تھا جو نہ جانے کہاں سے آثار رسولؐ کا خزینہ لئے منظر عام پر آتے اور اسے کسی حکمراں، کسی عالم یا کسی صوفی کے ہاتھوں میں تھما جاتے۔ پندرہویں صدی کے معروف عالم محمد الزمان (م ۱۴۹۲ء) کسی ایسے ہی بزرگ کے رابطہ میں آئے جنھوں نے انھیں رسول اللہؐ کے موئے مبارک، قدم مبارک اور رسول اللہؐ کے کسی کاتب وحی کے ہاتھوں کا تحریر کردہ قرآن کا کوئی جز عطا کیا۔ یہ آثار بہت دنوں تک قاہرہ میں ابن زماں کے مدرسے کی زینت بنے رہے۔

مگر اس بات کا تعین کیسے ہوتا کہ یہ آثار واقعی اصلی ہیں؟

کیا اس کام کے لئے کسی بزرگ کی بزرگی کافی نہیں؟ میں نے کہا۔ تمہارے ہاں کشمیر میں جو موئے مبارک ہے وہ بھی تو کسی بزرگ ہی کا عطا کردہ ہے۔

وہ تو سید عبداللہ لائے تھے براہ راست مدینہ سے، اورنگ زیب کے زمانے میں۔ اس کی تو باضابطہ تاریخ موجود ہے۔ عبدالحمید نے ان دو بزرگوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے پر احتجاج کیا۔

مگر وہ سید عبداللہ صاحب کے، جو آل رسولؐ ہونے کے دعویدار تھے اور جن کے عطا کردہ موئے مبارک کی داستان سے حضرت بل کی عظمت قائم ہے، حسب نسب اور موئے مبارک کی اصلیت کا پتہ لگانے کی بھی کبھی کوئی باضابطہ کوشش کی گئی؟

'جی میرا ذہن تو ادھر نہیں گیا۔ اس میں اگر کوئی سقم تھا تو یقیناً اورنگ زیب نے اس کی تفتیش کی

ہوتی'۔

کوئی بھی حکمراں اس قسم کی علامتوں سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ اس کے لیے تو آسان راستہ یہی ہے، جیسا کہ المہدی نے کیا، کہ وہ جانتے بوجھتے نقلی آثار کو بھی اپنے حق میں استعمال کر لے۔

عبدالحمید کے لب ولہجہ سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ میں نے کہا: ایک بات اور سمجھنے کی ہے کہ ہم آج جس عہد کا تذکرہ لے بیٹھے ہیں وہ اضمحلال خلافت کا عہد ہے۔ اسلام میں سلطانی کے ظہور کے بعد اور خاص طور پر ایوبیوں اور ممالیک کے عہد میں دین کے مزاج میں بعض بنیادی تبدیلیاں آتی گئیں۔ حکمراں اوّل تو دین وشرع کے مزاج آشنا نہ تھے۔ ثانیاً وہ اپنی ماقبل اسلام معاشرت سے وہ سب کچھ لے آئے جو اسلام کی بنیادی دعوت کے مغائر تھا۔ آثار کی تقدیس ہو یا مقبروں کی ثقافت یا بزرگوں کی ارواح سے متعلق یہ خیال کہ وہ گزرتے وقتوں کے ساتھ قوت حاصل کر لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ استعانت کے لیے بھی مجرب ہیں اور ان جیسی دسیوں چیزیں منگول، ترک اور وسط ایشیاء کی دوسری اقوام جن کا علمی، عسکری اور سیاسی امور میں اب عمل دخل ہو گیا تھا، اس عہد میں اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ خاص طور پر سلجوق اور مملوک حکمرانوں کے عہد میں اسلام کے بنیادی قالب میں بعض دور رس تبدیلیاں در آئیں۔ بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ دین کا مزاج ہی بدل گیا۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے یہی ایک مثال کافی ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں پہلی بار رسول اللہؐ کی قبر مبارک پر قبّہ تعمیر ہوا جس کا سہرا مملوک حکمراں سلطان قلاوون الصالحی کے سر جاتا ہے۔ فقہائے اربعہ کی تخصیص، بلکہ تقدیس کا کام بھی ممالیک کے ابتدائی عہد میں ہوا۔ آگے چل کر عہد چراکسہ میں حرم کعبہ میں چار فقہی مسالک کے الگ الگ مصلے بھی ان ہی لوگوں نے لگوائے۔ سلجوقی، ایوبی، زنگی اور ادھر جنوب ایشیاء میں خلجی حکمرانی کے عہد میں مقبروں کی تعمیر اور ان کے انتظام و انصرام کا ایک ایسا سلسلہ چلا جس نے سیدھے سادے دین کی تقلیب ماہیت کر دی۔ جو دین بندوں کا راست خدا سے تعلق قائم کرنے کا دعویدار تھا اور جس کے رسولؐ کی شان ہی یہ تھی کہ ویضع عنهم اصرهم والا غلال التی کانت علیهم وہی دین خانقاہوں، زاویوں اور مقبروں کا دین بن گیا۔ مختلف بلاد وامصار میں تراشیدہ طرق تصوف کے حامل روحانی خلفاء کی بہار آ گئی۔ یہ تبدیلی چونکہ دین کے پردے میں آئی تھی اس لیے تقلیدی ذہن اس کے مضمرات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صورتحال کی اس بنیادی تبدیلی کا علمائے حق کو اندازہ نہ ہوا ہو اور انھوں نے

اصلاح احوال کے لیے کچھ بھی نہ کیا ہو؟ باسم نے اعتراض وارد کیا۔

'کیوں نہیں اعتراض اور احتجاج کے مظاہر تو جا بجا ملتے ہیں مگر عوامی جوش وخروش کا ریلا اتنا طاقتور تھا کہ اس کے آگے کسی کی نہ چل سکی۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کو بالعموم راسخ العقیدگی کا امین سمجھا جاتا ہے انھوں نے بھی کشف والہام، روحانیت اور برکت کے اس دھارے میں بہنے میں عافیت جانی۔ کسی نے آثار رسولؐ خرید کر حاصل کیا، کسی کو کوئی بزرگ عطا کر گئے، کسی کو ورثے میں ملے اور جسے یہ سہولت حاصل نہ تھی اس نے خواب میں رسول اللہؐ سے موئے مبارک مانگ لیا۔

'اچھا ایسا بھی ہوا؟' فرطِ حیرت سے عبدالحمید کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جی ہاں ہما شما کی بات نہیں، شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے عالم خواب میں رسول اللہؐ سے موئے مبارک حاصل کیے، یہ دونوں آپس میں جڑے رہتے، جوں ہی درود شریف پڑھا جاتا یہ دونوں الگ الگ سیدھے کھڑے ہو جاتے اور درود شریف ختم ہوتے ہی اپنی اصل حالت اختیار کر لیتے۔

واقعی آپ تو بہت دور کی لائے کودرا کے لبوں پر مسکراہٹ ہویدا ہوئی۔

نہیں شاہ صاحب سے یہ توقع نہیں، باسم نے جرح کی۔

میں نے کہا: یقین نہ آئے تو انفاس العارفین دیکھ لیجئے۔ بلکہ وہاں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ شاہ صاحب کے پاس موئے مبارک کی زیارت کے لیے آئے۔ انھوں نے بہت کوشش کی مگر اس بکس کا تالا نہ کھلا جس میں موئے مبارک رکھے تھے۔ شاہ صاحب پریشان ہوئے کہ ماجرا کیا ہے؟ مراقبہ کیا تو پتا چلا کہ ان میں سے ایک شخص حالتِ جنابت میں ہے۔ انھوں نے سب کو تجدید طہارت کا حکم دیا۔ لکھا ہے کہ جنبی جیسے ہی مجمع سے نکلا، قفل کھل گیا اور لوگوں نے موئے مبارک کی زیارت کر لی۔

'عجیب! شاہ صاحب کی کتابوں میں اس طرح کی باتیں ہیں۔ میں تو انھیں راست فکری اور راسخ العقیدگی کا مینار سمجھتا تھا'، باسم نے اظہارِ تاسف کیا۔

'جی ہاں! جب راسخ العقیدگی کے بڑے بڑے ستون روحانیت اور برکت کے عوامی ریلے میں بہہ رہے ہوں تو آپ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اپنے عہد میں جن لوگوں نے آثار کی سیاست کی انھوں نے تو یقیناً اپنی خلافت اور سلطانی مستحکم کر لی۔ بغداد کے عباسی ہوں یا اسپین کے اموی، فاطمی خلفاء ہوں

یا عثمانی ترک یا سلطانی اور امیری کے دعویدار ترک، منگول، کرد اور ان جیسے دسیوں سلسلے، ان کا کام تو نکل گیا لیکن برکت اور استحقاقِ خلافت کے اس پورے تماشے میں دین کا مزاج کچھ اس طرح بگڑا کہ اب اس اصل مزاج کی تعمیرِنو کا خیال ہمیں کم ہی آتا ہے۔ آثار تو پھر بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے یا اب توپ کاپی سرائے جیسے میوزیم کی زینت ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے گا کہ اس پورے عرصے میں خلافت کے مختلف دعویداروں نے اور سلطانی پر متمکن حکمرانوں نے جن تراشیدہ قصے کہانیوں اور روایتوں کو اپنے کام پر لگایا وہ بدقسمتی سے ہمارے تراثی ادب کا حصہ بن گئے۔ تاریخ و آثار کی کتابوں میں پائے جانے والے ان تراشیدہ، گمراہ کن اور زہریلے مواد کی مضرت رسانیوں سے آج تک ہمارا نظری وجود جانبر نہیں ہو سکا ہے۔

'اور ہو بھی نہیں سکتا، آپ سمجھتے کیوں نہیں!' کودرا نے کسی قدر غصہ اور جھنجھلاہٹ سے کہا۔ اچانک ان کی آواز بلند ہو گئی، ایک لمحہ دور فضا میں کچھ دیکھتے رہے، پھر بولے: 'فیصلہ لکھ دیا گیا اور قلم توڑ دیا گیا اب کچھ نہیں ہو سکتا'۔ یہ کہتے ہوئے کودرا نے اپنا بستہ سنبھالا جیسے مجلس سے اوب کر اب جانا چاہتے ہوں۔ پھر توقف اختیار کیا، بولے: 'یہ بدقسمتی خود ہم نے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہے۔ یاد کرو اس دن کو جب عثمان اپنے قاتلین سے یہ کہتے جاتے تھے کہ لوگو! تم میرے قتل کے بعد پھر کبھی متحد نہ رہ پاؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے کودرا اٹھ کھڑے ہوئے، کسی قدر سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا چاہتے تھے کہ اچانک رک گئے جیسے کسی غیر مرئی قوت نے انھیں روک لیا ہو۔ اب ان کے جلال میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، کسی قدر چیختے ہوئے بولے: 'جو امت اپنے رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے اہل بیت سے نگاہیں پھیر لے اس کے حصہ میں ذلّت و نکبت کے علاوہ کیا آ سکتا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا، فضول باتیں ہیں یہ سب! بالکل فضول'۔

کودرا تو رخصت ہو گئے لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئے۔ باسم، یاسر اور عبدالحمید حیران تھے۔ پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟

' کچھ نہیں بس کبھی ان پر تشنج کا اچانک دورہ پڑتا ہے'۔ یہ کہہ کر میں نے سرِدست بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس خیال سے کہ ان پر واقعی تشنج کا دورہ نہ پڑ جائے، ان کے تعاقب میں نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کودرا کاسل کے اندرونی دالان میں ایک کرسی پر تنہا بیٹھے سگریٹ جلانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ تیز ہوا کے تھپیڑے میں ان کے لائٹر کی لو بار بار بجھ جاتی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: 'اچھا ہوا! آپ بھی آ گئے وہاں تہہ خانے میں بڑی گھٹن تھی'۔

میں نے کہا: 'ہواؤں کے تھپیڑے خواہ کتنے ہی سخت ہوں چراغ جلانے کی کوشش ترک نہیں کرنی چاہیے'۔

کودرا اب تھم سے گئے تھے۔ میرا اشارہ سمجھ گئے، مسکرائے، بولے: سگریٹ تو میں عرفانِ ذات کے لیے پیتا ہوں۔

اچھا! وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگے: ہر کش کے ساتھ سگریٹ کی زندگی کم ہوتی جاتی ہے۔ فنا کا استعارہ ہے یہ، فنا کا! کودرا کو خوشگوار موڈ میں دیکھ کر میں نے اطمنان کی سانس لی۔

۱۳

نزلت ھکذا

آج رات بستر میں لیٹتے ہوئے عبدالوہاب آفندی بہت یاد آئے۔ جب وہ اپنے موقف کی تائید میں دلائل وشواہد کے انبار لگا دیتے اور پھر انھیں محسوس ہوتا کہ مخاطب کی بند دماغی نے اس کی عقل پر تالا لگا رکھا ہے، قدماء کے اقوال کے بغیر اس کی گاڑی نہیں چلتی تو وہ اس دلگرفتہ صورتحال کا کمال بذلہ سنجی کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ ایک لطیف مسکراہٹ ان کے چہرے پر طلوع ہوتی، فرماتے: 'یہ باتیں ان کتابوں میں لکھی تھیں جو سقوطِ بغداد کے وقت دجلہ میں ڈبو دی گئیں'۔

جب میں نے پہلی بار آفندی کی زبان سے یہ جملہ سنا تھا تو میرے اوپر حیرت واستعجاب کی ایک عجیب کیفیت چھا گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آخر کیا سبب تھا کہ سقوط بغداد کے وقت اس قدر کتابیں دریا برد کی گئیں کہ بعض وقائع نگاروں کے مطابق دجلہ کا پانی کتابوں کی روشنائی کے سبب سیاہ ہوگیا۔ کتابیں تو ہر دور میں فاتحین کے لیے سرمایہ رہی ہیں۔ پریس کی ایجاد سے پہلے کتابوں کے قلمی نسخے زر و جواہر کی سی اہمیت رکھتے تھے۔ قحط کے ایام میں پبلک لائبریری سے کتابوں کے نسخے چوری ہو جاتے۔ بعض لوگ انھیں مطالعہ کے بعد واپس کرنے کے بجائے ارزاں قیمت پر اشیائے خورونوش کے حصول کے لیے بیچنے پر مجبور ہوتے۔ میرے لیے یہ سوال بھی پریشان کن تھا کہ جن منگول حملہ آوروں نے ناصرالدین طوسی کے لیے مراغہ میں رصدگاہ کی سہولت بہم پہنچائی اور جن کے لشکر میں یا کم از کم ان کے مؤیدین میں اہل علم موجود تھے، انھوں نے کتابوں کی اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کیونکر برداشت کی؟

سقوط بغداد پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بنیادی طور پر دو قسم کے مصنفین ہیں اولاً وہ حضرات جو الخانی نقطۂ نظر سے سقوط کو حکمرانوں کی اپنی بداعمالیوں کا سبب قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وہ مصنفین جنھوں نے

ممالیک کے نقطۂ نظر سے منگولوں کو خدا کے عذاب سے تعبیر کیا ہے، ان کی تاریخ نگاری ایک اساطیری انداز لیے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں سقوطِ خلافت سے پہلے آسمانی بجلی، طوفان، بادِ باراں، قحط اور دیگر آسمانی آفات کے ظہور کا بیان ملتا ہے۔ گویا منگولوں کے حملوں نے کسی آسمانی خلافت اور خدائی اسکیم کو تہہ و بالا کر دیا ہو۔ ان دو مختلف نقاطِ نظر سے یہ پتا نہیں چلتا کہ سقوط بغداد کے وقت بغداد اور اس کے اہالیان پر واقعتاً کیا گزری۔ بغداد سنی اسلام کا دارالخلافہ تھا یہاں کی لائبریری میں سنی اسلام کی تشریح و تعبیر پر کیا کچھ تصنیفات نہ رہی ہوں گی۔ اگر وہ کتابیں آج بھی موجود ہوتیں تو اسلام کا سنی قالب کتنا مختلف ہوتا؟

اس سوال نے میرے دل و دماغ میں ایک اضطراب سا برپا کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے آفندی سے پوچھا کہ کیا انہیں دجلہ میں ڈبوئی گئی کتابوں کے بغیر اسلام کا فہم کچھ تشنہ تشنہ سا لگتا ہے؟

اس سوال پر وہ زیرِ لب مسکرائے، بولے: ہرگز نہیں جو بچ گئی ہیں وہی ہماری تعذیب ذہنی کے لیے کیا کم ہیں۔ چالیس چالیس جلدوں پر مشتمل رجال کی کتابیں دیکھ جایئے پتا نہیں چلتا کہ حقیقت ہے کیا۔ جو راوی ایک کے نزدیک ثقہ ہے، عادل ہے وہی دوسرے کے نزدیک کذب و افتراء سے متہم ہے۔ عمریں گزر جاتی ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ ان ضخیم مجلدات کی ورق گردانی کے بعد ہم پہنچے کہاں۔ بولے: علم نہیں دریا برد کیا گیا بلکہ نزاعی کتابیں تلف کی گئیں۔ کہنے لگے کہ میرے خیال میں سقوط بغداد کو خارجی حملہ کے بجائے مسلمانوں کی نظری اور فکری خانہ جنگی کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ کتابوں کے اتلاف کا واقعہ، ایسا بھی نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار سقوط بغداد کے وقت پیش آیا ہو۔ صلاح الدین ایوبی نے جب فاطمی خلافت کی بساط لپیٹی اس کے ساتھ ہی انھوں نے دارالعلم کے خاتمہ کا بھی اعلان کر دیا۔ کہتے ہیں کہ فاطمی خلفاء نے اپنے نقطۂ نظر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے عوامی لائبریری کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ خاص طور پر الحاکم کے زمانے میں قارئین کے لیے قیام و طعام کی سہولت اور نقل نویسی کے لیے ضروری لوازمات مفت فراہم کیے جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ دین کی فاطمی تعبیر کی اشاعت عام ہو اور شائقین کے ذریعہ ان کتابوں کی نقلیں دور دراز علاقوں تک پہنچیں۔ ایوبی حکمراں سنّی اسلام کے علمبردار تھے۔ ان کے لیے دین کی فاطمی تعبیر اور ان کے قائم کردہ دارالعلم اور دار الکتب قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔

اسی طرح آل بویہ سے تعلق رکھنے والے اسمٰعیل بن عبّاد کی مشہور زمانہ لائبریری محمود غزنوی کے حملوں کی زد میں آئی۔ محمود نے، جو خود کو سنی اسلام کا علمبردار سمجھتا تھا، ابن عبّاد کی لائبریری میں موجود ان

کتابوں کو تاراج کیا جو شیعہ نقطۂ نظر کی وکالت کرتی تھیں۔ بقیہ ہزاروں کتابوں کو وہ اپنے ساتھ دارالحکومت غزنہ لے گیا کہ اسے بھی لائبریری کے قیام کا شوق تھا۔ محمود نے باطنیوں اور قرامطیوں کو تہہ تیغ کیا، روافض کی کتابوں کو نذرِ آتش کیا کہ وہ ایسا کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا۔ کچھ یہی صورتحال ۱۲۵۶ء میں اسمٰعیلی قلعہ الموت کے سقوط کے وقت پیش آئی۔ قلعہ الموت اپنی لائبریری کے لیے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عطاء الملک جوینی نے، جو ہلاکو کے مؤیدین میں سے تھے، اس لائبریری کی تباہی سے پہلے اس کا بھرپور جائزہ لیا؛ مفید کتابیں اور فلکیاتی آلہ جات الگ کیے جنھیں بعد میں مراغہ کی رصدگاہ میں بھیج دیا گیا۔ قرائن بتاتے ہیں، جیسا کہ تاریخ جہاں گشا سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعبیری ادب کے علاوہ تاریخ کی وہ کتابیں بھی تلف کی گئیں جو اسمٰعیلی نقطۂ نظر کی حامل تھیں۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کاسل میں شرکاء کی چلت پھرت اب ماند پڑ چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سونے کی اپنی سی کوشش کی۔ خیالات کا سلسلہ تھمتا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک خاموش ہم کلامی میرے وجود میں سرایت کر گئی ہو۔ تاریخ اور تعبیر کی جنگ بھی اپنے اندر خانہ جنگی کے کتنے سامان رکھتی ہے۔ اسماعیلی دارالخلافہ کی لائبریریاں ایوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہوئیں، صاحب بن عبّاد کا شیعہ کتب خانہ غزنوی جیسے مجاہد کے ہاتھوں تاراج ہوا اور منگولوں کی پشت پناہی میں الموت کی اسماعیلی لائبریری اور بغداد کے سنّی کتب خانے فنا کو پہنچے۔ کیسی عجیب ہے یہ جنگ جو تھم کر نہیں دیتی۔

ایک فرقہ کی تحریر کردہ تاریخ دوسرے کے لیے سمّ قاتل ہے، ایک کی تعبیر دوسرے کی نفی سے عبارت ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جن حضرات کی دینی تعبیر خود ان کی اپنی تراشیدہ تاریخ سے غذا حاصل کرتی ہو وہ اس تاریخ سے دستبردار ہو جائیں۔ سنی ہوں یا اثنا عشری شیعہ یا اسمٰعیلیوں کے مختلف گروہ، ان سب کے لیے تاریخ کا صرف وہی بیان مستند ہے جو ان کے نظری ڈھانچے کو سنبھالے رکھے۔ دیکھا جائے تو یہ تمام فرقے تفہیم و تعبیر کا سارا کام تاریخی بیانیہ کی روشنی میں کرنے پر مصر ہیں۔ وہی مسموم تاریخ جو ان کے پرکھوں نے اپنے اپنے خیموں کو منظّم کرنے کے لیے لکھی ہے۔ تاریخ کا عفریت ایک بار بے قابو ہو جائے تو اسے دوبارہ بوتل میں قید کرنا کچھ آسان نہیں۔ آثار تو غائب ہو جاتے ہیں لیکن ان کے بیان کی بازگشت سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ شیخ بوصیری کا وہ بردہ جو بقول ان کے رسول اللہؐ نے انھیں خواب میں عطا کیا تھا ہم تک نہیں پہنچا لیکن قصیدہ بردہ کا اسطوری طرزِ فکر آج بھی ہماری صلابتِ فکری سے مزاحم ہے۔ اسی طرح عباسیوں اور فاطمیوں کی وہ

کساء جوان دوفریقوں کے بقول ان کے خانوادے کو رسول اللہؐ کی چادر میں ڈھانپنے سے مشرف ہوئی تھی، ہم تک نہیں پہنچی لیکن دعائے کِساء اور اس حوالے سے عباسی اور فاطمی خانوادوں کے استحقاق خلافت کی باتیں ہمارے تراثی ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔

آثار، تاریخ اور تعبیر کے پراسرار تکون پر غور کرتے ہوئے نہ جانے میں کن وادیوں میں جا نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بالائی منزل پر بورل کی مرکزی لائبریری کا دروازہ کھلا ہے، بلند و بالا چھت سے لٹکتی ہوئی ایک برقی قندیل مطالعہ کی میز کو روشن کئے ہوئے ہے۔ میز پر چند بوسیدہ کتابیں منتشر حالت میں ہیں۔ کمرے میں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد۔ ایک پراسرا خاموشی نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ میں نے ازراہ شوق ایک کتاب اٹھائی، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ارے یہ کیا؟ کتاب البدع۔ حیرت ہوئی، بھلا پارسی فال کے اس کتب خانے میں اس کتاب کا کیا کام؟ میں نے مصنف کا نام پڑھنے کی کوشش کی۔ تلاشِ بسیار کے بعد صرف اتنا پتہ چلا کہ یہ کسی نیشاپوری عالم کی تصنیف ہے۔ نمی کے سبب کتاب کے بیشتر صفحات ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ اچانک ایک ذیلی عنوان پر میری نگاہ اٹک کر رہ گئی۔ لکھا تھا:

'اللہ نے شریعت نازل کی، علماء نہیں'۔

اول الذکر آسمانی بشارت سے عبارت ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا اور اس کے رسولؐ کی اتباع میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں جبکہ ثانی الذکر ایک خالصتاً زمانی اور زمینی پیداوار ہے۔ آگے لکھا تھا: آج اسلام کا دارالخلافہ نوحہ کناں ہے۔ علماء وسلاطین نے خلافت کے مقتدرِ اعلیٰ پر جو شب خون مارا ہے اس کی شناعت کا شائد ہی کسی کو اندازہ ہو۔ خلیفہ بے چارہ تو محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ اصل اقتدار تو علماء وسلاطین کے ہاتھوں میں ہے جن کی بندر بانٹ کے سبب دین مبین کا قالب مسلسل تغییر وتحریف کی زد میں ہے۔ اے کاش کہ کوئی تقلیبِ دین کے اس عمل پر بند باندھ سکتا'۔

اگلی چند سطریں امتداد زمانہ کا شکار ہو گئی تھیں۔ جس کے بعد لکھا تھا: سلجوقی حکمرانوں کو دین اور مصالح دین کا کچھ شعور نہیں اور ایوبی حکمراں بس یہ دیکھتے ہیں کہ خلقت کیا چاہتی ہے وہ اپنا وزن اسی عالم یا محدث کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، ایسے میں دین حنیف کی صحیح تشریح وتعبیر کا کام کون انجام دے۔ خلیفہ بے چارہ حالات کا قیدی ہے'۔

سیاق وسباق سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلجوقی حکمرانی کے آخری ایام میں لکھی گئی کوئی تحریر ہے۔ البتہ

بعض باتیں بڑی حیران کن تھیں۔ایک جگہ لکھا تھا:'دین اسلام کے تغییر وتحریف میں محدثین اور متکلمین کی باہمی لڑائیوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ابتداً متکلمین (اہل الرائے) کو سبقت حاصل رہی۔فقہ حنفی کے بانی مبانی امام ابوحنیفہ کا شمار اہل الرائے میں ہی ہوتا تھا لیکن بہت جلد شافعی کی پرزور تحریروں اور آگے چل کر ابن حنبل کی عوامی مقبولیت کے ہاتھوں اہل الرائے کو فیصلہ کن شکست ہوگئی'۔

مصنف کا کہنا تھا کہ 'علم رجال کی ایجاد نے محدثین کے ہاتھوں میں ایک ایسا ہتھیار تھما دیا ہے جس کا مقابلہ اہل الرائے کے بس کی بات نہیں۔رہا بے چارہ خلیفہ تو وہ سیاسی اعتبار سے سلطانی کے آگے سرنگوں ہے اور نظری اعتبار سے اس نے علماء کو پیشوا تسلیم کر لیا ہے۔کرسی خلافت کی بے توقیری کے مظاہر ہماری ۶۰۰ سالہ تاریخ میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔کہاں ابوبکر و علی کی وہ شانِ یداللہی کہ اول الذکر ہزار مخالفتوں کے باوجود مانعین زکوۃ سے جہاد کے فیصلے پر اٹل ہیں، ثانی الذکر مسئلہ تحکیم پر اپنی رائے پر مصر ہیں اور کہاں خلیفہ ہارون رشید جسے ابو یوسف عالمانہ نخوت کے ساتھ یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ میں نے آپ کی فرمائش پر یہ کتاب لکھ دی ہے اب' آپ اسے اچھی طرح سمجھ لیں، اس میں غور وفکر کریں، اسے بار بار پڑھیں یہاں تک کہ یہ سب کچھ آپ کو ذہن نشیں ہو جائے' (فتفقهه و تدبره وردد قراء ته حتى تحفظه)۔

ایک جگہ لکھا تھا: اصحاب الحدیث کا یہ اصرار ہے کہ حق بس ان کے پاس ہے۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سنت کی آڑ میں ان حضرات نے شخصی برتری کی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔وہ اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لئے پہلے ان پر مرجئیہ، قدریہ، خوارج اور روافض جیسے الزامات عائد کرتے ہیں اور پھر ان کی روایت کردہ حدیثوں کو ساقط الاعتبار قرار دیتے ہیں اور یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا ان کا اصرار ہے کہ متکلمین کا اسلام معتبر نہیں، نہ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے اور نہ ہی شادی بیاہ جیسے سماجی رشتے کیے جائیں۔جب ابن حنبل جیسے لوگ برملا یہ کہتے ہوں کہ ابو یوسف میرے اولین اساتذہ میں سے ہیں جن سے میں نے حدیثیں سنیں، وہ صدوق بھی ہیں لیکن میں ان سے حدیثیں روایت کرنا مناسب نہیں سمجھتا کہ وہ اصحاب ابوحنیفہ میں سے ہیں، تو صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔جب علی بن ہاشم البرید (متوفی ۱۷۹ھ) جیسے ثقہ راویوں کے نام صرف اس بنا پر کتاب المجروحین میں لکھ دیئے جائیں کہ ان کی ہمدردیاں اہل بیت کے ساتھ ہیں اور جب ابومعاویہ (متوفی ۱۸۵ھ) کی حدیثیں صرف اس لئے مسترد کر دی جائیں کہ ان کا شمار مرجئیہ کے اساطین میں ہوتا ہے تو ایک سیدھے سادے حق کے متلاشی کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

کتاب خاصی دلچسپ معلوم ہوتی تھی لیکن افسوس کہ اس کا بڑا حصہ اب بوسیدگی کے سبب پڑھنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ اگلا صفحہ نمی کے سبب ایک دوسرے سے پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ تجسس ہوا کہ یہ بحث دلچسپ ہے دیکھا جائے کہ آگے مصنف نے کیا لکھا ہے۔ بڑی مشکل سے صفحات الگ کئے۔ اندران دو صفحات کے بیچ ایک دائروی سوختہ رکھا تھا جس پر سرخ رنگ کی پنسل سے تیر کا نشان بنا تھا جس کے نیچے لکھا تھا 'ابن عباد خارجی؟ عبدالملک بن مہلب او مروان'۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ ان صفحات پر کسی محقق کی نظر پہلے بھی پڑ چکی ہے۔ متنِ کتاب کی اصل تحریر جس پر یہ تبصرہ لکھا گیا تھا کچھ اس طرح تھی: 'ابن عباد نے سچ ہی تو کہا تھا کہ شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کی باہمی رزم آرائیوں میں منزّل اسلام کی شکل صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ ان لوگوں نے احکام خداوندی کے علی الرغم احادیث وروایات کو اپنا مرجع قرار دے ڈالا۔ ہدایت کی تلاش میں قرآن کے بجائے غیر قرآنی ماخذ کی طرف جا نکلے۔ اہلِ بیت کی محبت اور مہدی کی آمد جیسے خیالات نے دینِ اسلام میں علویت کو جنم دیا۔ ایک آنے والے کے انتظارِ موہوم نے انھیں پیش بینوں کا اسیر بنا دیا۔'

حیرت ہوئی کہ پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے بعض اہلِ نظر ماورائے قرآن ماخذ کی اس سختی سے نکیر کر رہے تھے اور وہ اس حقیقت پر مطلع تھے کہ فضائل ومناقب کی روایتیں خواہ وہ علوی شیعیت کے حق میں ہوں یا اپنے اندر عباسی اور اسماعیلی شیعیت کی تخم ریزی کا سامان رکھتی ہوں، دراصل اسلام کی آفاقیت سے متصادم ہیں۔

آگے لکھا تھا: 'کاش کہ ہم یہ سمجھ پاتے کہ دومۃ الجندل میں ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص جب مذاکرات کر رہے تھے تب یہ مسئلہ سرے سے زیر بحث ہی نہ تھا کہ علی اور معاویہ میں خلافت کا حقدار کون ہے بلکہ قضیہ زیر بحث یہ تھا کہ عثمان کا خون ناحق تھا یا نہیں اور یہ کہ قاتلینِ عثمان سے اب کس طرح نپٹا جائے۔ جاحظ کی کتاب العثمانیة ہو یا الاسکافی کا جوابی بیانیہ، یہ سب تاریخ کی گروہی تعبیریں ہیں جس سے نفسِ مسئلہ پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ عثمان محض اس اعتبار سے خلیفۂ مظلوم نہیں کہ انہیں اپنوں کی موجودگی میں عین کرسیِ خلافت پر شہادت سے سرفراز ہونا پڑا۔ جیتے جی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں نے ان کی شبیہ کو اس قدر متاثر کر دیا کہ بہت سے کبار صحابہ بد دل ہو کر بیٹھ گئے۔ آنے والی صدیوں میں بدگمانیوں اور گمراہ کن بیانات کی دھند مزید گہری ہوتی گئی'۔

کیا مطلب؟ مصنف آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ کتاب البدع کی ان سطروں نے میرے تجسس کو اتنا

مہمیز کر دیا کہ میں اب ہر حال میں اگلے صفحہ کو پڑھنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ صفحات کی بوسیدگی کے آگے بے بس تھا۔ البتہ چند صفحات کے بعد عبارت کسی قدر واضح تھی۔ لکھا تھا: 'قتلِ عثمان کے محرکات میں تعطیل حدود اللہ کا بیان صورتِ حال کی سچی تصویر کشی نہیں کرتا۔ یہ کہنا کہ ہرمزان کے قتل کے معاملہ میں عبداللہ ابن عمر پر حد نہ عائد کرنا اور عثمان کا اپنی حبیب خاص سے خوں بہا ادا کرنا یا کوفہ کے گورنر ولید بن العقبہ پر شراب نوشی کے الزام کو نظر انداز کر دینا یا سعد کے نام عثمان کے فرضی خط کا برآمد ہونا اور پھر اس کے نتیجہ میں باغیوں کا مصر واپس جاتے ہوئے مدینہ کو لوٹ آنا یا کوفہ، بصرہ اور شام سے آئے ہوئے جتھوں کا اپنی شکایات کے ازالے کے لیے ان الحکم الا للہ پر اصرار کرنا یا ہاشمیوں اور انصار کی عمومی بددلی جو اموی شاخ کے غیر معمولی عروج اور دوسرے گروہوں کے حاشیہ پر چلے جانے کے سبب ہوئی تھی، یہ ساری باتیں جزوی محرکات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ دراصل عثمان نے ایک ایسا انقلابی اور غیر معمولی قدم اٹھایا تھا کہ جس نے مسلسل پھیلتی ہوئی نظری سرحدوں اور بے قابو ہوتے ہوئے مسلم معاشرے پر ایک ایسی سخت لگام لگائی کہ اس کے جھٹکے میں ان کی اپنی جان تو چلی گئی البتہ اسلام کا نظری سرمایہ ہمیشہ ہمیش کے لیے محفوظ ہو گیا'۔

مدینہ میں کیا ہوا تھا

'کاش کہ کوئی محقق جمع قرآن کے حوالے سے اس دور کی تاریخ مرتب کر دیتا۔ عثمان جامع قرآن ہیں لیکن ان معنوں میں نہیں جیسا کہ گمراہ کن روایتیں باور کراتی ہیں۔ قرآن تو عہد رسولؐ سے ہی کتابی شکل میں محفوظ چلا آتا تھا۔ ذالك الكتاب لاريب فيه پتھروں، ہڈیوں اور چرمی جھلّیوں کے منتشر مجموعوں کا نام نہ تھا۔ البتہ عثمان نے اپنے عہد میں مصحف امام یعنی رسول اللہ کی نگرانی میں تیار کردہ نسخے سے مستند نقلیں تیار کروائیں اور پھر انھیں مختلف بلاد وامصار میں سرکاری طور پر اس ہدایت کے ساتھ ارسال کیا کہ کتاب اللہ کی نشر و اشاعت میں اس مستند نسخہ سے مدد لی جائے۔ عہد عمر سے ہی اسلامی ریاست کی سرحدیں وسیع ہوتی جاتی تھیں، مختلف بلاد وامصار میں اصحاب رسول کی نقل مکانی اور ان کی سکونت کے سبب یہ حضرات مفتوحہ علاقوں میں مرجع الانام بن گئے تھے۔ قرآن مجید کی قرأت وفہم کے حوالے سے عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، سالم مولیٰ ابوحذیفہ، معاذ بن جبل اور اس جیسے دسیوں نام اپنی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے پاس قرآن مجید کے اپنے تیار کردہ نسخے تھے اور بعض کے پاس بعض اجزاء۔ ابن مسعود کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے اپنے مصحف میں ستر سورتیں راست رسول اللہ سے سن کر لکھی ہیں۔ ابی بن کعب کا اپنا نسخہ تھا اور ان نسخوں پر جا بجا ان

حضرات نے اپنی سہولت کے لیے کچھ نشان اور علامتیں بھی بنا رکھی تھیں۔ قرآن مجید کے عالم کی حیثیت سے قرّاء حضرات کی سماجی قدر و منزلت میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پھر جن لوگوں نے رسول اللہ سے راست قرآن کی تعلیم حاصل کی ہو یا جنھیں دعویٰ ہو کہ انھوں نے رسول اللہ کو کسی خاص حصہ کو سنانے کا شرف بھی حاصل کیا تھا ایسے اساطینِ فن کا سماجی دبدبہ مقامی حکمراں، حتیٰ کہ خلافت کے مرکزی عاملین سے بھی، کہیں زیادہ ہو گیا تھا۔ جس کتاب نے یہ نئی دنیا بنائی تھی اس کے شارحین کی حیثیت سے ان اساطین صحابہ اور ان کے شاگردوں کی یہ سماجی قدر و منزلت فطری تھی۔ خیر کم من تعلّم القرآن و علّمه کی اس فضا میں اگر معاملہ صرف اتنا ہی ہوتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ ہوا یہ کہ تعلیم قرآن کے یہ مختلف حلقے اختلافِ قرأت کا شکار ہونے لگے۔ ابن مسعود کے مصحف میں یوں ہے اور ابی بن کعب کے مصحف میں یوں لکھا ہے، ابو درداء اس طرح پڑھتے ہیں۔ تعلیم قرآن کے مختلف دبستان اختلاف قرأت کی اس مسلسل بڑھتی لَے کے سبب ایک نئے فتنہ کی خبر دے رہے تھے۔ حذیفہ بن یمان نے، جو خود اس نازک صورتحال کا مشاہدہ کر آئے تھے، حضرت عثمان سے اس سلسلے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ عثمان نے زید بن ثابت کی سربراہی میں ماہر نقل نویسوں کی اک ٹیم بنا دی اور اس طرح دیکھتے دیکھتے مختلف بلاد و امصار میں قرآن مجید کی تصدیق شدہ سرکاری نقلوں کی دستیابی ممکن ہو گئی۔ خلیفہ نے ان نسخوں پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ جس کسی نے بھی اپنے طور پر جو کچھ قرآن سے لکھ رکھا ہو اسے تلف کر دے۔ ابی بن کعب اور ابن مسعود جیسے لوگوں سے خاص طور پر مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنا مصحف حکومت کے حوالے کر دیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان حضرات کی سماجی مقبولیت اپنے تیار کردہ اسی مصحف کے حوالے سے قائم تھی۔ گو کہ یہ سرکاری مصحف سے کچھ مختلف نہ تھا لیکن یہ حضرات اپنے مصحف سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ اس بارے میں بعض کبار اصحاب پر سختی بھی کی گئی۔ ابن مسعود سے خلیفۂ وقت اتنے نالاں ہوئے کہ انھیں مسجد سے نکلوا دیا اور اس دھکا مکی میں ان کی پسلیوں کی دو ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ حضرت عائشہ نے صحابۂ رسولؐ کے ساتھ اس برتاؤ پر احتجاج بھی کیا لیکن عثمان جانتے تھے کہ امت کے اجتماعی مفاد کے آگے کسی شخص کی ذاتی تعظیم و تکریم چنداں اہمیت نہیں رکھتی خواہ وہ صحابیِ رسول ہی کیوں نہ ہو۔ افسوس کہ عثمان کے اس عظیم کارنامہ کا اب تک خاطر خواہ ادراک نہیں کیا جا سکا ہے۔ وہ جامع قرآن ان معنوں میں نہیں کہ انھوں نے منتشر اوراق کو ایک مدون کتاب کی حیثیت سے جمع کیا بلکہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کی عصمت پر منڈلاتے ہوئے ممکنہ خطرات کا اس کمال حکمت کے ساتھ استیصال کیا کہ آنے والی

صدیوں میں اختلاف قرأت کی تمام روایتیں مصحف سے باہر جاپڑیں۔ایسا کرنے میں انھیں بعض کبار اصحابِ رسول کی ناراضگی مول لینی پڑی۔دراصل عثمان کے اس ایک اقدامی عمل نے درسِ قرآن کی ان شخصی مجلسوں کو اچانک بے رونق بنادیا تھا۔کبار صحابہ اور قرّاء کے حلقوں کا اس صورتحال پر بلبلا اٹھنا فطری تھا'۔

میرے لیے یہ باتیں بڑی چشم کشا تھیں۔کیا واقعی عثمان کو جمع وتحفیظ قرآن کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔مجھے ابوموسیٰ اشعری کے حوالے سے وہ مجلس یاد آئی جب انھوں نے بصرہ کے تین سو قاریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگ بصرہ کے بہترین ساکنین میں ہو،تم کوئی اور نہیں بلکہ قرّاء ہو سو قرآن کی تلاوت کرتے رہو لیکن یادرہے! ایسا نہ ہو کہ تمہاری کثرتِ تلاوت سے تمہارے دل سخت ہو جائیں جیسا کہ تم سے پہلوں کے ہوئے تھے۔ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جو اپنی طوالت میں سورہ براءۃ کی طرح تھی لیکن وہ مجھ سے بھلادی گئی اب اس کی صرف ایک ہی آیت یاد ہے:

لو كان لابن آدم واديان من مال لابتغى واديا ثالثاو لا يملاجوف ابن آدم الا التراب۔ ويتوب الله على من تاب۔

(رواہ مسلم وترمذی)

یا ترمذی میں ابی بن کعب سے مروی یہ مفروضہ آیت: ان ذات الدين عند الله الحنيفية المسلمة لا اليهودية ولا النصرانية ۔ من يعمل خيرا فلن يكفره۔ یا مسلم میں خمسہ رضعات کی مفروضہ آیت کا ذکر یا بخاری میں آیت رجم (الشيخ والشيخة اذازنيا فارجموهماالبتة) کے نزول کا تذکرہ جو اب مروجہ مصحف عثمانی میں نہیں پائی جاتی،ان روایتوں کے پس منظر میں دیکھیے تو تحفیظِ قرآن کے حوالے سے خلیفہ عثمان کے اس انقلابی اقدام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

خلیفۂ محصور کی بے بسی کے ایام میں مصری باغیوں کے علاوہ بصرہ اور کوفہ سے قرّاء کے مختلف جتھے بھی آئے تھے۔کوفہ کے قرّیٰ کا تذکرہ مختلف مصادر میں موجود ہے۔تب میرے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ جن لوگوں کی زبانیں تلاوت قرآن سے تر رہتی ہوں بھلا وہ اتنی بڑی تعداد میں خلیفۂ وقت کی مخالفت میں کیوں کر کھڑے ہوگئے۔میری طرح پہلے بھی بعض متلاشیوں کو یہ سوال پریشان کرتا رہا تھا سو انھوں نے اس کی یہ توجیہہ کر لی تھی کہ کوفہ کے قرّاء شاید اہل قریہ ہونے کے سبب قرّا کہے جاتے ہوں، اہل قریہ بمقابلہ اہل البادیہ۔حالانکہ کوفہ ایک نوآبادیاتی (garrison town) بستی تھی پھر وہاں اس تقسیم کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں

آتی۔ان روایتوں کے بین السطور اور دوسرے تاریخی مصادر سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ کوفہ، بصرہ اور شام کے مختلف علاقوں میں تعلیم قرآن کے حوالے سے ایسے غیر فہیم حضرات کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا تھا جن کے دل بقول ابوموسیٰ اشعری (جو خود کوفہ کے گورنر بھی رہے) کثرت تلاوت نے سخت کر دیئے تھے۔ یہی لوگ تھے جو عثمانؓ پر تعطیل حدود اللہ کا الزام لگا رہے تھے اور ان ہی کے حلقہ سے صفین کے موقع پر ایک ایسے متشدد گروہ کا ظہور ہوا جن کی تلواروں کی جھنکاریں ان الحکم الاللہ کی صداؤں سے معمور تھیں اور جنھیں بعد کے مورخین نے خوارج کے نام سے موسوم کیا۔

حضرت عثمان کی کاوشوں سے قرآن مجید تو اختلافِ متن اور اختلاف قرأت کے فتنے سے بچ گیا اور ابی بن کعب، ابن مسعود، ابودرداء اور ان جیسے درجنوں اصحابِ فضیلت کے شخصی نسخے دنیا سے ناپید ہو گئے البتہ آگے چل کر خبر احاد کی روایتوں نے اختلافِ فہم وقرأت کی ایک طرح ڈال دی۔ روایت کی کتابوں میں حدیث کے نام پر اور تفسیری حواشی میں نسبتاً غیر ثقہ روایوں پر اعتماد کرتے ہوئے نزلت ھکذا کی لَے کچھ اس طرح بلند ہوئی کہ ایک طالب صادق کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ قرآن کی کوئی مخصوص آیت واقعتاً کس طرح اتری تھی، عریضہ اخیرہ سے پہلے وہ کس طرح پڑھی جاتی تھی اور یہ کہ اس کا واقعی سیاق وسباق کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سوادِ اعظم کے لیے خلیفۂ عثمان کا فراہم کردہ سرکاری نسخہ کافی وشافی ثابت ہوا لیکن اہل علم اس کرید سے باز نہ آئے کہ کس کے نسخہ میں قرآن کی کون سی آیت کیسے پائی جاتی تھی۔ وہ اس التباس فکری میں مبتلا ہو گئے کہ عامّہ کے لیے ان باتوں کا جاننا کچھ ضروری نہیں البتہ خاصہ (اہل علم) پر لازم ہے کہ انھیں قرآن مجید کی مختلف قرأتوں اور ناسخ ومنسوخ کی مکمل بصیرت ہوتا کہ وہ ان اضافی معلومات سے احکامِ قرآن کی تدوین میں مدد لے سکیں۔ امام مالک نے نخعی ابن نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) اور امام شافعی نے عبداللہ ابن کثیر (متوفی ۱۲۰ھ) کی قرأتوں پر اعتماد کیا۔ شافعی نے الرسالہ میں اس خیال کا اظہار کیا کہ خواص کے لیے اس خبرِ احاد کا جاننا ضروری ہے جو ثقہ ذرائع سے ہم تک پہنچی ہو: وھذا لازم لا ھل العلم ان یصیروا الیہ۔

علم خاص کی تلاش میں ہمارے اہل علم نے اب ان مسائل کو جنم دیا کہ مــــالك یوم الدین پڑھا جائے یا ملك یوم الدین۔ سورۃ بقرہ کی دسویں آیت میں یکذبون پڑھا جائے یا یــــکذّبون۔ اس طرح کی دسیوں بحثیں ان اساطین فن نے پیدا کر دیں۔ علم خاص کی تلاش میں وہ ان وادیوں میں جا نکلے جن کے یکسر استرداد سے رسول اللہ کا مصحف امام عبارت تھا اور جس کی مستند نقلوں کی اشاعت کا التزام حضرت عثمان نے کچھ

اس شان سے کیا تھا کہ کم از کم آنے والی ایک صدی نزلت ھکذا کی گونج سے خالی رہی۔ آگے چل کر قرآن مجید کے حوالے سے اس کی عصمت پر حملہ کرنے والی روایتیں جس کثرت سے شائع ہوئیں اور سبع احرف اور قرأت عشر جیسے لطائف جس طرح علوم قرآن کا مدار بنے، التباس فکر و نظر کی ان فتنہ سامانیوں کو اگر نگاہ میں رکھئے تو حضرت عثمانؓ کے جمع و تحفیظِ قرآن کے کام کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھ پر حیرت و استعجاب کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے شوقِ تجسس میں ایک بار پھر مصنف کا حال جاننا چاہا لیکن اس کے علاوہ اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ کسی نیشاپوری کی تصنیف ہے اور یہ کہ اس کا عہدِ تالیف سقوط بغداد سے کچھ پہلے کا ہے۔ لکھا تھا: 'مستنصریہ مدرسہ کا قیام ایک اچھی کوشش ہے جہاں بیک وقت چاروں فقہی مسالک کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ کاش کہ جدال فقہی کے ان فتنوں کو اسی وقت روک دیا جاتا جب وہ دین کے قالب میں منقح ہو رہے تھے۔ ہم نے اس وقت صورتحال کی نزاکت کا احساس کیوں نہ کیا جب اشعری عالم ابونصر القشیر ی نے ۱۰۶۷ء میں نظامیہ بغداد میں شعلہ افشانی کے جوہر دکھائے تھے۔ حنابلہ ان کی تقریر سے تحریک پا کر شوافع پر کچھ اس طرح ٹوٹ پڑے تھے کہ پورا بغداد لہولہان ہو گیا تھا۔ اور پھر چند ہی سالوں بعد ۱۰۸۲ء میں اشعری عالم البکر ی نے اپنی نفرت آمیز تقریروں سے بغداد کا ماحول گرم کر دیا تھا۔ پھر تو یہ ہوا کہ اس جدال فقہی کے خاتمے کی ہر کوشش مزید اختلافات کو جنم دیتی رہی۔ ۱۰۹۱ء میں نظام الملک نے شوافع اور حنابلہ کے درمیان ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا تا کہ خدا کی ذات و صفات پر جو ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کا تصفیہ ہو سکے لیکن فریقین کسی علمی گفتگو کے عادی نہ تھے سو حنابلہ نے یہ کہہ کر مذاکرے کی دعوت ٹھکرا دی کہ جو لوگ سرکار دربار سے تعلق رکھتے ہوں انھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے ایمان کا محاسبہ کریں'۔

مصنف اس صورتحال پر سخت کبیدہ خاطر تھا کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ ایسی ایسی بحثیں مدارِ دین سمجھی جانے لگی ہیں جن کا صدر اول میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لکھا تھا: 'حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے زمانے میں دین حنیف کی شکل کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ کوئی معتزلی ہے تو کوئی اشعری، کوئی حنبلی ہے تو کوئی شافعی، کوئی ظاہری ہے تو کوئی حنفی، نہ جانے دین کی اتنی مختلف اور متحارب شکلیں کہاں سے نکل آئیں۔ اہل تصوف کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ انھوں نے اپنے مختلف طرق نہ جانے کہاں سے کشید کر لیے ہیں۔ درگاہیں، خانقاہ اور زاویے جن کا صدر اول میں کوئی وجود نہ تھا آج اطراف و اکناف میں قائم ہو رہے ہیں اور انہیں سلاطین کی پشت پناہی

حاصل ہے۔ ان کے متولیان کے لیے بڑے بڑے اقطاع کے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ دین کے نام پر طلب دنیا کے اس سے مکروہ مظاہرے اور کیا ہوسکتے ہیں'۔

حیرت ہوئی کہ سقوط بغداد سے پہلے اصحاب علم کے ایک طبقہ میں صورتحال کی سنگینی کا اتنا واضح شعور موجود تھا گویا اہل نظر پر یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ عباسی خلافت اپنے فکری تضادات اور نظری تشتت کے بوجھ تلے اب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ بقول مصنف 'من حیث الامت آج ایک بے سمتی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ پندرہویں شعبان کی رات کو مسجدیں بھری ہوتی ہیں۔ رجب کی پہلی شب جمعہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مسجدوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ الرغائب، صلوۃ التراویح اور ان جیسی دسیوں قسم کی تراشیدہ عبادتوں میں عوام کا ذوق وشوق دیدنی ہے۔ علماء عوامی جوش وخروش کے آگے بے بس ہیں۔ انھوں نے اس صورتحال کو بدعت حسنہ سے تعبیر کر رکھا ہے۔ ایوبی حکمراں جنھیں دین کے مصالح کا کچھ شعور نہیں، ان عوامی جوش وخروش میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ کسی نے مسند ابن حنبل کے درس کی کفالت کا ذمہ لے رکھا ہے تو کوئی کسی خاص فقہی مدرسے کی سرپرستی کر رہا ہے۔ اس صورتحال نے امت میں ایک نظری محاربے اور مصنوعی دینداری کو فروغ دیا ہے'۔

کتاب کا ایک حصہ واقعات و مذکرات پر مشتمل تھا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر افسوس کہ اوراق کی بوسیدگی اور جابجا روشنائی پھیل جانے کے سبب بات کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئی۔ بس اتنا اندازہ ہوا کہ مصنف زنگی اور ایوبی حکمرانوں کی اسلام پسندی کا سخت شاکی ہے۔ لکھا تھا: 'ایوبی اور زنگی حکمرانوں نے مقبروں اور خانقاہوں کی ایک ایسی ثقافت کو فروغ دیا ہے جو اسلام کی اصل حیات بخش روح کے مغائر ہے'۔ بقول مصنف: ملک الظاہر کے ایک ملازم کو حلب کے ایک ویران مقبرے پر قس بن ساعدۃ کی قبر کا گمان ہوا۔ دیکھتے دیکھتے یہ جگہ مشہد روحین کی زیارت گاہ میں بدل گئی اور اب صورتحال یہ ہے کہ یہاں زائرین کی آمد کا تانتا بندھا ہے۔ ذکر وتلاوت کا سلسلہ جاری ہے۔ حکمرانوں کی نااہلی، علماء کی بے توفیقی اور خلافت کے اضمحلال نے دین مبین کی شکل وصورت مسخ کر دی ہے۔ اے کاش کہ کوئی اس صورتحال پر بند باندھ سکتا'۔

۱۴

ع م س

کتـــاب البـدع کی ورق گردانی نے مجھ پر شوق و انبساط کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ مخطوطات کے اس ڈھیر میں بعض کتابیں، زبان کی اجنبیت کے سبب، میرے لئے نا قابل فہم تھیں۔ لاطینی اور قدیم جرمن طرزِ تحریر سے میں واقف نہ تھا سو اپنی کم مائیگی پر بڑا افسوس ہوا۔ میز کی دوسری جانب جہاں خالی کرسی کے سامنے چند منتشر اوراق پڑے تھے، ایک سنہری چرمی جلد والی کتاب پر نگاہ اٹک کر رہ گئی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر رک گیا۔ ارے یہ کیا؟ یہ تو کتـاب المجموع ہے، علوی نصیری فرقے کی معتبر ترین کتاب۔ اعلیٰ قسم کے رنگین بارڈر سے مزین پوری کتاب خطاطی کا دلکش نمونہ تھی۔ پہلی سورۃ الاول کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی: 'قـد افـلـح، مـن اصبـح، بولاية الاجلح ...... سرسری طور پر چند صفحات الٹے، اگلے صفحہ کے سر نامے پر خوبصورت محرابی خانے میں لکھا تھا: السوره الخامسة و اسمها الفتح جو اس طرح شروع ہوتی تھی:

اذا جاء نصر الله والفتح و رایت الناس یدخلون فی دین الله افواجا، فسبح بحمد ربك واستغفره انـه كان توابا، اشهد بان مولائی امیر النحل علی اخترع السید محمد من نور ذاته وسمّاه اسمه ونـفسـه و عـرشـه و كـرسيـه وصفاته، متّصل به ولامنفصل عنه ولا متصل به بحقيقة الاتصال، ولامنفصل عنه فی مباعدة الانفصال، متصل به بالنور، منفصل عنه بمشاهدة الظهور۔

سلیمان آفندی کی البـاكورة السـليـمانية کا نام تو میں نے پہلے بھی سنا تھا مگر مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ کتـاب الـمجموع اپنے لب و لہجے میں وظائف کی مجہول کتابوں سے اس قدر ملتی جلتی ہوگی۔ ابتداً قرآن مجید کی ایک آدھ آیت اور پھر مقفیٰ اور مجہول عبارتوں کا ایک ایسا سلسلہ جو وحیِ ربانی کی بنیادی دعوت کی نفی سے عبارت ہو۔ طرفہ یہ کہ اس قسم کی تمام گمراہ کن تالیفات جو درحقیقت وحیِ ربّانی کے استہزا یا پیروڈی کے طور پر

لکھی گئی ہیں معصوم مریدوں کو اس التباسِ فکری میں مبتلا رکھتی ہیں گویا کوئی مجرب نسخہ، کوئی سرِ الاسرار ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ سورۃ السلام کی عبارتوں سے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی تھی:

سجدت و سلّمت و وجّهت وجهی لفاطر السماوات و الارض حنیفا مسلما و ما انا من المشرکین، بدا السلام من المعنی القدیم، علی الاسم العظیم، و سلّم الاسم العظیم، علی الباب الکریم، و سلّم الباب الکریم، علی الخمسه الایتام ارکان الدنیا و الدین ......

دسویں سورۃ العقد مختصر مگر کہیں مقفی تھی:

اشهد ان اللہ حقّ و قوله حقّ و انّ الحقّ المبین، علیّ بن ابی طالب الانزع البطین، و النار مسوّی للکافرین، و الجنّة روضة للمومنین، و الماء من تحت العرش یطوف و فوق العرش رب العالمین، و حمّالة العرش الثمانية الکرام الذین هم الیه مقرّبون، عدّتی فی شدّتی وعدّہ کافّة المومنین، سرّ عقد ع م س۔

ابھی میں کتاب المجموع کی تلاوت سے لطف اندوز ہی ہو رہا تھا کہ باہر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ آدھی رات میں بورل کی سنسان لائبریری میں مطالعہ کے لیے آخر کون آتا ہے اور یہ کس کی کتابیں ہیں جو اس طرح بے ترتیب یہاں پڑی ہیں، یہ سوال پہلے ہی میرے لئے معمّہ تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ جلابیہ میں ملبوس ایک طویل القامت، روشن چہرے اور تیکھے نقوش والا شخص اپنے ہاتھوں میں کچھ کتابیں اور کاغذات سنبھالے چلا آرہا ہے۔ رات کے سناٹے میں اس شخص کی اچانک آمد سے پہلے تو کچھ وحشت سی ہوئی۔ سر سے پیر تک کا ڈھیلا ڈھالہ جلابیہ اور پیچھے گردن سے لٹکتی ہوئی منقش ٹوپی جیسے اساسین کی پراسرار کہانیوں کا کوئی کردار ہو۔ قریب آئے تو سلام کی آواز ابھری۔ بڑی خوش اخلاقی اور کسی قدر حیرت سے فرمایا: ارے آپ اور یہاں مرحبا مرحبا اور پھر تیسری بار مرحبا کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں حیران و پریشان تھا، یہ حضرت کچھ دیکھے دیکھے سے تو لگ رہے تھے مگر ان سے کہاں ملا ہوں یہ یاد نہ تھا۔ بولے: کئی بار آپ سے ملاقات کا خیال آیا مگر دن میں مطبخ کی مصروفیت حائل رہی۔

اچھا تو یہ وہی صاحب ہیں جنھیں کئی بار سوٹ اور ٹائی میں ملبوس مطبخ سے گزرتے ہوئے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اب جو انھیں مشرقی لباس میں کتابوں سے لدا پھندا دیکھا تو بیک نظر پہچاننا مشکل ہو گیا۔ کہنے لگے مجھے رات میں ہی تھوڑا وقت ملتا ہے اور بورل کے اس دارالمطالعہ میں بڑا سکون ہے۔ اتنی بلندی پر

ایٹک (attic) میں عام زائرین اس لیے بھی نہیں آتے کہ لکڑی کے یہ زینے بظاہر بڑے مخدوش دکھائی دیتے ہیں اور اگر اسی دوران کوئی پرندہ ان راہداریوں سے گزر جائے تو زائران بوسیدہ زینوں پر متوحش ہو کر رہ جاتا ہے لیکن کاسل کا اصل لطف تو ایٹک ہی میں ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے دائیں جانب ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ خنک ہواؤں کی ایک ہلکی سی سرسراہٹ کمرے میں داخل ہوئی اور قلب و جاں کو ایک سرور آمیز کیفیت سے دوچار کر گئی۔ بولے جب مطالعہ سے تھکن کا احساس ہونے لگے تو اس کھڑکی کو تھوڑی دیر کے لیے کھول دیجئے۔ یہ پھر سے آپ کو کام کے لیے تازہ دم کر دے گی۔ یہ کہتے ہو وہ اس خالی کرسی پر براجمان ہو گئے جس کے گرد کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ابھی اس عقدہ کو حل نہ کر پایا تھا کہ دن کا باورچی رات کا عالم کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے دن کے مجاہد اور رات کے عابد کے قصے تو سن رکھے تھے مگر میرے لیے دن کے باورچی کو رات کے اس پہر سنجیدہ اور ادق علمی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ کیا طباخی بھی کوئی حجاب ہے جس کے پیچھے ان صاحب نے اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے؟

اب جو گفتگو آگے بڑھی تو پتا چلا کہ ان حضرت کا نام سلیمان ہے اور لبلیانہ میں کافی اینڈ گرل (Coffee & Grill) کے نام سے یہ ایک بڑا ریستوراں چلاتے ہیں اور یہاں کانفرنس میں خورونوش کی تمام تر ذمہ داری ان کے ریستوراں نے ہی لے رکھی ہے۔ عمر یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کے لپیٹ میں ہوگی۔ چہرہ روشن روشن، گفتگو وقار و اعتبار سے مزین جس پر گاہے بہ گاہے مسکراہٹوں کے طلوع سے یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت میں خشونت اور حتمیت کا آمیزہ ذرا کم کم ہے اور وہ متبادل نقطۂ نظر کو یکسر مسترد کرنے کے قائل نہیں۔ بغیر کسی تمہید کے ایک کتاب اپنے تھیلے سے نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ذرا اسے دیکھئے اور بتائیے کہ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کتاب پر ایک نگاہ ڈالی، الٹ پلٹ کر دیکھا، نام تھا کتاب الاقدس لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ آخر وہ اس کتاب پر میری رائے کیوں جاننا چاہتے ہیں۔ بولے آج کل لبلیانہ میں بہائی فرقہ کی تبلیغ زوروں پر ہے۔ کیا کہتے ہیں اس بارے میں آپ؟ نزول قرآن کے بعد آنے والی وحی کے بارے میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہیے۔ کیا یہ لوگ اہل کتاب کے زمرے میں آئیں گے یا ہمارے ملی دائرے سے باہر جا پڑے ہیں؟

یہ سوال یقیناً بڑا اہم ہے مگر آپ اجازت دیں تو اس سے پہلے آپ سے ایک بات پوچھوں۔

ہاں کیوں نہیں، ضرور!

یہ جو کتاب المجموع کا نسخہ یہاں رکھا ہے یہ تو بڑی نادر کتاب ہے یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟

میرے اس سوال پر پہلے تو وہ مسکرائے پھر ایک قہقہہ بلند کیا اور پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی جیسے ان میں یادوں کے دیپ جل اٹھے ہوں۔ بولے یہ قصہ ذرا طویل ہے، پھر کبھی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر میرے قریب پڑی ہوئی کرسی پر آ بیٹھے۔ میز سے کتاب المجموع کا نسخہ اٹھایا، آخری صفحہ پر جہاں تاریخ کتابت تحریر تھی دکھاتے ہوئے بولے۔ دیکھئے یہ کتنا قدیم نسخہ ہے ۹۳۰ ہجری۔ پانچ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس مخطوطہ کی آب وتاب اسی طرح باقی ہے۔ بڑی کہانیاں جڑیں ہیں اس کتاب سے، میرے لیے پرکھوں کی باقیات میں یہ سب سے قیمتی متاع ہے۔ آپ نے کتاب المجموع کا ذکر چھیڑ کر بہت سی خوابیدہ یادوں کو جگا دیا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب شیوخ کی مجلس میں بیٹھ کر معرفت کا گمان ہوتا۔ حلقۂ خواص میں داخلہ، سرالاسرار کی واقفیت اور کتاب المجموع، کتاب المشائخ، کتاب تعلیم الدیانہ النصیریۃ کے مطالعہ میں منہمک رہتا لیکن پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا کہ قسمت نے یاوری کی اور میرا داخلہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں ہو گیا۔

کیا مطلب، تو کیا پہلے کبھی آپ فرقۂ نصیریہ کے اثر میں بھی رہے ہیں۔

بولے: اثر میں نہیں، میں تو ان کے مرکز میں پلا بڑھا، شیوخ کی مجلسوں میں میری تربیت ہوئی لیکن طبیعت میں ابتداء سے ہی تجسس اور تعقل کا غلبہ تھا، سو کہیں چین سے ٹک نہ پایا اور آج نصف شب کی تاریکی میں بورل کے اس اساطیری قلعہ میں قدرت مجھے نہ جانے کیوں لے آئی ہے اور نہ جانے کیوں نئے نئے سوالات میرے تعاقب میں رہتے ہیں یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک سرد آہ بھری۔ جیسے اپنی طالب علمانہ تجسس کو پُر سا دے رہے ہوں، پھر اپنی مرکزی کرسی پر آ بیٹھے۔ تھیلے سے ایک پرانی ڈائری نکالی اور اس کے اندرونی سرورق پر چسپاں تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے: میرے ایام شباب کی اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھئے بہت سی باتیں خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔

تصویر کیا تھی کھلے آسمان کے نیچے پگڑی نما ٹوپیوں میں پندرہ بیس مشائخ نصف دائروی شکل میں کرسیوں پہ براجمان تھے۔ ان کی سفید داڑھیاں غیر معمولی طور پر طویل تھیں۔ مشائخ کی اس مجلس میں ایک منحنی سا نوجوان ہاتھ میں کسی مشروب کا گلاس پکڑے اپنے سر پر ایک ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھا۔ بولے یہ عین

ایام شباب میں حلقۂ خواص میں میرے داخلہ کی تصویر ہے، اس مرحلہ تک پہنچنے میں لوگوں کی ایک عمر گزر جاتی ہے میرے لیے اس کم عمری میں یہ ایک بڑا اعزاز تھا اگر میں اسی راستہ پر چلتا رہتا تو شاید آج کبار مشائخ میں میرا شمار ہوتا اور کم از کم دمشق کی سیاست میں میری بڑی اہمیت ہوتی۔

سلیمان کی ان باتوں سے مجھے یک گونہ حیرت ہوئی۔ اب مجھے ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ یہ حضرت جنھیں میں اب تک بلقانی مسلمان کی حیثیت سے جانتا تھا، نصیری فرقہ کے اہم رکن رکین نکلے۔ دل میں خیال آیا مگر یہ تو خود کو مسلمان کہتے ہیں اور ابھی مابعد قرآن وحی کے حوالے سے بہائی فرقہ کی کتاب الاقدس پر میرا نقطۂ نظر جاننا چاہ رہے تھے، ان کی باتوں میں ایک علمی رنگ بھی ہے، تلاش اور جستجو بھی مگر دن میں یہی صاحب سوٹ اور ٹائی میں ملبوس کافی اینڈ گرل کے مالک کی حیثیت سے مطبخ کا چکر لگاتے نظر آتے ہیں، عجیب تہہ دار ہے ان کی شخصیت۔ شاید یہ پرتیں آہستہ آہستہ کھلیں، سو یہ سوچ کر میں نے پوچھا آپ تو غالباً کبھی بوسنیا میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس تصویر میں آپ علوی نصیری فرقہ کے ایک بطل جلیل کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جنھیں اوائل عمری میں رسمِ شمولیت (initiation) کا مستحق سمجھا گیا۔ معاف کیجیے گا بات ذرا پیچیدہ ہوگئی ہے۔

یہ سن کر انھوں نے پھر ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ بولے نصیری حلقہ میں پیدا ہوا۔ بیروت کی رنگا رنگ اور سیکولر فضا میں غور و فکر کے طریقے سیکھے اور ان تین سالوں میں جب تک میں امریکن یونیورسٹی میں سیاسیات کا طالب علم تھا، اپنے اندرون میں پرورش پانے والے نصیری شیخ سے لڑتا رہا۔ بیروت بھی عجیب جگہ ہے۔ شرق و غرب، عیسائی مسلمان، نصیری دروزی، شیعہ سنی، لبرل اور قدامت پسند ہر طرح کے خیالات کا ایسا melting pot شاید دنیا میں کہیں اور نہ ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر کسی نے ایک دوسرے کو بخوشی انگیز کر رکھا ہے۔ دہشت گردانہ حملوں اور بارود کی مہک میں عیش و نشاط کی محفلیں کچھ اس طرح سجتی ہیں گویا اہل بیروت زندگی کو آخری قطرہ تک کشید کرنے کا ہنر جانتے ہوں۔

مگر لبنان میں تو نہر بوعلی کے ایک طرف شیعہ اور دوسری طرف سنی آبادی بستی ہے۔ پھر اسے آپ melting pot کس طرح کہتے ہیں۔

بولے یہ سب ظاہری تقسیم ہیں، بیروت کی اصل روح تو قہوہ خانوں اور رنگ و رباب کی مجلسوں میں بستی ہے۔ ان بے تکلف مجلسوں میں رنگ و نسل، فرقہ اور مذہب، زبان اور شہریت کے مصنوعی گھروندے

مسلسل ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں۔ بیروت کی ان ہی مجلسوں میں میرے اندر یہ خیال سرایت کر گیا کہ اگر موقع ملے تو ذرا قریب سے جامعہ ازہر کو دیکھا جائے کہ اس ادارہ سے ہمارے پرکھوں کی تاریخ وابستہ ہے اور اس کی بنا میں اسماعیلی خلافت کا عنصر شامل ہے۔ نصیری گوکہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے الگ سمجھتے ہیں لیکن فاطمی خلیفہ الحاکم کے حوالے سے وہ اپنے عظیم الشان ماضی سے اپنا تعلق ضرور بتاتے ہیں۔

تو کیا نصیری اب بھی من حیث الفرقہ ازہر کی باقیات کو اپنے ورثہ کے طور پر دیکھتے ہیں؟

بولے ورثہ تو نہ کہئے لیکن کہیں نہ کہیں ہمارے ذہنوں میں یہ بات ضرور ہے کہ ہم آج جو حاشیہ پر جا پڑے ہیں اور مخالفین کے سیاسی تسلط کے سبب اپنا ایمان چھپانے پر مجبور ہیں تو ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب فاطمی خلافت کے جاہ و حشم کے آگے بغداد کی عباسی خلافت اور اندلس کی اموی خلافت کی چمک ماند پڑ جاتی تھی۔ البتہ میرے لیے قاہرہ کا سفر صرف اپنی جڑوں کی تلاش کے سبب نہ تھا۔ جب میں لاذقیہ (Latakia) سے نکل کر بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں آیا اور مجھے مختلف الخیال لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا مجھ میں اپنے مذہبی عقائد کے سلسلے میں تحفظات پیدا ہوتے گئے۔ نصیری علوی، امتِ مسلمہ کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ملک شام میں ان کی آبادی دس بارہ فیصد سے زیادہ نہیں۔

مگر ترکی میں بھی تو ان کی ایک بڑی تعداد بستی ہے۔

میری اس مداخلت پر پہلے تو وہ کچھ چونکے پھر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے ارے بھئی ترکی علوی اور لوگ ہیں اور شامی علویوں کی بنا ہی الگ ہے۔ ترکی علوی دراصل حاجی بکتاش ولی کے مریدوں کا سلسلہ ہے۔ گوکہ علی کے حوالہ سے بعض چیزیں دونوں میں مشترک ہیں۔

پھر قاہرہ میں آپ پر کیا گزری؟

بولے ہاں میں کہانی کے اسی حصّے کی طرف آ رہا ہوں۔ بیروت میں قیام کے دوران میں اکثر سوچتا نصیری شیوخ کائنات کے اسرار و رموز اور اس کی سریت کے ادراک کا جتنا بھی دعویٰ کریں صدیوں سے ان کی ملی اور اجتماعی زندگی دبی کچلی حاشیہ پہ چلی آتی ہے، انھوں نے تقیہ اور کتمان کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ اب ان کے عوام کو اپنی اصل نظری اساس کا کچھ اندازہ نہیں۔ چونکہ فی زمانہ کسی قوم کے لئے پہاڑوں میں محصور ہو کر زندگی جینا ممکن نہیں سو میرے اندر خاص اپنے فرقہ کے حوالے سے بھی ایک تڑپ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ علوی نصیری ملی قیادت کے مرکزی اسٹیج پر موثر رول ادا کریں۔ یہ وہ محرکات تھے جو مجھے جامعہ ازہر تک لے گئے۔

تو کیا از ہر میں نصیری فرقہ کے لیے داخلوں کا دروازہ کھلا ہے؟ میرے اس معصومانہ سوال پر وہ مسکرائے۔ بولے: نصیریوں کے ہاں مذہبی شناخت کی حیثیت صرف ایک ظاہری لباس جیسی ہے، اصل چیز تو جسم ہے۔ لباس آپ کوئی سا بھی پہنیں آپ وہی رہتے ہیں سو آپ نصیری شناخت اختیار کریں یا سنی مسلمان کی حیثیت سے خود کو پیش کریں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لباس تو ضروری ہے نا!

اگر مذہبی شناخت کی بس اتنی حقیقت ہے تو خود نصیری حضرات ایک دوسرے پر کیسے آگاہ ہوتے ہیں؟

بولے اس کے لیے نصیریوں نے اپنی ایک علیحدہ لغت ایجاد کر رکھی ہے جس کا علم صرف خواص کو ہوتا ہے۔ ہم لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اس بات کی تصدیق کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مخاطب واقعی ہمارا ہم مذہب ہے یا نہیں تو اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے شہر یا محلّہ میں میرا ایک رشتہ دار ہے کیا تم اس سے واقف ہو۔ وہ پوچھتا ہے کہ اس کا نام کیا ہے؟ جواب ہوتا ہے الحسین۔ کون الحسین؟ اگر جواب میں ابن ہمدان آئے تو پوچھنے والا پھر پوچھتا ہے، اس کے آگے؟ اگر جواب آئے الخصیبی، تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص اپنا ہم قوم ہے لیکن محض اتنا امتحان کافی نہیں سمجھا جاتا۔ اگلا سوال ہوتا ہے کہ تمہارے چچا کب سے مہاجرت پر ہیں؟ اگر جواب آئے سولہ، تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص بھی محرم راز ہے۔ اور اگر تمہارے چچا پیاسے ہوں تو کیا کروگے؟ جواب ہوتا ہے: 'انھیں معرفت کے چشمہ سے سیراب کروں گا'۔ اور اگر ان کے قدم ریت میں دھنسنے لگیں تو تو تم کس جانب ان کی رہنمائی کروگے؟ معاویہ کے سانپ کی جانب۔ یہ اور اس طرح کے کچھ اور بھی سوالات ہیں جس سے حلقۂ خواص کے لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔

اور یہ سر عقد ع م س کیا ہے؟ میں نے سورۃ عقد کی آخری آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

بولے: یہی وہ عہد نامہ (covenant) ہے جس کے حوالے سے تعلیمات کے افشانہ کرنے کی قسمیں لی جاتی ہیں۔ ع سے علی، م سے محمدؐ اور س سے سلمان الفارسی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

اچھا تو سلمان الفارسی بھی نصیری عقائد کے تکون کا حصہ ہیں؟

جی ہاں! ع م س تو سمجھئے نصیری عقیدے کا ماحصل ہے۔ علی مظہر خدا ہیں بلکہ کہہ لیجئے کہ منصبِ خدائی پر فائز ہیں، محمدؐ کی حیثیت حجاب کی ہے اور سلمان وہ راستہ ہیں، تلاش وجستجو کا راستہ جس پر چل کر سالک فائز

مرام ہوسکتا ہے۔ ع م س نصیریوں کی شہادت ایمانی کا مخفف بھی ہے۔ ع م س کہیے یا مکمل کلمہ اس طرح ادا کیجیے:

اشھد ان لا الہ الا = حیدرۃ الانزع البطین
ولا حجاب علیہ الا = محمد الصادق الامین
ولا طریق الیہ الا = سلمان ذو قوۃ المتین

اور اگر آپ کسی نصیری کے ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر یہ کہیں کہ میں تمہیں امیر المؤمنین علی کے عہد کی قسم دیتا ہوں یا ع م س کے عہد کی قسم دیتا ہوں تو اس کا تقیہ ٹوٹ جائے گا اور وہ سچ بولنے پر مجبور ہو جائے گا۔

عجیب! یہ تو بڑے کام کی بات بتائی آپ نے۔ جی ہاں اور اگر واقعی اس سے سچ ہی بلوانا مقصود ہو تو اپنی انگلی لعاب دہن سے تر کر کے اس کی گردن پر رکھ دیں کہ میرا تمام گناہ تمہارے کھاتے میں چلا جائے گا اگر تم نے ع م س کے عہد کا بھرم نہ رکھا اور مجھے فلاں فلاں بات کی سچائی سے آگاہ نہ کیا۔

سلیمان کی گفتگو نے مجھ پر ایک نئی دنیا واشگاف کردی تھی۔ سرّیت کے ہالے میں گھرے نصیری فرقہ کے کسی مذہبی شیخ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی سو میں نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اچھا سرعقد ع م س اب یہ تو آشکارا کرہی دیجئے کہ آپ نے فی الوقت اسلام کی جونظری شناخت اختیار کر رکھی ہے اور جس حوالے سے آپ کئی سال تک امامت کے فرائض منصبی ادا کرتے رہے ہیں تو کیا یہ سب بھی تقیہ اور کتمان کا لباس ہے۔ میرے اس سوال پر وہ کچھ اچھل سے گئے اور اس بار زوردار قہقہہ کے ساتھ میز پر ایک دھپ بھی جمائی۔ بولے نصیری اتنی آسانی سے باز کہاں آئے گا۔ پھر اچانک بے حد سنجیدہ سے ہوگئے اور کسی قدر نمناک آواز میں بولے ہاں اپنا اسلام کچھ لباس ہی سا لگتا ہے۔ گاہے ایسا لگتا ہے جیسے اندر داخل ہوتے ہوتے رہ گیا ہو۔ شکلیں بھی تو بہت بدلی میں نے، لباس بھی تو بہت سے اختیار کیے۔ بیروت میں لبرل اور سیکولر علوی بنا رہا۔ قاہرہ میں سنی مسلمان بنا پھر سلفیت اختیار کی۔ بوسنیا میں اہل تشیع کے حلقوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ اور اس طویل سفر کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے جیسے متوارث اسلام کی طبع زاد خانہ سازیوں سے پیچھا ابھی نہیں چھوٹا ہے جیسے وحی کی تجلی بس ہاتھ آتے آتے رہ جاتی ہو۔

سلیمان کو اس طرح دلگرفتہ ہوتے دیکھ کر میں نے انھیں سہارا دینے کی کوشش کی۔ میں نے کہا دیکھئے تلاش کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ وہ سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں یا کم از کم منزل مقصود و مطلوب نہیں۔

بولے: مگر یہ سفر اب بہت طویل ہو گیا ہے بہت جانگسل ہے یہ سفر۔ میں جب بیروت میں تھا تو ایام طالب علمی میں ایسا لگتا تھا جیسے ہر لمحہ مجھ پر امکانات کی تجلیاں سایہ فگن ہوں جیسے ماورائے امکان بھی امکانات کے نئے راستوں کے در کھلتے جاتے ہوں۔ بیروت میں قیام کے دوران میرے غور وفکر کا محور نصیری فرقہ کی تجدید واحیاء تھا۔ قاہرہ میں میرے اندر نصیری عقائد کے سلسلے میں شبہات پیدا ہو گئے۔ بیروت میں میں لاذقیہ کی محصور دماغی اور تنگ نظری سے لڑتا رہا لیکن قاہرہ میں قیام کے دوران واضح طور پر یہ لگنے لگا جیسے نصیری عقائد اب میری تگ وتاز کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

قاہرہ میں ایسا کیا ہوا کہ آپ اپنا نظری توازن برقرار نہ رکھ سکے، میں نے تخصیص کے ساتھ جاننا چاہا۔

بولے از ہر میں مجھے پہلی بار سنی مآخذ ومراجع کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع ملا۔ ایک دن لائبریری میں جرائد کی ورق گردانی کے دوران مجھے شیخ شلتوت کا وہ فتوی ملا جس میں انھوں نے بڑی وسعت قلبی کے ساتھ اہل تشیع کو پانچویں مستند مکتب یعنی فقہ جعفریہ کا حامل بتایا تھا۔

مگر اس فتوی کا نصیریوں پر تو اطلاق نہیں ہوتا؟

میرے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث تھی کہ دین کی کسی مخصوص تعبیر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جم جانا اہل خرد کا شیوہ نہیں ہوتا۔ نئی تحقیق پرانے محاکموں کو رد کر سکتی ہے۔ پھر ہمارے نصیری شیوخ اپنی مذہبی تعبیرات کو بدلتے حالات میں از سر نو پیش کرنے سے کیوں گریزاں ہیں۔ آخر ہم مجرمین کی طرح اپنے عقائد کیوں چھپائے پھرتے ہیں۔ میں اس امر پر جتنا غور کرتا مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا کہ تقیہ اور کتمان پر مسلسل عمل پیرا ہونے کے سبب ہم نصیریوں کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس دوران چھٹیوں میں جب بھی میں اپنے وطن لاذقیہ جاتا کبار شیوخ سے اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوتی کہ نصیریوں کو یہ بات واضح کرنی چاہیے کہ مسلمانوں سے ان کا کوئی نظری تعلق ہے یا نہیں اور یہ کہ مستقبل کے نصیری منصوبے میں دروز، سنی اور شیعہ اثنا عشری فرقوں کو ہم کس حد تک اپنے منصوبے کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

پھر کیا نتیجہ نکلا ان مباحث کا؟ کبار شیوخ نے آپ کی فکرمندی پر کیا رخ اختیار کیا؟

بولے بہت جلد مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ مذہبی قیادت کسی داخلی یا خارجی مکالمہ کو اپنے لیے سمِّ قاتل سمجھتی ہے۔ صورتحال اتنی خراب ہو گئی کہ بعض شیوخ مجھے منحرف اور گمراہ سمجھنے لگے۔ لاذقیہ میں میری

واپسی اور وہاں فرقۂ نصیریہ کی مذہبی رہنمائی کے امکانات جاتے رہے۔ بلکہ ایک مرحلہ میں تو مجھے ایسا لگا کہ میری جان کو خود اپنوں سے خطرہ ہو۔

عجیب! مگر یہ آپ کا محض شدت احساس تو نہ تھا؟

محض شدت احساس نہیں، آپ نے سلیمان آفندی الادنی کا نام تو سنا ہوگا وہی الباکورة السلیمانیة کے مصنف جنھوں نے نصیری عقائد کو پہلی بار دنیا کے سامنے منکشف کیا تھا۔

جی ہاں بڑی دلچسپ کتاب ہے ان کی۔

بولے: پتا ہے کیا ہوا ان کے ساتھ! افشائے راز کے جرم میں انھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

پھر کیا کیا آپ نے؟ کیا نصیریوں کے تجدید واحیاء کے منصوبے کو خیر باد کہہ دیا؟

بولے اسے خیر باد کہنا تو مناسب نہیں ہاں یہ ضرور ہوا کہ ازہر میں قیام کے دوران میرے نظری چوکھٹے میں بعض بنیادی اور دوررس تبدیلیاں در آئیں۔ نصیری دراصل سنی مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور سنی، شیعہ، دروز، یہ سب نصیریوں سے اور پھر یہ سب باہم ایک دوسرے کے بارے میں نفرت وعناد کے جذبات رکھتے ہیں۔ قاہرہ میں سنی مآخذ کو پڑھتے ہوئے اور دوسرے مسلم فرقوں کے تراثی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھ پر یہ چیز منکشف ہوتی گئی کہ ان گروہوں کی علیحدہ نشاۂ ثانیہ ایک امر محال ہے۔ ان کے تار تاریخ وتراث میں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہیں کہ جب تک یہ سب فرقے بیک وقت اور باہم رضامندی کے ساتھ اجتماعی طور پر اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار نہ ہوں ان پر کوئی نئی صبح طلوع نہیں ہوسکتی۔

سلیمان کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ دفعتاً باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز نے فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ میں باہر نکلا۔ خیال آیا شاید کوئی نو وارد ہو جو اچانک پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ سے ڈر گیا ہو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نچلی منزل پر جہاں سے لکڑی کا بوسیدہ زینہ ایٹک کی طرف آتا ہے، دو صاحبان سہمے کھڑے ہیں۔ ایک نے اپنے ہاتھ میں قندیل اٹھا رکھی ہے۔ مجھے بالائی منزل پر دیکھتے ہی بولے آپ ہی کی تلاش میں نکلا تھا۔ آپ کمرے میں نہ ملے، ادھر ایٹک میں روشنی جل رہی تھی، ان پرندوں نے اوسان خطا کر دئے اور یہ زینہ بھی تو بڑا مخدوش سا دکھائی دیتا ہے۔

آدھی رات کو یاسر اور عبدالحمید کو اس طرح آتا دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی۔ آیئے ذرا سنبھل کر اوپر ہی آجایئے۔ یہاں لائبریری میں ہم آپ کی ملاقات شیخ سلیمان سے کرواتے ہیں۔ ان دونوں نوجوانوں کے

اوسان ذرا بحال ہوئے تو بولے معاف کیجئے گا شاید آپ لوگ کسی اہم گفتگو میں مصروف ہیں ہم اس خیال سے آپ کے پاس آئے تھے کہ آپ کو علی کودرا کے بارے میں بتا دیں۔

کیا ہوا انھیں؟

بولے، اب تو خیر سے وہ ڈاکٹر پیا کی نگہداشت میں ہیں اور انھیں نیند بھی آ گئی ہے۔ وہ اچھے بھلے برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک نہ جانے انھیں کیا ہوا کہ وہ میسون میسون چیخنے لگے۔ پھر عجیب بے ہنگم اور بے ربط سے کلمات ان کی زبان پر آئے: 'ظہور ہونے دو پھر دیکھنا، عجل عجل'۔ پھر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے ایسا لگا جیسے وہ collapse ہو رہے ہوں۔ وہ تو کہیئے کہ ڈاکٹر پیا فوراً مل گئیں اب وہ شاید کسی مسکن دوا کے زیر اثر ہیں۔

اللہ شفا دے۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ سلیمان نے دونوں کو تسلی دی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے بڑی دردناک کہانی ہے میسون کی۔ گارڈین میں شائع ہوئی ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزری ہو۔

نہیں میں نے نہیں دیکھی۔

بولے: دمشق سے بارہ میل شمال میں ادرنہ نامی جگہ ہے جہاں جبهة النصرة اور اسلامک فرنٹ کے جہادیوں کا قبضہ ہے۔ یہ لوگ علویوں کے خون کے پیاسے، فہرست لیے ہاؤسنگ کمپاؤنڈ کی تلاشی لے رہے تھے۔ ایک علوی فیملی جو فون پر آخری لمحہ تک، حلب میں اپنے رشتہ داروں سے رابطہ میں تھی، اخبار نے اس کی کہانی چھاپی ہے۔ میسون اپنے دو چھوٹے بچوں اور شوہر کے ساتھ اپنے فلیٹ میں محصور تھی۔ فون پر اس نے اپنے بھائی کو بتایا کہ ہم لوگوں نے ایک گرینیڈ کا انتظام کر لیا ہے۔ اگر دشمن ہمارے فلیٹ میں داخل ہو گئے تو ہم گرینیڈ کی مدد سے خود کو اڑا لیں گے۔ بھائی نے فون پر مشورہ دیا کہ تم بچوں کو ساتھ لے کر باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ شاید وہ بچوں کو دیکھ کر تمہیں فرار کا راستہ دے دیں۔ چند ثانیے بعد میسون سے دوبارہ رابطہ ہوا کہنے لگی ان لوگوں نے چھتوں پر اپنی پوزیشن سنبھال رکھی ہے اور ہاں اب تو وہ فلیٹ میں بھی داخل ہو چکے ہیں مجھے معاف کرنا اب میں مزید بات نہیں کر سکتی۔ یہ کہتے ہوئے فون اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اسی لمحہ ایک زبردست دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ دوسرے دن میسون کے بھائی کو اس کے ایک رشتہ دار کا فون آیا کہ اسکے بہنوئی نزار نے فون کیا تھا اس کی آواز ڈوب رہی تھی، وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ بشر مر چکا ہے، میسون اور کریم بری طرح زخمی

ہیں ان کا خون مسلسل رس رہا ہے اور پھر اس کے بعد فون اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ دوسرے دن میسون کے بھائی نے بعض پڑوسیوں سے فون پر رابطہ کرنے کا بڑا جتن کیا، علاقہ محصور تھا وہ خود جا نہیں سکتا تھا، تب صرف اتنا پتا چلا کہ نزار، کریم اور بشر کی تو فلیٹ ہی میں موت ہوگئی البتہ میسون کی ایک ٹانگ دھما کہ میں اڑ گئی تھی، جہادی اسے اپنے ساتھ لے گئے، بعد میں دوسرے ذرائع سے پتا چلا کہ جہادی ایک ٹانگ والی جس عورت کو اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کر کھینچ رہے تھے، وہ میسون ہی تھی۔ سیریا کی خانہ جنگی نے درندگی کے تمام سابقہ رکارڈ توڑ کر رکھ دیے ہیں۔ یہ کہہ کر سلیمان خاموش ہو گئے۔ مجلس پر ایک کربناک سناٹا چھا گیا۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ کودرا خبر کو کیوں نہ سہار پائے۔ شاید ان کے اندر رہنے والی مختلف شخصیتیں ایک دوسرے سے سر بکف ہو گئی ہوں۔ یاسر اور عبدالحمید نمناک تو ضرور تھے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر شام کی اس خانہ جنگی سے کودرا کی خرابیٔ صحت کا کیا تعلق ہے؟

۱۵

فرمودات سلیمانی

کھڑکی سے آنے والی سرد ہوا کے تھپیڑوں میں اب قدرے شدت آ گئی تھی۔ گاہے آسمان میں بجلی کی چمک دکھائی دیتی اور گاہے گھن گرج کے سبب ماحول پر ایک ہیبت سی چھا جاتی۔ یاسر جو عین کھڑکی کے سامنے آ بیٹھے تھے، کہنے لگے: اس متوحش ماحول میں آپ نے کھڑکی کیوں کھول رکھی ہے؟

چاہیں تو بند کر دیں ویسے یہ مکاشفہ کی کھڑکی ہے سلیمان نے یہ کہتے ہوئے یاسر کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے وہ انھیں ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ویسے بتاؤں یہ جو بادلوں میں عین تجلی کے لمحوں میں دلوں کو دہلا دینے والی گرج سنائی دیتی ہے تو یہ دراصل علی کی آواز ہے، یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا۔

یاسر کچھ سمجھ نہ پائے وہ کچھ حیرتی سے تھے اور کرسی کے دستے پر اس انداز سے ہاتھ رکھے ہوئے تھے جیسے مجلس سے اٹھنا چاہتے ہوں، بولے معاف کیجئے گا میں آپ لوگوں کی گفتگو میں مخل ہوا، اب اجازت دیجئے۔

میں نے کہا گفتگو ویسے بھی خاتمہ پر ہے اور یہ عمومی دلچسپی کی باتیں ہیں آپ چاہیں تو بیٹھ سکتے ہیں۔ ہمارے دوست سلیمان نصیری مشائخ کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ پھر تلاش حق میں بیروت، قاہرہ اور مختلف ملکوں میں پھرتے رہے۔ یہ اپنے ایام طالب علمی کی کچھ دلچسپ باتیں بتا رہے تھے۔

نصیری کا لفظ سنتے ہی یاسر ذرا ٹھٹک سے گئے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا لیکن صورتحال کی نزاکت دیکھتے ہوئے شاید خاموشی میں عافیت جانی۔ عبدالحمید سراپا تجسس تھے۔ کرسی پر اس طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے جیسے داستان کا اگلا حصہ سننے کے لئے بے چین ہوں۔ سلیمان جو اپنے فرموداتِ سلیمانی کے سبب ہمارے لیے شیخ سلیمان کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، قاہرہ میں اپنے قیام کی یاد تازہ کرنے لگے۔ بولے، شیخ

شلتوت کے فتویٰ نے میری نصیریت کی بنیاد ہلا ڈالی۔ گو کہ یہ فتویٰ اثنا عشری شیعوں سے متعلق تھا جن کے کفر اور گمرہی پر متقدمین کا اجماع موجود تھا۔ شیخ شلتوت نے صدیوں کے اجماع کو بیک جنبشِ قلم ساقط الاعتبار قرار دے دیا تھا۔ میں نے بارہا سوچا اہل حق کے مختلف طائفے جنھوں نے ایک دوسرے کو کافر، مشرک، منحرف، زندیق اور نہ جانے کیا کیا قرار دے رکھا ہے اور جس کے سبب ہمارے درمیان نفرت وعناد کی خلیج مسلسل بڑھتی جاتی ہے، یہ سب کچھ انسانی محاکمے ہیں۔ ان کی حیثیت آراء الرجال سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ فیصلے سیاسی مصالح کے سبب بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر عام مسلمانوں کے نزدیک ویسے تو علوی نصیری فرقہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے لیکن ۱۹۳۶ء میں سنّی مفتی حاجی امین حسینی کے ایک فتویٰ نے انہیں مسلمان قرار دیا اور پھر ۱۹۷۳ء میں شیعہ عالم موسیٰ الصدر نے بھی ان کے مسلمان ہونے کی توثیق کی۔ سنی، شیعوں کو روافض کہتے ہیں اور اثنا عشری شیعہ، نصیری اور دروز کو غلاۃ میں شمار کرتے ہیں۔ اور نصیری اثنا عشری شیعوں کو مقصّرہ گردانتے ہیں۔ الزام اور جوابی الزام کے اس سلسلے کو فہم دین کا نام دینا ناانصافی ہوگی۔ شلتوت کے فتویٰ نے پہلی بار مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ انسانوں کا فہم دین حتمی اور ناقابل تغیر نہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ نصیری جو خود کو شیعة الحق اور شیعة الھدیٰ کہتے ہیں وہ اہل ایمان کے دوسرے طائفوں کے سلسلے میں اپنی روایتی تنگ نظری اور بند دماغی کو جاری رکھیں۔

معاف کیجئے! شاید میں گفتگو میں مخل ہو رہا ہوں، کیا نصیری واقعی اپنے آپ کو شیعة الحق کہتے ہیں، یعنی اثنا عشریوں سے بھی ایک قدم آگے؟ عبدالحمید نے حیرت کا اظہار کیا۔

جی ہاں! اور دروز جنھیں آپ نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں ان کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اصلی اھل التوحید تو وہی ہیں۔

دروز اور اہل توحید؟ ارے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ تو نماز روزے سے بھی واسطہ نہیں رکھتے، عبدالحمید نے احتجاج کیا۔

جی ہاں بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ ایک گمراہ طائفہ ہے جس کا دین اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن خود ان کے عقّال سے پوچھئے تو وہ بتائیں گے کہ فہم توحید تو بس ان کے حصہ میں آیا ہے۔

عقال؟

جی ہاں دروز حلقہ میں اہل خرد اور مشائخ کو عقّال سمجھا جاتا ہے اور عوام جو رموز دین سے یکسر ناآگاہ

ہوتے ہیں جہّال کہلاتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس دروز طائفے کو آپ اسلام کے حاشیہ پر رکھنے کے بھی روادار نہیں وہ سنّیوں کو اہل ظاہر، شیعوں اور اسمٰعیلیوں کو ایک درجہ اوپر اہل باطن اور خود کو سب سے اوپر اھــــل التـوحیـد میں شمار کرتے ہیں۔ سنّیوں کے پانچ ارکانِ دین اور شیعوں اور خوارج کے سات ارکان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان کی تعمیل بجالانا صرف ان کے لیے ہے جو قرآن اور شریعت کے صرف ظاہری معانی پر آگاہ ہوں۔ رہے دروز تو ان پر سے ارکانِ دین بجالانے کی دعائم تکلیفیۃ اٹھالی گئی ہے، اس کے بجائے انھیں توحید کے اصولِ سبع پر گامزن رہنے کی ہدایت ہے۔

ارے اس طرح تو انھوں نے ساری شریعت ہی منسوخ کردی نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوٰۃ۔ پھر بچا کیا؟ یاسر نے پھر اعتراض وارد کیا۔

تو کیا قرآن کے علاوہ ان کے ہاں کوئی اور کتاب ہے جس سے ان کی مذہبی زندگی کا کاروبار چلتا ہے؟ عبدالحمید نے پوچھا۔

بولے دیکھئے فرقے تو بنتے ہی اسی سبب ہیں کہ اہل ایمان کا کوئی گروہ قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب کو معرفت کی کلید سمجھنے لگے اور رسول اللہ کے علاوہ کسی شیخ، داعی یا عالم کو تعبیر وتاویل کا کلی اختیار عطا کردے۔ نصیری ہوں یا دروزی یا اسمٰعیلی اور اثنا عشری شیعوں کے دوسرے ذیلی طائفے ہوں یا خود اہل سنت والجماعت میں ائمہ فقہاء اور ائمہ تصوف کے مختلف سلسلے۔ ان سب کی بنا میں انسانوں کا تخلیق کردہ تعبیری ادب اور شخصی حوالے ہی کارفرما ہیں۔

لیکن دروز اور نصیریوں نے تو کچھ زیادہ ہی کیا۔ انھوں نے تو شریعت ہی غائب کردی۔ یہ بات آپ اہل سنت کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتے۔ یاسر نے اعتراض کیا۔

دیکھئے میری منشاء کسی کی دل آزاری یا کسی کو مطعون کرنا نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی مرکزیت کو مجروح کرنے اور رسول اللہ کے علاوہ غیر نبی کو اعتبار بخشنے میں اہل قبلہ کے تمام ہی طائفے کسی نہ کسی درجہ میں خطاکار ہیں۔ اگر احناف کے ہاں هـدایة ہے تو نصیریوں کے ہاں الهـدایة الـکبـریٰ کو عوامی اعتبار حاصل ہے۔ نصیریوں کی کتـاب الـمـعارف انھیں اس بات پر آگاہ کرتی ہے، جیسا کہ حسن عسکری سے منقول ہے کہ خدا اپنے بندوں سے عبادت کا نہیں بلکہ صرف اپنی معرفت کا طالب ہے، اور معرفت ہی عبادت ہے۔ (ومـا اراد مـنهـم الا المعرفة وهی العبادة)۔ پھر اگر نصیریوں کے ہاتھ سے حبل اللہ المتین پھسل گئی اور ان

کے عوام وحی ربانی کی تجلیوں سے دور ہو گئے تو ان کے اصل ذمہ دار تو وہ شارحین ہیں جنھوں نے ماورائے قرآن دینی کتابوں کی ایک کھیپ تیار کر دی۔ مگر میرا یہ کہنا ہے کہ اس جرم میں مسلمانوں کے تمام ہی طائفے شریک ہیں۔

مگر یہ بات آپ اہل سنت کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں؟ یاسر نے، جنہوں نے دفاعِ اہل سنت کا علم تھام رکھا تھا، جرح کی۔

بولے: جب تک آپ چیزوں کو اپنے فرقہ کی عینک سے دیکھیں گے، آپ کو حقیقت امر کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ حنفی سنی لباس کو تج دیجئے۔ کونوا ربانیین کی ترغیب پرعمل کیجئے پھر دیکھئے قرآن پڑھتے وقت آپ کو وحی ربانی کے جھٹکے لگنے لگیں گے۔ میں چونکہ خود اس عمل سے گزرا ہوں۔ جب تک میں نصیری لباس میں ملبوس رہا اپنے علاوہ اردگرد کے تمام مسلمان ضال مضل نظر آئے۔ البتہ جب میں نصیری لباس سے باہر آیا تو تعبیرات کے سنی قالب نے مجھ پر ان حقائق کو منکشف کیا جس پر نصیری، دروز اور اثنا عشری لباس والے کبھی مطلع نہیں ہو سکتے۔ فہم دین کے مختلف تناظر اور اہل قبلہ کے اجتماعی تعبیری ادب پر جب تک نگاہ نہ ہو حقیقت امر کا پتا نہیں چلتا۔

شیخ سلیمان کی باتوں نے یاسر اور عبدالحمید کو خاصا مضطرب کر دیا تھا۔ وہ بار بار میری طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ شاید میں شیخ سلیمان کے جارحانہ تجزیہ پر کوئی بند باندھ سکوں۔

بولے کیا خیال ہے آپ کا، شیخ تو کہتے ہیں کہ اب کسی کی گرفت حبل اللہ المتین پر نہیں رہ گئی ہے۔ کیا ہم اہلِ سنت بھی دروز اور نصیری کی سطح پر آ گئے ہیں؟

میں نے کہا شیخ سلیمان مختلف وادیوں کی سیر کرتے رہے ہیں۔ دین کو انھوں نے کبھی نصیریوں کی نگاہ سے دیکھا تو کبھی سنی مآخذ و مراجع کی تلاش میں سرگرداں رہے، کبھی سلفیوں کے زیر اثر آئے اور کبھی اثنا عشریوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ ان کے تناظرات کو سنئے، تناظرات کی اتنی بوقلمونی بڑی مشکل سے ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ البتہ شیخ سلیمان سے میرا ایک سوال ہے۔ برائے مہربانی، سر عقد ع م س، ذرا یہ تو بتائیے کہ اپنے نظری سفر میں اب آپ خود کو کہاں محسوس کرتے ہیں؟ نصیریت کا لبادہ آپ سے چھن گیا، سنیت آپ کو راس نہ آئی اور اثنا عشری شیعیت آپ کی تسکین نہ کر سکی۔

میرے اس سوال پر پہلے تو وہ زیرلب مسکرائے، گردن کو پیچھے کی طرف جنبش دی پھر اچانک بجھ سے

گئے۔ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئے ہوں۔ پھر کسی قدر بوجھل لہجہ میں بولے بس یہ سمجھ لیں کہ چیزیں اب اپنی اصل ماہیت میں نظر آ رہی ہیں مگر کیا پتا کہ یہ محض آ گہی کا دھوکہ ہو، سو اس خیال سے مسلسل کرید میں لگا رہتا ہوں۔ اب یہی دیکھئے یہ کتاب الاقدس ہے، وحی سے ماوراء ایک نئی وحی کی دعویدار۔ ایک نیا جال ہے بلکہ بہت سے جال تو نظر بھی نہیں آتے۔ اب دیکھئے اپنی کتاب الاقدس کے سبب بہاءاللہ تو دائرہ اسلام سے دور جا پڑے لیکن جواہر العشاق کی منزّل آیتیں عبدالقادر جیلانی کو قدوۃ الاولیاء کے منصب سے معزول نہ کر سکیں۔ نصیری، دروز اور اسمٰعیلی تو اپنی کتابیں چھپاتے رہے اور شاید اس لیے ان کے الہامی دعاوی کا جمہور مسلمانوں کو اندازہ نہ ہو سکا لیکن معرفت اور کشف کے دعاوی سے کس کے دامن داغدار نہیں؟

اہل سنت خواہ جتنے بھی گمراہ ہوں انھیں دروز اور نصیری کی سطح پر لانا تو مناسب نہیں۔ دیکھئے ان کے ہاں احکامِ شریعت پر آج بھی عملدر آمد جاری ہے۔ یاسر نے پھر دفاع کی کوشش کی۔

بولے یہ محض تناظر کا فرق ہے۔ آپ پہاڑی کی اس چوٹی سے دیکھیں جہاں سے دروز دوسرے طائفوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کو یہی بات سمجھ میں آئے گی کہ موحدون تو صرف دروز ہیں۔

ارے کمال کرتے ہیں، وہ کہاں کے موحدون ہوئے وہ تو حاکم بامر اللہ کو خدا مانتے ہیں، یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا جعفر الصادق کے روپ میں آیا، عبدالحمید نے اعتراض وارد کیا۔

پہاڑی کی دوسری چوٹی سے ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا آپ کہہ رہے ہیں، شیخ سلیمان نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بولے: رسائل الحکمۃ پڑھئے جو دروز کے ہاں تاویلات قرآنی کی سب سے معتبر کتاب ہے۔ ان رسائل کے مطابق خدا (لاہوت) کسی انسان (ناسوت) میں اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے جیسے کسی آئینہ میں کسی شئی کا پرتو۔ اصل چیز آئینہ میں داخل نہیں ہوتی، دیکھنے والا صرف عکس دیکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح خدا انسان میں حلول نہیں کرتا بلکہ اپنی تجلی اس شخص کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کے بندے اس کی معرفت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں جن لوگوں نے خدا کی اس تجلی پر لبیک کہا، رسائل کے بقول یہی لوگ اصل موحدون ہیں۔

مگر توحید کی اس تاویل کے لیے قرآنی دلیل کیا ہے؟

یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔ دروز علماء کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کی باطنی تاویل سے کہیں آگے جو اسمٰعیلیوں کا شعار رہا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ دین کو مناسک ورسوم کے بجائے والہانہ عبودیت کے

طور پر سمجھا جائے۔ نہ تو اہل ظاہر اور نہ ہی اہل تاویل تنزیل کی صحیح ماہیت سمجھ سکتے ہیں۔ ظاہر اور باطن کے مابین اہل توحید کا مسلک ہی دین وسط ہے جیسا کہ نویں رسالہ حکمہ میں لکھا ہے کہ اسلام ظاہر دراصل باطن یعنی ایمان کا دروازہ ہے اور ایمان کا اصل ہدف توحید کا حصول ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سنی اہل ظاہر ہونے کے سبب سب سے نچلی سطح کی روحانی زندگی جیتے ہیں، ان سے ایک درجہ اوپر اہل باطن یعنی شیعہ اور اسماعیلی ہیں اور سب سے اوپر اہل توحید ہونے کے سبب موحدون دروز متمکن ہیں۔ اور چونکہ یہ حضرات دین کے غایت واہداف پر آگاہ ہیں اسی لیے ان سے دعائم تکلیفیتہ یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے احکام اٹھا لیے گئے ہیں اور اس کی جگہ انھیں سات اصولوں پر گامزن رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وہ سات اصول کیا ہیں؟ عبدالحمید پوچھا۔

بولے: دروزیوں کی مذہبی اصطلاح میں انھیں الوصایا السبعة کہتے ہیں اور وہ اس طرح ہیں:

۱۔ صدق اللسان

۲۔ حفظ الاخوان

۳۔ ترك عبادة العدم والبهتان

٤۔ البراءة من الأبالسته والطغيان

٥۔ التو حيد لمولانا فى كل عصرو زمان

٦۔ الرضى بفعل مولانا كيف ماكان

۷۔ التسليم لأمر مولانا فى السر والحدثان

یہ تو کچھ وہی آہنگ ہے کلمتان خفیفتان علی اللسان جیسا، یاسر نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: جی ہاں! ہم قافیہ عبارتوں کا استعمال ان مآخذ میں عام طور پر پایا جاتا ہے جو قرآن کے باہر رموز و حکمت کے وجود کی دعویدار رہی ہیں۔

یہ رسائل حکمۃ کیا بآسانی دستیاب ہیں؟ یاسر نے جاننا چاہا۔

بولے جی ہاں لبنان میں تو بآسانی مل جائیں گے۔ یہ کل ایک سو گیارہ (۱۱۱) رسائل ہیں۔

یہ اخوان الصفا کے رسالے تو نہیں؟ عبدالحمید نے پوچھا۔

بولے: نہیں، وہ علیحدہ ہیں ان کی تعداد باون رسالوں تک پہنچتی ہے، گو کہ ان کی اصل میں بھی تاویل کا یہی مسلک کارفرما ہے۔

میں نے سوچا شیخ سلیمان سچ ہی تو کہتے ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی سے وادی کا منظر خود وادی میں رہنے والوں پر پوری طرح منکشف نہیں ہوتا۔ دروز بزعم خود اہل توحید ہونے کے دعویدار ہیں لیکن انھیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ تاویل وتنسیخ کے عمل نے دین کے اصل ماخذ سے انھیں کس قدر دور کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت دوطرح کی ہوتی ہے۔ شریعتِ تنزیل اور شریعتِ تاویل۔ ان کے نزدیک تاویل، تنزیل سے بڑھ کر ہے۔ ان کا یہی رویہ ان کے لیے ماخذ وحی سے مہجوری کا سبب بن گیا ہے۔ مگر تاویل کے مجرم صرف دروزی اور نصیری نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام ہی فرقے، کوئی کم کوئی زیادہ، اس عمل کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اہل تصوف دین کی معرفت کے دعویدار رہے ہیں۔ دروزیوں کے نزدیک اگر رابعۃ العدویۃ (متوفی ۱۸۵ھ) ابوقاسم الجنید (متوفی ۲۹۸ھ) بایزید بسطامی (متوفی ۲۶۱ھ) اور حسین منصور حلاّج (متوفی ۳۰۹ھ) جیسے متصوفین کو خاص مقام حاصل ہے تو اہل خرد کے لئے دروزی، نصیری، اسماعیلی، صوفی، چشتی، نقشبندی کے مابین غیر محسوس طور پر پائے جانے والے تانوں بانوں کی تفہیم کچھ زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہیے۔

خیال آیا کہ شیخ سلیمان نے خاص نصیری حلقوں میں فن تاویل کی تربیت پائی ہے۔ وہ دروزی مذہب کے اسرار ورموز پر بھی آگاہ ہیں۔ وہ پہاڑی کی جس چوٹی پر براجمان ہیں ان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ بتاسکیں کہ وہاں سے دوسری طرف کا منظر کیسا دکھتا ہے۔ میں نے پوچھا نصیری اور دروزی عالم اسلام کے عین قلب میں رہتے ہیں جہاں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مظاہر عام ہیں، پھر اس ماحول میں انھیں مرکزی دھارے سے کٹ جانے کا احساس نہیں ہوتا؟ وہ اپنے دعویٔ توحید کو کس طرح مستند ٹھہراتے ہیں؟

بولے: دروز جو اپنے آپ کو موحدون دروز کہتے ہیں، ان کا اعتقاد ہے کہ قرآن سات شکلوں میں نازل ہوا ہے (انزل علیٰ سبعة شنوف) اس کا ایک حصہ ناسخ ہے اور دوسرا منسوخ اور اس کی قرأتیں بھی سات ہیں (قری بسبعة احرف)۔

’ارے یہ بحثیں تو اہل سنت کے ہاں بھی علومِ قرآنی کا مدار ہیں‘، یاسر حیرت واستعجاب سے چیخ اٹھے۔

تو یہ دروز بھی کوئی آسمانوں سے تو آئے نہیں۔ یہ تاویل وتعبیر کی وہی بحثیں ہیں جنھوں نے ایک عہد میں مسلمانوں کے تمام ہی فرقوں کو پراگندۂ فکری اور خلط مبحث میں الجھائے رکھا تھا۔ جب قرآن کی کسی آیت کے بارے میں منسوخ ہونے کا خیال پیدا ہوجائے یا سالک اس التباسِ فکری کا شکار ہوجائے کہ وحی

ربانی کوسات مختلف احرف میں پڑھا جا سکتا ہے تو پھر معنوی تحریف کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔

مگر سنی حلقہ میں تو یہ خیال عام ہے کہ دروز اور نصیری ہی نہیں بلکہ خود اثنا عشری شیعہ عقیدہ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے مروجہ نسخہ اصل قرآن کا بس ایک تہائی ہے اور اصل قرآن ان کے امام غائب اپنے ساتھ لے گئے جو اپنے ظہور کے وقت اسے ساتھ لائیں گے۔ تو میرے خیال میں معاملہ صرف تاویل کا نہیں بلکہ متنِ قرآن کا بھی ہے'۔

یاسر کی اس دلیل پر شیخ سلیمان نے زیرلب تبسم کیا جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر کسی قدر مناظرانہ لہجہ میں فرمایا: تحریف قرآن کے جرم سے بچا کون ہے؟ عصمت قرآن کو مجروح کرنے والی روایتوں پر کس فرقہ کا یقین نہیں؟ پھر دروزیوں یا نصیروں کو ہی کیوں مطعون کیا جائے۔ اضمحلال خلافت کی ابتدائی صدیوں میں حکمت کی تلاش میں جو لوگ قرآن کے بجائے غیر قرآنی ماخذ کی طرف جا نکلے، انھوں نے تعبیر و تاویل کا ایک لامتناہی جنگل آباد کر دیا۔ اس کے اثرات مسلمانوں کے تمام ہی فرقوں پر پڑے تب ان فرقوں کی شناخت اتنی واضح اور مستحکم نہ تھی۔ مثال کے طور پر حسین الخصیبی ہی کو لیجیے جو فرقۂ نصیری کے بانی مبانی سمجھے جاتے ہیں، وہ اپنے عہد میں اثناعشری شیعوں کے نزدیک بھی ثقہ سمجھے جاتے تھے۔ الخصیبی اثناعشری شیعوں کے ہاں 'رواۃ' کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے باقر مجلسی نے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں اور ان کی کتاب الهداية الكبرىٰ اثناعشری شیعوں کے ہاں بھی معتبر سمجھی جاتی ہے لہٰذا یہ جو آپ علومِ قرآنی کی معرفت کے حوالے سے ناسخ و منسوخ، خاص و عام، سبع احرف، قرأۃ عشر اور نزلت هكذا جیسی باتیں سنتے ہیں تو یہ باتیں دراصل اس عہد کی پراگندۂ فکری کا عمومی اظہار ہیں جس کے چھینٹے، کہیں کم اور کہیں زیادہ، مسلمانوں کے تمام ہی فرقوں پر پڑے ہیں۔

تو کیا دروز اور نصیری بھی عام مسلمانوں کی طرح قرآن مجید کو اپنا محور و مرکز گردانتے ہیں؟ یاسر نے اپنے سوال کو منزہ کرنے کی کوشش کی۔

بولے: مرکز و محور تو کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ ہاں! دعویٰ دروزیوں اور نصیروں کو بھی ہے۔ رسائل الحكمة کے صفحات الٹئے آپ کو صاف نظر آئے گا کہ یہاں قرآن مجید کے اسرار و رموز پر بحث ہو رہی ہے۔ اسرار و رموز کی بات تو سبھی کرتے ہیں لیکن کوئی قرآن کے ٹھیٹ مطالب کی بات نہیں کرتا اور یہ صورتحال کہیں کم اور کہیں زیادہ ہر فرقہ کے ہاں ہے۔ رہی بات نقصِ قرآن کی تو اس قسم کی بے بنیاد روایتیں شیعہ اور سنی دونوں کی

کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ایک طرف طبرسی کی فصل الخطاب ہمیں اس بات پر آگاہ کرتی ہے کہ قرآن مجید دو ہیں: ایک معلوم اور دوسرا مکتوم اور یہ کہ سورہ الولایۃ اسی مکتوم قرآن کا حصہ ہے جس میں حضرت علیؓ کی ولایت کے ضمن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے:

یا یھا الذین آمنوا بالنبی والولی الذین بعثھما یھدیا نکم الیٰ الصراط المستقیم اور اسی مکتوم قرآن میں سورہ الم نشرح میں وجعلنا علیّا صھرك (یعنی ہم نے علی کو تمہارا داماد بنایا) جیسی آیت بھی موجود تھی تو دوسری طرف سنی مآخذ میں بھی ایسی روایتوں کی کمی نہیں جو حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بتاتی ہیں: لقد نزلت آیة الرجم ورضاعة الکبیر عشرا ولقد کان فی صحیفة تحت سریری فلما مات رسولؐ الله وتشا غلنا بموته دخل داجن فاکلھا۔

(یعنی رجم اور رضاعت کبیر کی آیات نازل ہوئی تھیں اور قرآن کے اس نسخہ میں موجود تھیں جو میری چار پائی کے نیچے رکھا رہتا تھا، پھر جب رسول اللہ کی وفات ہوئی اور ہم ان کی موت کے سلسلے میں مشغول ہو گئے تو ایک بکری آئی اور اسے کھا گئی۔)

ابن ماجہ کی اس روایت پر یقین کیجئے تو عصمت قرآن کے سنی دعاوی کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ یہ تو متن قرآن کی بات تھی۔ رہی معنوی تحریف و تنسیخ کی بات تو اس جرم میں نصیری، دروزی، زیدی، یزیدی، اسماعیلی، اثناعشری، بہائی، قادیانی، ایران کے اہل الحق، عمان کے اہل العدل والاستقامہ اور سنیوں کے مختلف طائفے یہ سب کے سب برابر کے شریک ہیں۔ فقہاء نے غضب ہی کیا اصل متن قرآنی کو چھوڑ کر وہ اختلافی اور شاذ قرأتوں کی تلاش میں نکل پڑے اور ستم یہ ہوا کہ وہ اختلافی قرأتیں تفقہ کا مدار بن گئیں۔ یہ کہتے ہوئے شیخ سلیمان نے ایک سرد آہ بھری، بولے واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنی اصل سے بہت دور نکل آئے ہیں۔

۱۶

شیخ حسن فولادی

شیخ سلیمان کی گفتگو نے مجلس پر حزن و یاس کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ میں نے مجلس کو خیر باد کہا۔ باہر طوفانی ہواؤں کے ساتھ بارش شروع ہو چکی تھی۔ ایٹک کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے زور کی بجلی چمکی اور ایک لمحہ کے لیے زینہ کو منور کر گئی۔ بارش کی چھینٹوں سے بچتا ہوا کمرے میں آیا بستر میں لیٹے ہوئے شیخ کا وہ جملہ بار بار یاد آتا: 'ہم اپنی اصل سے دور نکل آئے ہیں'۔ کیا واقعی حبل اللہ المتین ہمارے ہاتھ سے پھسل چکی ہے؟ خیال آیا کہ پہاڑی کی اس چوٹی پر بیٹھ کر دروز اور نصیری جیسے فرقے اهل التوحيد و المعرفة نظر آتے ہیں اور اسی چوٹی سے اہل ایمان کے دوسرے تمام طائفے اہل الظاہر، اہل الباطن اور کمتر درجے کے مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے کو گمراہ اور کافر گردانتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقتِ امر کا کسی کو بھی اندازہ نہیں۔ انھیں دوسروں کا انحراف تو نظر آتا ہے لیکن وہ اپنی گمرہی پر آگاہ نہیں ہو پاتے۔ یہ کیسی عجیب صورتحال ہے کہ ہمیں فریق مخالف کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے لیکن ہم اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھ پاتے۔ ایک نئی ابتداء اور ایک نئے مکالمہ اور مفاہمہ کا راستہ ان فتوؤں نے روک رکھا ہے جو کبار متکلمین اور محدثین سے منسوب ہیں۔ آج ہمارے لیے اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ غزالی جب فضائح الباطنية لکھ رہے تھے تب وہ فاطمی خلافت کے مقابلے میں عباسی بغداد کے نظری دفاع پر مامور تھے۔ ابتدائی صدیوں میں سیاسی محرکات کے سبب مسلمانوں کے مختلف فرقے تعبیر و تاویل کی جنگ میں کچھ اس طرح الجھے کہ ایک دوسرے کو کفر و زندقہ سے مطعون کرنا عام شعار بن گیا۔ اہل سنت کے کبار علماء نے بسبب عقیدۂ تحریفِ قرآن شیعوں کو روافض قرار دیا اور اہل تشیع نے سنیوں پر نواصب کی پھبتی کسی۔ غزالی نے نصیریوں کے بارے میں تو یہاں تک لکھ دیا کہ نصیری اپنے ارتداد کے سبب واجب القتل ہیں اور ابن تیمیہ نے نصیریوں کو

یہود ونصاریٰ سے بڑھ کر کافر ومشرک قرار دیا۔اشعری نے دروزیوں کو ایک ایسا طائفہ بتایا جن کے ہاں ہم جنس پرستی اور محرموں سے جنسی تعلق کو روا رکھا جاتا ہو۔سنی حلقوں میں یہ پروپیگنڈہ رہا کہ دروز باہم ایک دوسرے کی بیویوں کو بخوشی استعمال کرتے ہیں بلکہ علویوں کے بارے میں یہ تاثر بھی رہا کہ وہ مخصوص مذہبی تقریبات میں مشترکہ مباشرت کے قائل ہیں۔ تھذیب الاحکام جیسی کتابوں میں شیعوں اور سنیوں کے مابین نکاح کو سنیوں کے کفر کے سبب ناجائز قرار دیا گیا۔ بلکہ امام باقر کے حوالے سے تو یہ بات تک کہی گئی کہ نہ ان سے نکاح کرو، نہ ان کا ذبیحہ کھاؤ اور نہ ان سے میل جول رکھو۔اضمحلال خلافت کے بحرانی دور میں قاہرہ کے فاطمی خلفاء، بغداد کے عباسی خلفاء اور اندلس کے اموی دعویداروں نے باہمی مسابقت کی لئے اتنی تیز کر دی کہ ان وقتی جدال فقہی اور شخصی آراء کو دین متین کے مستند فہم کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ یہ باجبروت خلافتیں اور اہل بیت کے غاصبین بشمول ان تمام دعویداروں کے جو ان ادوار میں اہلِ بیت کے حلقوں سے اٹھتے رہے، یہ سب لوگ تو دنیا سے نابود ہو گئے لیکن نفرت آمیز تکفیری فتوے آج بھی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ان فتووں کو اگر سماجی اور سیاسی دستاویز کے طور پر دیکھا جائے تو اس میں ہمارے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے لیکن اگر اسے دین مبین کی مستند تعبیر کے طور پر دیکھا گیا تو ہم اپنے اوپر ایک نئی ابتداء اور نئے فہم کا دروازہ بند پائیں گے۔

ہم واقعی اپنی اصل سے بہت دور نکل آئے ہیں۔آج میری نگاہوں میں حسن فولادی کا چہرہ گھوم گیا۔حسن سے میری پہلی ملاقات لندن کی شیعہ سنی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ یہ وہی ایام تھے جب امریکی فوجیں عراق میں داخل ہو چکی تھیں۔صدام حسین اقتدار سے بے دخل کیے جا چکے تھے اور عراق کے مختلف شہر شیعہ سنی تصادم اور ہولناک دھماکوں کی زد میں تھے۔اس سنگین صورتحال سے نکلنے کے لیے آیت اللہ سیستانی کی ایماء پر لندن میں شیعہ سنی مفاہمت کے سلسلے میں ایک بڑی کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ کانفرنس کی رسمی نشستوں میں مقررین کو سنتے ہوئے حیرت ہوتی کہ جب دونوں طرف اتنے معتدل، شائستہ اور سلیم الفکر لوگ موجود ہیں تو پھر عراق کی سرزمین پر باہمی عداوتوں اور دھماکوں کی گونج مسلسل کیوں بلند ہوتی جاتی ہے؟

شیخ حسن فولادی یہی کوئی پچاس پچپن کے لپیٹے میں ہوں گے۔ درمیانہ قد، روشن چہرے پر خوبصورت ترشی تراشی داڑھی، سر سے پیر تک نک سک ایسی درست جیسے ابھی ابھی تازہ تازہ دھلے دھلائے نکلے ہوں۔ شیخ حسن جہاں بھی بیٹھتے، نزاعی مباحث کا سلسلہ چھیڑ دیتے۔شیعہ اور سنی مآخذ کی امہات الکتب کے سیکڑوں حوالے انہیں اس طرح ازبر تھے کہ ان کے حافظہ پر رشک آتا۔ گفتگو میں وہ روانی جیسے آبشار بہتا

ہو۔عربی، فارسی، انگریزی زبانوں پر یکساں قدرت تھی اور اردو تو خیر سے کشمیری نژاد ہونے کے سبب ان کی مادری زبان ہی تھی۔ یورپ، امریکہ کی دانش گاہوں اور نجف اور قم کے حوضۂ علمیہ میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن ان کے ساتھ جب بھی بیٹھا ایسا لگتا کہ ان کا مطالعہ ان سے سنبھالا نہ جاتا ہو۔نزاعی بحثوں پر مشتمل تاریخی معلومات اور تراثی ادب کے حوالے ہر لحہ آپ کے دہن مبارک سے نکلنے کے لیے بیتاب رہتے۔

کانفرنس کی ایک شام، دریائے ٹیمز کی سیر وسیاحت اور وہیں سفینہ پر عشائیہ کے لیے مخصوص تھی۔ لندن کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور دن بھر کے میکانکی شور وشغب سے نکل کر شام ڈھلے ٹیمز کی سیر یوں بھی بڑی فرحت بخش ہوتی ہے۔ میں سفینے میں بیٹھا باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ شیخ فولادی احباب واعوان کی ایک جماعت کے ساتھ وارد ہوئے۔سامنے نشستیں خالی دیکھ کر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ میں نے ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ شیخ فولادی ہماری میز کے گرد تشریف فرما ہوئے۔انہوں نے اہل مجلس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر کسی قدر بلند آہنگ سے فرمایا:صلوات! اللھم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد۔ اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سینے تک لے گئے پھر ایک لحہ توقف کے بعد شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: مولا علی کے دشمنوں پر لعنت بے شمار۔ میرے برابر میں حسن الحذیفی تشریف رکھتے تھے۔ازہر کے معروف عالم دین، تحریر وتقریر میں سنی موقف کے پرزور وکیل اور روافض کے خلاف ہر لحہ تلوار بکف۔اب اندازہ ہوا کہ شیخ فولادی کی لعنتوں کا اشارہ کس طرف ہے۔حذیفی مسکرائے، بولے: آمین۔

'ویسے مولا علی کے دشمن اب باقی کہاں بچے۔تفضیلِ علی کی گونج سے اہل سنت کی مسجدیں آباد ہیں، میں نے بات کی دھار کو کم کرنے کی کوشش کی۔

فرمایا: یہ تو اس لیے ہے کہ مولا علی ان کی مجبوری ہیں۔علی کے بغیر وہ خود کو برہنہ محسوس کرتے ہیں۔ مگر محض مناقب وتفضیل سے بات نہیں بنتی جب تک علی کی امامت دلوں میں نہ اتر جائے اور غاصبینِ امامت کے لیے ہم اپنے اندر شدید غم وغصہ نہ محسوس کریں۔

شیخ حذیفی نے پہلے تو مسکرا کر بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ پھر نہ جانے انھیں کیا سوجھی۔ بولے: دیکھئے یہ ساری نزاع خلیفہ بلافصل کے عقیدہ کے سبب ہے اور یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لیے صرف روایتوں پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔قرآن سے واضح دلیل ہونی چاہیے۔

جی ہاں قرآن میں دسیوں دلیلیں ہیں، صریح آیات ہیں۔

اچھا! میری نظر سے تو ابھی تک نہیں گزریں۔ شیخ حذیفی نے حیرت کا اظہار کیا۔

فرمایا: میرے پاس ہے نا۔ اصل میں آپ لوگوں کا سابقہ اب تک کسی ایسے عالم سے پڑا ہی نہیں جو تاویل وتنزیل اور تاریخ وآثار پر یکساں نظر رکھتا ہو۔ میں نے شرق وغرب میں اہل سنت کے بڑے بڑے علماء سے مناظرے کیے ہیں اور انھیں شکستِ فاش دی ہے۔ کیا بتاؤں اہل سنت کے علماء خود اپنی کتابوں سے آگہی نہیں رکھتے۔

مجھے خدشہ ہوا کہ شیخ فولادی اپنی گفتگو سے دریائے ٹیمز کی اس خوشگوار شام کو مناظرے کی مجلس میں تبدیل نہ کردیں سو میں نے شیخ حذیفی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے انھیں یہ مشورہ دیا کہ کیوں نہ شیخ سے کسی وقت غیر رسمی تبادلۂ خیال کے لیے وقت طے کرلیں۔ اس طرح ان سے استفادے کی راہ نکل آئے گی۔

جی ہاں جب چاہیں بندہ حاضر ہے۔ مگر اس کا کیا کیجیے گا کہ آپ لوگوں کے پاس مولا علی کی امامت کے خلاف کوئی دلیل ہوتی ہی نہیں۔ آپ لوگ ایک مخمصہ میں گرفتار ہیں۔ ان کی تفضیل کے قائل بھی ہیں اور ان کا انکار بھی صاف لفظوں میں نہیں کرپاتے۔

شیخ حذیفی جواب تک اپنی مسکراہٹوں سے شیخ فولادی کے حملوں کا دفاع کررہے تھے مزید خاموش نہ رہ سکے۔ بولے: ارے بھائی علمائے فحول سے بھلا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔ ویسے بھی میں مناظرے کا آدمی نہیں البتہ اپنی معلومات میں اضافہ کے لیے چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے پاس علی کی امامت کے سلسلے میں قرآن سے کوئی دلیل ہو تو پیش فرمائیں۔

ہاں ہاں کیوں نہیں۔

'زیادہ نہیں کسی ایک آیت کی نشاندہی فرمائیں جس سے امامت پر دلیل قائم ہوتی ہو، واضح، صاف اور صریح دلیل۔

شیخ فولادی نے اپنا عمامہ درست کیا، جسم کو آگے کی طرف ہلکی سی جنبش دی، فرمایا ملاحظہ کیجیے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، آیت قرآنی ہے: وربك یخلق مایشاء ویختار ماكان لهم الخیره سبحان اللہ وتعالیٰ عمایشركون یعنی اے نبی تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اختیار کرتا ہے اور انھیں اختیار کرنے یا منتخب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس آیت میں دراصل منصوص امامت کی طرف اشارہ مقصود

ہے۔

عجیب! یہ اشارہ آپ ہی سمجھے۔ اتنے اہم مسئلہ پر خدا صرف اشارہ پر اکتفا کرے اور آپ جیسے اہل خرد ہی اس نکتۂ لطیف کو پاسکیں۔ ارے بھئی یہ مسئلہ تو عماد الدین میں سے ہے، بلکہ آپ کے نزدیک تو دین کا بنیادی ستون ہے، اس کی تو باقاعدہ صراحت ہونی چاہیے۔

فرمایا جی ہاں جی ہاں صراحت ہے، بالکل صریح اور واضح۔

مگر ابھی تو آپ اشارے کی بات کر رہے تھے۔

بولے دیکھئے آپ الفاظ نہ پکڑیئے، بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

شیخ حذیفی نے اپنی زنبیل سے ایک دوسرا نسخہ نکالا۔ بولے: اب میں آپ کی توجہ ایک آیت کی طرف دلاتا ہوں جو میرے نزدیک مسئلۂ امامت کو امر منصوص قرار نہیں دیتی۔ سورہ فرقان کی آیت ہے، آپ کے علم میں ہوگی: وعباد الرحمن یمشون ـــــ والذین یقولون ربنا ھب لنامن ازواجنا و ذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما۔ اس آیت میں باضابطہ دعا کی گئی ہے کہ اے پروردگار ہمیں متقیوں کے لیے امام بنا۔ سو اگر امامت امرِ منصوص ہوتی تو اس دعا کا کیا مطلب؟

شیخ فولادی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہویدا ہوئی۔ فرمایا شاید آپ سمجھتے ہوں کہ یہ سوال پوچھ کر آپ نے کوئی بڑا دھما کہ کر دیا ہے۔ اس کا جواب بھی میرے پاس موجود ہے۔ بہت آسان سی بات ہے۔ شواھد التنزیل میں حاکم الحسکانی نے ابی سعید سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں ازواج سے مراد خدیجہ، ذریت سے فاطمہ، قرۃ عین سے حسن اور حسین اور جعلنا للمتقین اماما سے علی مرتضیٰ کی ذات گرامی مقصود ہے۔

'کمال کرتے ہیں میں آپ سے قرآن سے دلیل طلب کرتا ہوں اور آپ ہمیں روایتوں، حکایتوں اور قصے کہانیوں کی سیر کرا رہے ہیں۔

فرمایا: ارے بھئی شواھد التنزیل تو اہل سنت کی کتاب ہے۔ حاکم الحسکانی حنفی فرقہ کے محدث ہیں، ابھی میں نے شیعہ مسلک کی کوئی روایت پیش نہیں کی ہے۔

ان باتوں کو چھوڑیئے۔ میں نے تو ابتداء ہی میں یہ بات صاف کر دی تھی کہ دلیل قرآن سے ہونی چاہیے پھر آپ نص قرآنی پر کلام کرنے کے بجائے ادھر ادھر کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

فرمایا: قرآن سے دلیل اور آپ لوگ؟ بھلا آپ کو قرآن سے دلیل طلب کرنے کا کیا حق ہے۔ آپ لوگ قرآن کو مانتے ہی کب ہیں۔آپ کے نزدیک قرآن ناقص ہے، محرف ہے، بہت سی آیتیں اس میں داخل ہونے سے رہ گئیں، بہت سی ضائع ہوگئیں۔ پھر جب آپ کے پاس قرآن مکمل ہی نہیں تو قرآن سے دلیل طلب کرنے کا کیا مطلب؟

بولے: دیکھئے بات اس آیت پر ہورہی تھی، آپ اصل موضوع کو چھوڑ کر دوسری بحثوں میں الجھ رہے ہیں۔

فرمایا: ان بحثوں کا اس آیت سے گہرا تعلق ہے۔اس بات پر آپ یقین رکھتے ہیں یا نہیں جیسا کہ بخاری میں لکھا ہے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا تھا اور اب چھ حرف تو آپ کی دسترس میں نہیں پھر آپ کے ہاں ایسی روایتیں بے شمار ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا۔

دیکھئے بات اصل موضوع پر کیجئے، ابھی ہم مسئلہ تحریف قرآن پر گفتگو نہیں کر رہے ہیں، شیخ حذیفی نے ٹوکنے کی کوشش کی۔

فرمایا: جن لوگوں کا قرآن کی عصمت پر سرے سے یقین ہی نہ ہو، جن کی معتبر کتابوں میں یہ باتیں لکھی ہوں کہ قرآن کی یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی اور اب یوں پڑھی جاتی ہے۔ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف سے تو آپ واقف ہیں نا! وہاں کیا کچھ نہیں لکھا ہے اور اتقان میں عائشہ کی روایت ہے کہ سورہ توبہ میں دوسو آیتیں تھیں مگر اب تو آپ کے قرآن میں صرف ۷۳ ہی آیتیں پائی جاتی ہیں نا۔ اور ابن عمر کی اس روایت کو کیا کیجئے گا کہ میں نے تمام قرآن اخذ کر لیا ہے لیکن اس کا بہت سا حصہ جاتا رہا۔

'پھر وہی خلط مبحث، آپ ٹو دی پوائنٹ (to the point) بات کیوں نہیں کرتے؟'

میں اسی نکتہ پر آ رہا ہوں۔مگر چونکہ آپ بار بار قرآن سے دلیل طلب کرنے پر مصر ہیں اس لیے آپ کو یہ احساس دلانا بھی ضروری ہے کہ جب آپ خود اس بات کے قائل ہیں کہ آپ کے پاس قرآن کامل نہیں، ناقص ہے، تو آپ کس بنیاد پر ہم سے قرآن سے دلیل طلب کرتے ہیں۔

شیخ حذیفی کے لہجے میں جھنجھلاہٹ در آئی تھی۔ کہنے لگے معاف کیجئے گا! نقصِ قرآن جیسے عقیدہ فاسدہ کے بانی مبانی تو آپ لوگ ہیں۔ یہ عقیدہ تو آپ کے ہاں ہے کہ اصل قرآن امام غائب اپنے ساتھ لے کر چلے گئے اور وہ اسے بوقتِ ظہور اپنے ساتھ لائیں گے۔

گفتگو میں مناظرانہ حدّت آتے دیکھ کر میں نے مداخلت کی کوشش کی۔عرض کیا یہ گہرے مسائل ہیں، کھانے کی میز پر حل نہیں ہو سکتے، کیوں نہ انھیں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے۔

'میں بھی ان مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا، میں نے تو صرف ایک آیت کی نشاندہی کی درخواست کی تھی'، شیخ حذیفی نے گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

مگر شیخ فولادی بھلا کب ماننے والے تھے۔فرمایا جب آپ نے مسئلہ چھیڑ ہی دیا ہے تو جواب بھی سن ہی لیجئے، بات یہ ہے کہ اہل سنت کے اکثر علماء خود اپنی کتابوں سے واقف نہیں۔حاکم الحسکانی کا حوالہ آپ کے لیے قابل قبول نہیں۔ بخاری میں سبع احرف کے روایت کی آپ کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے، مسلم میں رضاعت کبیر کی حدیث کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں، پہلے دس گھونٹ چوسنے کی آیت اتری تھی اور اب پانچ گھونٹ والی آیت رہ گئی تو بتائیے نا حضور یہ آیت قرآن میں کہاں ہے؟

عجیب آدمی ہیں! آپ اس آیت پر کلام کیوں نہیں کرتے۔

ہاں ہاں کیوں نہیں لیجئے میں اسی طرف آ رہا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک بات بتائیے کہ آپ اہل علم میں سے ہیں، اختلاف قرأت کی بحثوں سے ناواقف نہیں ہوں گے یہ جو آیت ہے ناو اجعلنا للمتقین اماما تو اس بارے میں امام جعفر الصادق سے پوچھا گیا، ذرا توجہ سے سنئے گا، تاویل آیات الباھرۃ کا حوالہ دے رہا ہوں، بڑی معتبر کتاب ہے۔امام جعفر صادق کے نزدیک اس آیت کی قرأت کچھ اس طرح ہے: واجعل لنامن المتقین اماما۔

ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ نے تو اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے متن قرآن ہی میں تحریف کر ڈالی۔

جناب یہ تحریف نہیں، اختلاف قرأت کی باتیں ہیں، اچھا بتائیے آپ قرأت میں اختلاف کو مانتے ہیں یا نہیں، النشرفی القرأۃ العشر جزری کی معروف کتاب ہے.......

شیخ حذیفی نے بات کاٹتے ہوئے کہا: دیکھئے پھر آپ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔کیا آپ کے پاس کوئی اور قرآن ہے، کیا آپ کے پاس مصحفِ فاطمہ ہے جس میں واجعلنا للمتقین اماما کے بجائے واجعل لنا من المتقین اماما لکھا ہے؟

فرمایا: اب آپ ناسمجھی کی باتیں کر رہے ہیں جو آپ جیسے اہل علم کو زیب نہیں دیتیں۔علماء کے

نزدیک قرأت میں اختلاف پایا جاتا ہے، ایک قرأت کو دوسرے پر ترجیح دینے والے کو منکر قرآن کوئی نہیں کہتا، اور ہاں سنئے آپ پوری بات تو سنتے نہیں، جب امام جعفر صادق سے ابوبصیر نے اس آیت کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا: لقد سألت عظیماً، انما ھی ایانا انا بذلك۔

میرے بھائی جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن سے دلیل لائیے تو اس سے وہ قرآن مراد ہوتا ہے جو ہمارے اور آپ کے زیر تلاوت ہے، اختلافی قرأتوں والا قرآن نہیں۔ اور یہ جو آپ ابوبصیر کا حوالہ دے رہے ہیں تو یہ کوئی معتبر راوی تو ویسے بھی نہیں ہے۔

بہت خوب! ابوبصیر تو غیر معتبر ہو گیا۔ لیکن حفص عن عاصم بن بھدلہ ابی النجو دالکوفی کی قرأت کو آپ سینے سے لگاتے ہیں حالانکہ وہ بھی خبر واحد ہے اور آپ کے نزدیک مجروح راوی ہے۔ اچھا چلئے ابوبصیر کو چھوڑیئے، شیعہ راویوں پر آپ اعتبار نہ کیجئے، آپ اس بات کا انکار تو نہیں کر سکتے کہ الدرالمنثور میں سیوطی نے ابن مسعود کی قرأت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك میں ان علیا مولی المومنین کے الفاظ بھی شامل تھے؟ کن کن باتوں کا انکار کریں گے آپ؟ خود آپ کی کتابوں میں علیؑ کے اثباتِ امامت پر اتنے دلائل موجود ہیں کہ اگر آپ ان کتابوں کو اہل سنت کے تعبیری اور تراثی ادب سے خارج کر دیں تو آپ کے پاس کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔

خیر اس بحث کو چھوڑیئے، یہ امور کھانے کی میز پر فیصل نہیں ہو سکتے۔ گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے میں نے شیخ فولادی سے بظاہر ایک بے ربط سا سوال کیا، پوچھا: کبھی موقع ملے تو اس پر غور کیجئے گا کہ یہ جو ترکت فیکم ثقلین والی روایت رسول اللہ سے منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے پیچھے ثقلین چھوڑے جا رہا ہوں یعنی کتاب اللہ اور عترتی اہل بیتی، تو اگر اصل کتاب ہماری نگاہوں سے اوجھل امام غائب کے پاس محفوظ ہے تو ان کے ظہور تک آپ کس کتاب پر تکیہ کریں گے؟

شیخ فولادی پہلے تو اس سوال پر چونکے پھر فرمایا، میں سمجھ گیا آپ ہمیں کدھر لے جانا چاہ رہے ہیں، ارے بھئی میرے پاس ان سب سوالوں کے جواب ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے سفینہ میں اعلان کا الارم بج اٹھا۔ سامعین سے درخواست کی جا رہی تھی کہ وہ ڈِک کی بالائی منزل میں تشریف لے چلیں جہاں باربی کیوان کا منتظر ہے۔

اوپر ڈِک کے بالائی حصہ میں جابجا گول میزیں نصب تھیں۔ عشائیہ کے ساتھ گائڈ کی تقریر بھی

جاری تھی، یہ فلاں برج ہے، اس کی تاریخ یوں ہے اور وہ فلاں عمارت ہے جس میں فلاں بینک کا عالمی دفتر قائم ہے۔ میرے لیے یہ معلومات نئی نہ تھی سو میں نے دور سفینہ کے گوشہ میں اپنی نشست سنبھالی۔ کچھ دیر کے بعد گائڈ کا اعلان خاتمہ کو پہنچا اور اس کی جگہ ہلکی خوشگوار موسیقی نے لے لی۔ اب ٹیمز کی لہروں پر ہمارا سفینہ محوخرام تھا، دریا کے دونوں طرف بلند و بالا عمارتیں بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں، کھلی فضا میں ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے جسم و جاں کو ایک نئی تازگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اوپر کھلا آسمان، نیچے دریا کی لہروں پر روشنی کا عکس ایک دلفریب منظر پیدا کرتا تھا۔ خیال آیا نیچے کتنی گھٹن تھی، وہی بحثیں، وہی مناقشے، کون مستحق خلافت تھا اور کون غاصب، کس کے حق میں کون سی روایت ہے اور کس کی شان میں کون سی فضیلت منقول ہے، امامت اہل بیت کا حق ہے یا امرھم شوری بینھم کا تابع۔ سچ پوچھئے تو اقوام عالم کی سیادت و امامت پر کوئی تین سو سالوں سے اہل مغرب کا قبضہ ہے، پھر ہم کس امامت کے برحق ہونے یا نہ ہونے پر بحث کر رہے ہیں۔ اور اس بحث نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اپنے سیاسی موقف کو احق ثابت کرنے کے لئے ہم نے ان لغو روایتوں کا سہارا لیا جس کی راست زد عصمتِ قرآن پر پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نقل در نقل کے مراحل سے گذرتے ہوئے اب ان روایتوں میں مستفیض کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ شیعہ ہو یا سنّی، وہ ان روایتوں کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اہلِ سنّت کے علماء کے لئے بخاری اور مسلم میں پائی جانے والی ان روایتوں سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں جو نقصِ قرآن پر دال ہیں اور نہ ہی اہلِ تشیع کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ کتاب الصافی میں پائی جانے والی اس روایت کا یکسر انکار کر سکیں کہ رسول اللہ کے پاس جبرئیل جو قرآن لائے تھے اس میں ۱۷۰۰۰ آیتیں پائی جاتی تھیں جب کہ موجودہ قرآن میں صرف ۶۶۱۶ آیتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا ۱۰۳۸۴ آیتیں ضائع ہو گئیں۔

ان ہی خیالات میں گم نہ جانے میں کب تک دریائے ٹیمز پر محوِ سفر رہا کہ اچانک تیز ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا ایک پٹ کچھ اس طرح کھلا کہ دیوار پر آویزاں پارسی فال کے گھوڑے کی پینٹنگ قریب رکھے صوفے پر آ گری۔ چند لمحے کے لئے کمرے میں بھونچال کی کیفیت رہی۔ میں نے جیسے تیسے بڑی مشکل سے کھڑکی بند کی۔ پینٹنگ کو احتیاط سے اٹھا کر میز پر رکھا۔ آج اس پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے بار بار ذوالجناح کا خیال آیا۔ ذوالجناح بھی تو ایک استعارہ ہے جو اپنے سوار کے بغیر گھر واپس آیا۔ تب سے ذوالجناح کی خالی پیٹھ ایک ایسے سوار کی راہ تک رہی ہے جو غلبۂ حق کے اس نا تمام مشن کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا سکے۔

ایک دن میں نے پروفیسر مہدی زادہ سے پوچھا کہ یہ جو آپ کے ہاں شبیہیں برآمد ہوتی ہیں، علَم

نکلتے ہیں اور لوگ فرطِ عقیدت میں ذوالجناح کو بوسہ دیتے ہیں تو کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہم لوگ من حیث الامہ ایک طرح کی ماضی گزینی کے شکار ہیں؟

مہدی زادہ تاریخ کے پروفیسر ہیں جولندن کی اسی کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اصلاح شیعہ کے نام سے علامہ موسوی کی جو کتاب بازار میں ملتی ہے اور جس نے روایتی شیعہ فکر پر کاری ضرب لگائی ہے اس کے درپردہ مصنف بھی یہی صاحب ہیں۔ ایک دن لابی میں بیٹھے مل گئے۔ بولے: ان علامتوں میں ایک انقلاب پوشیدہ ہے، خوابیدہ انقلاب۔ ایران کا انقلاب ان ہی علامتوں کا مرہون منت ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ایرانی انقلاب اب ان شیعی علامتوں کا قیدی ہو کر رہ گیا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔

مگر انقلاب تو قائم ہے، گزشتہ ۳۵ برسوں میں ایران ایک مستحکم ریاست کے طور پر ابھرا ہے، میں نے توجیہ کی کوشش کی۔

بولے: یہ شیعی علامتیں انقلابیوں کے پیروں کی بیڑیاں بن گئیں۔ سنّی دنیا میں ان علامتوں نے ایک طرح کی نفسیاتی مزاحمت کو جنم دیا۔ علامتوں کی حیثیت دراصل مجربات (instant remedy) کی ہوتی ہے۔ اسے صدیوں کی جمع پونجی سمجھئے جسے زیرک قیادت بحرانی لمحات میں کیش کر لیتی ہے۔ خمینی نے کمال حکمت کے ساتھ یہی کیا۔ البتہ ان علامتوں کا بھی اپنا جبر ہے۔ ایک بار آپ ان کے نرغے میں آگئے تو پھر اس شاکلے سے نکلنا یا اسے توڑ پھینکنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ عاشورہ کی مجلسیں، چہلم کے جلوس، علَم اور شبیہوں کی برآمدگی دراصل ایک طرح کی روحانی تمثیل (spiritual allegory) ہے۔ ایسے عہد میں جب جابر حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق کہنے کا امکان جاتا رہا، عاشورہ اور اربعین کے جلسوں نے رمز و استعارہ میں احتجاج کا فن سکھایا۔ البتہ عوامی سطح پر محرّم کی جزئیات میں جس طرح مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے اور اس طویل سفر میں آج ہم جہاں پہنچے ہیں تو اب یہ سب کچھ ہمارے لئے ایک بڑا چیلنج بن گیا ہے۔ اسے یکسر مسترد کرنا یا لگام دینا اب کسی کے بس کا نہیں۔ ہم تو ابھی تک اس تراشیدہ تاریخ کو لگام نہیں دے سکے ہیں جس کے راویان مشتبہ، جس کی روایتیں باہم ایک دوسرے سے متعارض اور جس کے ناقلین مجہول ہیں۔ صدیوں سے قتلِ عثمان اور سانحۂ کربلا کا تحلیل وتجزیہ جاری ہے لیکن شبہات میں لپٹے ہوئے گمراہ کن بیانات سے اب تک ہمارا پیچھا نہیں چھوٹ سکا ہے۔ پھر جو علامتیں ہم نے عقیدت اور غلو میں تراشی ہیں ان سے کیسے بآسانی دستبردار ہو سکتے ہیں!

۱۷

روبوٹک بیویاں

آج صبح کچھ اس طرح ہوئی جیسے برسوں کی تھکان نے قویٰ مضمحل کردیئے ہوں شیخ سلیمان کی گفتگو، دریائے ٹیمس کا منظر نامہ اور شام کے جنگی محاذ سے آنے والی روح فرسا خبریں، نہ جانے کہاں کہاں عالم خواب میں بھٹکتا پھرا۔ ایسا لگتا تھا جیسے رات بھر کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کرتا رہا ہو، جیسے کوئی مختلف سمت میں اشارہ کرتا ہو گویا نیند کی حالت میں بھی دماغ مسلسل مشغول رہا ہو، جیسے مختلف الجہت کاموں نے اسے معلق (hang) کردیا ہو۔ کتاب البدع کی عبارتیں یاد آئیں پھر خیال آیا شاید وہی صورتحال عود کر آئی ہے جب خواب اور حقیقت گڈمڈ ہوجاتے تھے، جب عالم خواب میں پڑھی ہوئی کتابیں اپنے ادق مضامین کے ساتھ ذہن میں روشن روشن جھلملاتی تھیں مگر پھر بیداری کے بعد تھکان کا یہ عالم ہوتا جیسے کسی سخت اور طویل مہم سے لوٹے ہوں۔ تازہ ہوا کے خیال سے کھڑکی کھولی کیا دیکھتا ہوں کہ دریائے ڈراوا کی دوسری جانب جہاں گھنے درختوں کا سلسلہ افق سے جاملتا ہے، ایسا لگتا تھا جیسے وہاں دور دور تک آگ لگی ہو۔ غور سے دیکھنے سے پتا چلا کہ یہ شعلہ انگیز تابانی سورج کی ان تابناک کرنوں کے سبب ہے جو گھنے درختوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ جھاڑی کی آگ کا یہ منظر دیکھ کر کچھ دیر تک تو میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا، ایسا لگتا تھا تجلئ طور کا یہ منظر کسی موسیٰ کا متلاشی ہو۔ کوئی پندرہ بیس منٹ تک دریا سے ماوراء نور کی یہ ندی رواں رہی، یہاں تک کہ سورج کی تابناک کرنیں ہماری کھڑکی پر راست دستک دینے لگیں۔ میں ان بدلتے مناظر میں کچھ ایسا کھویا کہ تھکن کا احساس پیچھے رہ گیا۔

نیچے نائٹس ہال میں افتتاحی اجلاس جاری تھا۔ کوئی صاحب ڈچ ایکسنٹ میں انگریزی میں تقریر فرمارہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ فنونِ لطیفہ کے بغیر انسانی زندگی بے معنیٰ ہے۔ تجارت، صنعت اور حرفت تہذیب کا ہیولیٰ تیار کرسکتی ہے اس میں روح نہیں پھونک سکتی۔ یہ کام مذہب اور فنونِ لطیفہ کو کرنا ہے۔ فرمارہے تھے کہ

بے روح معاشرہ کچھ اس طرح دیوانہ وار بھاگا کہ پہلے اس میں سے انسانیت رخصت ہوئی اور اب خود حضرت انسان رخصت ہونے کو ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہوا میں انگلی لہرائی، حاضرین کی طرف ایک بار گھوم سے گئے پھر بولے، شاید آپ کو یقین نہ آئے ایک مابعد انسان معاشرہ ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے، بلکہ کہہ لیجئے کہ اس کی ابتداء ہو چکی ہے۔ میں سائنس فکشن کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ روبوٹکس محض اب کوئی کہانی نہیں بلکہ ہماری شخصیت کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ جو آپ کی جیبوں میں اسمارٹ فون ہے تو واقعہ یہ ہے کہ آج کا انسان، انسان پلس فون (Man+Phone) سے عبارت ہے۔ سیکڑوں فون نمبر، ہزاروں صفحات اور مختلف قسم کے دستاویزات جو کبھی آپ کے حافظہ کا حصہ ہوا کرتے تھے اب آپ کے ذہن میں نہیں بلکہ آپ کی جیب میں اسمارٹ فون کی شکل میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے ۱۹۶۹ء میں جب ناسا نے اپنا آدمی چاند پر بھیجا اس وقت ناسا کا مجموعی ڈاٹا جتنا کچھ تھا اس سے کہیں زیادہ آپ کے اسمارٹ فون میں ہے۔ ۱۹۹۷ء میں IBM کا سوپر کمپیوٹر جو پوری ایک عمارت کی جگہ گھیرتا تھا، اس سے آپ کا یہ اسمارٹ فون جو آپ کی جیب میں پڑا ہے، اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ ٹکنالوجی ہر دس سال پر سائز کے اعتبار سے سوگنا چھوٹی ہوتی جارہی ہے اور ہر دو سال پر مروجہ ٹکنالوجی دوگنی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ورنر ونجے (Vernor Vinge) نے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں اس نے آنے والے تیس سالوں میں ایک مابعد انسان عہد کی پیش گوئی کی تھی۔ اس کی یہ پیشن گوئی بڑی حد تک سچ ثابت ہوئی۔ nano-technology کے انقلاب نے اب انسانی خلیے میں ترمیم اور اس کی اصلاح کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ آنے والے دنوں میں آپ کے یہ موبائل فون چھوٹے چھوٹے چپس کی شکل میں یا تو جسم پر نصب ہوں گے یا ہلکے زیورات کے طور پر پہنے جائیں گے اور آج جس طرح اینڈرائڈ یا آئی فون اپنے ماحول میں اپنی نوع کے درجنوں ڈیوائس سے خود کو مربوط اور ہم آہنگ کر لیتے ہیں، اسی طرح آنے والے دنوں میں آپ کوئی پچاس بلین ڈیوائسس سے از خود مربوط رہا کریں گے۔ آج جس طرح ریڈیائی لہریں (GPS) آپ کے مقام اور محل کا تعین کرتی ہیں اسی طرح اس جیسی بے شمار ڈیوائسس خواہی نخواہی آپ کو اس نظام کا حصہ بنا لیں گی۔ انسانوں کی زندگی سے دکھ، درد اور تکلیف ختم کرنے کے لیے انسانی خلیوں میں مداخلت ہوگی تاکہ انسانوں کو اصل تکلیف دہ اور اذیت ناک صورتحال کا ادراک نہ ہو اور وہ گوگل گلاس کے ذریعہ دنیا کا خوشنما منظر نامہ دیکھتے رہیں۔ دماغ میں یا اس سے متصل نئے ڈیوائسس کے ذریعہ حافظہ میں اضافہ یا معلومات کی منتقلی ممکن ہونے کے بعد روایتی تعلیم و تعلم کی فضا یکسر بدل

جائے گی۔ بہروں پر امپلانٹ کا یہ تجربہ کامیاب رہا ہے اور بہت سے بہرے ان ڈیوائسس کے امپلانٹ کے ذریعہ اب سننے پر قادر ہو رہے ہیں۔ گوگل برین کی اگلی منزل یہ ہوگی کہ آپ اپنا دماغ حسب منشاء اپ لوڈ (upload) اور ڈاؤن لوڈ (download) کر سکیں گے۔ خلیوں میں اصلاح و ترمیم کے سبب یہ ممکن ہوگا کہ سو سال کا بوڑھا پچیس سال کا نوجوان دکھائی دے۔ اس پورے منظر نامے کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ خوشی، غم، حزن و مسرت جیسے لطیف جذبات صرف کتابوں میں باقی رہ جائیں گے کہ اصل انسان مصنوعی ڈیوائسس سے جڑ جانے کے سبب وہی کچھ دیکھے اور محسوس کرے گا جو یہ ڈیوائسس اسے دکھائیں گی۔ یہ ایک سنگین صورتحال ہے جسے ہم روایتی دانشوروں (academics) کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔

بڑے صنعت کار اس صورتِ حال کی سنگینی سے واقف ہیں لیکن وہ کوئی موثر قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں آئیڈیالزم کے بجائے سسٹینبل آئیڈیالزم (sustainable idealism) کی راہ اختیار کرنی چاہیے، یعنی ہم وہیں تک جائیں جہاں ہماری منفعت بخش تجارت کے نمو کا امکان باقی رہے۔ فن تجارت کی یہ کانفرنس، جہاں دونوں دنیاؤں کے بہترین دماغ جمع ہیں، آپ کو دعوت دیتی ہے کہ باہم تبادلۂ خیال کے ذریعہ اس صورتحال کا کوئی شافی حل نکالیں۔ بورل کے اس خوبصورت منظر نامہ میں ان عمیق سوالوں کے حوالے سے ہم آپ کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔

کانفرنس ہال سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر پیا پر نظر پڑی۔ وہ موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھیں۔ کہنے لگیں علی کودرا کے انتظار میں ہوں۔ انھیں یہ دوا دینی ہے۔ کودرا خلاف معمول ہشاش بشاش دکھائی دیئے، انھوں نے چند ثانیے دوا کے پیکٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا، کہنے لگے یہ جو آپ ہمیں تھیرپیٹک (therapeutic) ڈرگس پر رکھنا چاہتی ہیں تو آپ نے سنا نہیں کہ یہ کس طرح ہمارے اندرون کو مسخ کرتی ہیں، ہمیں اس سطح پر زندہ رکھنا چاہتی ہیں جو بحیثیت انسان ہماری فطری سطح نہیں ہے۔

یہ خود بھی تو اپنا شعور اور حافظہ اپنی شخصیت سے الگ کبھی اپنے ہاتھ میں اور کبھی اپنے پرس میں لیے پھرتی ہیں، اگر گم ہو گیا تو بڑی کرائسس میں آ جائیں گی، باسم نے پیا کے آئی فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بولیں، بالکل نہیں اگر خدانخواستہ یہ گم ہو جائے تو میں اسے میں آئی کلاؤڈ سے ڈاؤن لوڈ کرلوں گی۔

اس دوران عبدالحمید ہمارے لیے کافی لے آئے تھے۔ پتھر کی سلوں پر پائیں باغ کے عقبی گوشہ میں

جہاں مہمانوں کا اژدہام ذرا کم کم تھا، ہم لوگوں نے اپنی نشستیں سنبھالیں۔

بڑا سحر انگیز (captivating) تھا مستقبل کا یہ منظر نامہ۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہم واقعی ایک ایسے معاشرے کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں انسان اپنی ہی ایجادات واختراعات اور ٹکنالوجی کا تابع مہمل بن کر رہ جائے گا؟ میں نے کودرا کا تاثر جاننا چاہا۔

جی ہاں اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے، کودرا نے اپنی دوا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، میں ان ونڈر ڈرگس (wonder drugs) کا قائل نہیں لیکن یاس و نامرادی (depression) کے جانگسل لمحات میں اگر اسے نہ لوں تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ یہ بھی تو ایک طرح کی ترمیم و تنسیخ ہی ہے، انسانی ذات کی ترمیم و تنسیخ۔

ذات کی ترمیم و تنسیخ کہنا تو شاید مناسب نہ ہو کہ یہ ادوایات آپ کے خلیوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتیں، ویسے بھی یہ پرانی ایجاد ہے اب فی زمانہ Genetic Engineering، Nano Technology اور Robotic Engineering نے انسان کو زیادہ کارآمد اور مؤثر بنائے رکھنے کے جو طریقے ایجاد کیے ہیں وہاں اصل انسان کے رفتہ رفتہ غائب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ مستقبل کو ہم جیسے سیدھے سادے عام انسانوں کی ضرورت نہیں۔ ابھی چند سال پہلے ڈیوڈ لیوی (David Levy) کا ایک بڑا چشم کشا مضمون شائع ہوا تھا، ان کا کہنا ہے کہ ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہو گئے ہیں جہاں روبوٹس نہیں بلکہ انسان نما روحانی مشینیں ہمارے اردگرد متحرک نظر آئیں گی جو اپنے احساس وجذبات میں انسانوں کی طرح ہوں گی لیکن کارکردگی میں ان سے کہیں بڑھ کر۔ لیوی (Levy) تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ۲۰۵۰ء تک انسانوں اور روبوٹس کے مابین باہم شادیاں ہوا کریں گی۔

پھر تو بڑا لطف آئے گا، عبدالحمید نے مداخلت کی۔

یہ لطف نہیں، خوف کا مقام ہے۔ پتا چلا کہ آپ جس خاتون کے عشق میں گرفتار ہوئے اور ان کے ناز وانداز پر فریفتہ ہو گئے وہ بالآخر ایک روبوٹ نکلی، باسم نے اظہار خیال کیا۔

لیکن یہ پروگرامڈ (programmed) ہونے کے سبب کہیں زیادہ مطیع بیویاں ثابت ہوں گی، کودرا نے قہقہہ لگایا۔

جی ہاں مردوں کی اتباع، سپردگی کی تمام توقعات نئی روبوٹک بیویوں سے پوری ہو جایا کریں گی،

پیا نے کہا۔

کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ یہ باتیں حقیقت سے کہیں زیادہ سائنس فکشن ہوں یا فاضل مقرر کا شدتِ احساس؟ باسم نے سوال قائم کیا۔

بولی، ہم واقعی ایک ایسے ہی مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں، ابھی کچھ دنوں پہلے کیون فو نگ (Kevin Fong) کی کتاب آئی ہے: Extremes۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے دکھایا ہے کہ فی زمانہ انسان کی فیزیالوجی (Physiology) سے جس طرح چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے، مثلاً اس کے جسم کی سرجری سے پہلے حالت انجماد پر لے جانا تا کہ لمبے آپریشن میں دماغ تک اثر نہ پہنچے، اس طرح کی ٹیکنک میں اب ہمارے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اس کے قلب کی حرکت کو روک دیں۔ انسان سانس لینا بند کردے گویا ہر اعتبار سے اس پر ایک طرح کی موت طاری کردی جائے لیکن پھر اس کے بعد ایک خاص انداز سے اس کو حدّت پہنچانے کے بعد اسے دوبارہ اس طرح بیدار کرنا ممکن ہے جیسے وہ گہری نیند سے اٹھا ہو۔ اب چند دہائی پہلے کی بات ہے جب کسی ٹھنڈے انسان کو جس کی نبض ڈوب گئی ہو اور سانس بند ہو، ہم فی الفور مردہ قرار دیتے تھے۔ لیکن اب آدھ پون گھنٹہ تک زندگی چھین لینے کے بعد اسے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹانے کو فن طب کی حسن کارکردگی سمجھتے ہیں۔ بات تو طول العمری (Longevity) کی ہورہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک طرح کی ابدیت کا حصول ہمارے ایجنڈے پر ہے۔ پیا نے وضاحت کی۔

پھر مسئلہ کا حل کیا ہے؟ عبدالحمید نے، جو ابھی چند ثانیے پہلے تک روبوٹک دلہنوں کے تصور سے نہال ہوئے جارہے تھے، سنجیدگی سے پوچھا، بولے کیا واقعی آنے والے دنوں میں اصلی اور فطری انسان اپنے ہی بنائے ہوئے روبوٹس کے مقابلے میں اپنی ناقص اور کم تر کارکردگی کے سبب خود کو تہذیب کے حاشیہ پر محسوس کرے گا۔ کیا واقعی ہم نے مستقبل کا جو منصوبہ ترتیب دیا ہے اس میں ہم جیسے انسانوں کے لیے اب کچھ زیادہ گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

باسم نے کہا: جی ہاں بظاہر تو یہ سب کچھ سائنس فکشن لگتا ہے لیکن حالات اسی رخ پر جارہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں ابوظہی میں تھا۔ میں شہر کے مختلف علاقوں میں گھوما پھرا مجھے حیرت ہوئی کہ جہاں بھی جایئے ایک ہی لحن اور ایک ہی زیروبم میں اذان کی وہی مترنم آواز سنائی دیتی ہے۔ پتا چلا کہ وزارتِ اسلامی نے تمام مسجدوں کی اذانوں کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کردیا ہے کہ اب ایک ہی اذان ایک ہی وقت میں مرکزی نظم کے

تحت کچھ اس طرح گونجتی ہے کہ دوسری اذان سے آگے پیچھے نہیں ہوتی اور نہ باہم ٹکراتی ہے۔ گویا موذن کے بجائے یہ کوئی ڈیوائس ہے جس نے ہماری مسجدوں میں اذان دینے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔

عجیب! مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ بھی ہو رہا ہے۔ پہلے ماذنہ غائب ہوئے، پھر مناروں کی حیثیت علامتی رہ گئی، لاؤڈ اسپیکر کے آجانے کے بعد مؤذن اپنے حجروں سے اذان دینے لگے اور اب پتا چلا کہ مؤذن ہی غائب ہو گیا۔ دیکھئے اسی کو تو کہتے ہیں مابعد انسان معاشرہ۔ کودرا نے چٹکی لی۔

مگر بے مؤذن کی اذان پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا، عبدالحمید نے پوچھا۔

اعتراض کون کرے، اکثر لوگوں کو اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ اذان کی یہ خوش الحانی غیر انسانی ڈیوائس کے دم سے قائم ہے۔ پھر دولت مند عرب معاشرے میں جہاں حکومتیں منبر کنٹرول کرتی ہیں، کھلی گفتگو اور تحلیل وتجزیہ کی کوئی روایت نہیں۔ حکومتیں دولت کے بل بوتے پر ٹکنالوجی درآمد کر لیتی ہیں۔ حکمراں طبقہ اس احساس سے سرشار ہوتا ہے کہ وہ دولت کے بل بوتے پر بہترین ٹکنالوجی خرید سکتا ہے۔ انھیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ ہمیں کہاں لے جا رہی ہے۔ باسم نے صورتحال کی وضاحت کی۔

مؤذن رخصت ہوئے اب دیکھئے امام کی باری کب آتی ہے۔ اگر ان عربوں کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ کوئی مسلم روبوٹ عبدالباسط یا سدیس کے لحن میں تلاوت کر سکتا ہے تو انھیں ہندوستانی، پاکستانی اماموں کی خدمات سے شاید نجات مل جائے۔ ویسے بھی یہ ان کے اپنے مسلک کے ہوں گے اور وہی خطبہ دیں گے جو حکومتیں چاہیں گی۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ اچانک پیا کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی، انھیں انتظامی امور کے لیے جانا تھا۔ انھوں نے دواؤں کی بابت کودرا کو بعض ضروری ہدایات دیں، رخصت لی، اور اس دلچسپ گفتگو کو ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عبدالحمید پانی کا گلاس لے آئے اور کودرا نے باصرار دوا کھالی۔

کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟ ویسے ماشاءاللہ آج آپ کھلے کھلے سے لگ رہے ہیں۔ عبدالحمید نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے، میں رات آپ کے کمرے میں گیا تھا تب تک شاید آپ سو چکے تھے۔

بولے، الحمدللہ بشاشت محسوس کر رہا ہوں۔ شاید موسم کا بھی اثر ہو۔ آج بڑی غیر معمولی صبح ہوئی ایسے مناظر بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں، ارے وہاں دیکھئے بائیں باغ کے جھروکے میں کیا شعلہ فشانی ہو رہی ہے،

جیسے سورج کی کرنیں نہ ہوں بلکہ نور کی ندّیاں رواں ہوں۔

جی ہاں! یہ بڑا غیر معمولی نظارہ ہے۔ کبھی کبھی ہمارے ہاں بڑگام میں بلند پہاڑیوں پر بارش کی روشن صبح میں ایسا منظر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

شاید یہ اسی خوبصورت موسم کا اثر ہے کہ آج میں اپنے اندر بڑی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔

مگر ایک بات پوچھوں اگر آپ اجازت دیں۔ عبدالحمید نے کودرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں کیوں نہیں ضرور۔

کل جب آپ پر نیم غشی کا عالم طاری تھا، آپ کی زبان سے بار بار صفین اور نہروان کے الفاظ نکل رہے تھے، میرا بھی تعلق چونکہ مومنین سے ہے اس لیے میں نے سوچا کہ موقع ملا تو آپ سے اس بابت سوال کروں گا۔ یہ سن کر کودرا کی آنکھیں چند ثانیے کے لیے کھلی کی کھلی رہ گئیں، انھوں نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا جیسے اپنے آپ کو سنبھالا دے رہے ہوں پھر بولے، بھائی یہ ایک بڑی جانگسل کہانی ہے، پھر کبھی۔

میں نے سوچا کہ صفین اور نہروان کا تذکرہ مبادا کودرا کو پھر سے تشنج سے دوچار نہ کر دے سو میں نے بات سنبھالنے کی خاطر کہا کہ کودرا مذہب اور تاریخ کے عالم ہیں، مدینہ اور قم کی دانشگاہوں سے وابستہ رہے ہیں۔ سنّی اور شیعی دنیا کے کبار علماء سے آپ کے گہرے تعلقات ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ اپنی ساری زندگی اتحاد اسلامی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

واقعی! مجھے اس طرح کی کچھ بات لگتی تو تھی، یہ تو لگتا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے یہ کہتے ہوئے عبدالحمید نے فرط احترام میں کودرا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، بولے، مولا آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے۔

باسم جو اچانک عبدالحمید کی شیعی شناخت کے افشا ہونے سے کچھ جز بز سے دِکھ رہے تھے، انھوں نے بھی عبدالحمید کے دعائیہ کلمات پر آمین کہا۔ اتحاد اسلامی وقت کی ضرورت ہے مگر یہ کام ہوگا کیسے؟ جن لوگوں نے مولا علی کو خلافت سے محروم کیا اور جنھوں نے پیغمبر کی ذرّیت کو اذیت دی، ان سے شاید کوئی اسٹرٹیجک سمجھوتہ تو ہوسکتا ہے لیکن نظری اتحاد یا اخوت ومحبت کے تعلقات کیسے قائم ہوسکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں اہل تشیع کے ہاں بڑا کنفیوژن ہے۔

کنفیوژن نہیں، کنفیوژن تو بہت چھوٹا لفظ ہے، اسے ذہنی عذاب کہئے، فکری تعذیب کہیے، ویسے تو اس کے لیے صحیح لفظ فتنہ ہے لیکن اب کثرتِ استعمال سے اس لفظ کی شدت کم ہوگئی ہے۔ ہماری صالح طبیعتیں باہم اتحاد واشتراک چاہتی ہیں لیکن ہماری فرقہ وارانہ تاریخ، تراشیدہ حکایتیں اور مکذوبہ روایتیں ہمیں ایک جسد واحد میں تبدیل ہونے نہیں دیتیں، میں نے کہا۔

اور شاید ہونے بھی نہیں دیں۔ ارے کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ کودرا کے لہجہ سے بیزاری نمایاں ہورہی تھی۔

پھر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے یا نہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟ عبدالحمید نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

راستہ تو ہے مگر اس راستہ کو نہ سنّی اختیار کرنا چاہتے ہیں اور نہ شیعہ، دونوں ہی فرقے حکایتوں اور روایتوں کی دنیا کے اسیر ہیں، وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔

آخر ایسا کیوں؟ آپ نے یقیناً اس مسئلہ کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہوگا۔

کل حزب بما لدیهم فرحون میں بڑی عافیت ہے۔

کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔

دیکھئے بات بہت سیدھی سی ہے۔ دونوں فرقوں کے پاس تاریخ کا اپنا الگ الگ بیانیہ ہے جو باہم ایک دوسرے سے مزاحم ومتحارب ہیں۔ دونوں ہی بیانیے اصل واقعات کے بجائے قصے، کہانیوں، حکایتوں اور اباطیل پر مشتمل ہیں۔ اب اگر عقل اور وحی کی روشنی میں ان کا تحلیل وتجزیہ کیا جائے تو یہ دونوں ہی بیانیے ساقط الاعتبار ہوجاتے ہیں، بیانیوں کی موت فرقوں کی موت ہے، پھر جنھیں دین سے کہیں زیادہ اپنا فرقہ عزیز ہے وہ بھلا اس کام کے لیے کب تیار ہوں گے۔

ہرگز تیار نہیں ہوں گے، کودرا نے بات کاٹتے ہوئے مفتیانہ لہجہ میں فیصلہ سنایا اور پھر پتھر کی سِل سے ٹیک لگائے دور خلا میں ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے جیسے کوئی اہم نکتہ یاد کرنے کی کوشش کررہے ہوں۔

مگر اس وقت تو ایران کے سبب شیعی دنیا میں ایک ابال سا آیا ہوا ہے۔ میرے خیال میں معاملہ نظری سے کہیں زیادہ سیاسی ہے، باسم نے صورتحال کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

سیاست اپنی جگہ لیکن کچھ تو ہے جسے سیاسی لوگ اپنے حق میں استعمال کررہے ہیں، اب دیکھئے

ایران میں ہر سال بڑے پیمانے پر اتحاد اسلامی کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جن لوگوں نے مولا علی کا حق غصب کیا، رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی بتول کے درپئے آزار ہو گئے حتیٰ کہ ان کا گھر جلانے کے لیے آئے اور اس شور و ہنگامہ میں فاطمہ کے پیٹ پر دروازہ گرا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور وہ اس دنیا میں زیادہ دن نہ رہ سکیں۔ جن لوگوں نے علی کی گردن میں رسی باندھ کر مدینہ کی گلیوں میں پھرایا ان لوگوں سے اگر کسی وقتی مصلحت کے سبب مواخاۃ قائم کر بھی لی جائے تب بھی دلوں کے اندر تو آگ جلتی رہے گی نا! شیعہ علماء اس سوال کا جواب نہیں دیتے، عبدالحمید نے شکوہ کیا۔

وہ دے بھی نہیں سکتے، دراصل وہ جن کتابوں پر ایمان لائے ہیں ان میں زہر آلود روایتیں، خلاف عقل حکایتیں اور خرافات و اباطیل کا ایک انبار ہے، گزرتے وقتوں کے ساتھ ان کتابوں نے تقدیسی حیثیت اختیار کر لی ہے، ان کے اصحاب عقل ان کتابوں کے ناقدانہ تجزیہ کی ضرورت تو محسوس کرتے ہیں مگر اپنے اندر اس کام کی ہمت نہیں پاتے۔

مگر اس طرح کی باتیں تو سنّی کتابوں میں بھی لکھی ہیں....

ارے بھئی سنّی بھی تو روایتوں کے اسیر ہیں، تراشیدہ تاریخ کے قیدی، ان کی کتابوں میں بھی رطب و یابس کی کمی نہیں، میں نے کہا۔

ویسے سنیوں کی اپنی کوئی کتاب تو ہے بھی نہیں، کودرا نے مداخلت کی، بولے، یہ جو بخاری مسلم اور صحاح ستہ کے دوسرے مجموعے ہیں یا مسند احمد ہی کو لیجئے، انھیں سنّی روایتوں کے مجموعے قرار دینا امر واقعہ کے خلاف ہوگا۔ یہ کتابیں اس دور میں مرتب ہوئیں جب شیعہ سنّی الگ الگ فرقوں کی شکل میں وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لیے ان کتابوں میں آپ کو دونوں فرقوں کی روایتیں ملتی ہیں۔ مثلاً بخاری میں متعدد جگہوں پر ہے کہ رسول اللہ بوقت وصال وصیت لکھوانا چاہتے تھے لیکن حضرت عمر نے حسبنا کتاب اللہ کہہ کر اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ مسلم میں متعہ اور خمرہٴ نماز کی روایتیں موجود ہیں اور مسند احمد میں من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کی روایت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آج آپ جن کتابوں کو سنّی کتابیں سمجھتے ہیں دراصل یہ ہمارا مشترکہ سرمایا ہے۔

مگر شیعوں کی تو اپنی کتابیں ہیں، کتاب الکافی، من لایحضرہ الفقیہ، الاستبصار اور تہذیب الاحکام وغیرہ، عبدالحمید نے وضاحت کی۔

جی ہاں شیعوں کی کتب اربعہ بعد میں مرتب ہوئیں۔ آل بویہ کی امیر الامرائی میں اور جب شیعوں نے روایت کی اپنی کتابیں علیحدہ مرتب کرلیں تو انھیں اس اجتماعی سرمایے سے اشتغال کی ضرورت باقی نہ رہی، اور پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ان اجتماعی کتابوں کو مشترکہ سرمایے کے بجائے سنّی مجموعوں کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

اچھا تو یہی سبب ہے کہ حدیث کی سنّی کتابوں میں جا بجا شیعہ موقف کی روایتیں ملتی ہیں، باسم جو اس انکشاف پر متحیر نظر آتے تھے بولے۔ پوچھا پھر سنیوں نے اپنی کتابیں علیحدہ مرتب کیوں نہ کیں؟

کو درا مسکرائے بولے، انھیں تو سب چیزیں بنی بنائی مل گئیں، وہ کیوں محنت کرتے، ارے بھئی جب ایک بڑے گروہ سے ایک چھوٹا گروہ الگ ہوتا ہے تو وہ صرف اپنی علیحدہ شناخت نہیں بناتا بلکہ دوسرے گروہ کو بھی خواہی نخواہی ایک شناخت عطا کر دیتا ہے۔ شیعوں نے اگر اپنی کتابیں الگ نہ کی ہوتیں، قبول روایت اور تاویل متن کے علیحدہ اصول متعین نہ کیے ہوتے اور محبت اہل بیت کے سماجی مظاہر کا تعین نہ کیا ہوتا تو سنّی فرقہ کی شناخت بھی قائم نہ ہوتی۔

عجیب! چلئے شیعوں نے تو فرقہ بنایا، کتابیں الگ کیں، رسوم ایجاد کیے لیکن اگر سنّیوں کا دامن واقعی فرقہ بندی سے پاک ہے تو پھر ان کا کام ان سنّی مجموعوں کے بغیر کیوں نہیں چلتا؟

کیسے چلے، فرقہ جو بن گئے، یہ کتابیں تو سمجھئے ان کے گلے پڑ گئی ہیں جنھیں وہ اپنی کتابیں سمجھنے پر مجبور ہیں ورنہ جب یہ کتابیں مرتب ہو رہی تھیں اور اس میں ہر طرح کی نزاعی روایتیں، باہم متحارب اخبار مدوّن ہو رہے تھے اس وقت کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ آگے چل کر ان کتابوں کو اس قدر تقدیسی حیثیت حاصل ہو جائے گی کہ انھیں صحاح ستہ سے ملقب کیا جا سکے گا۔

گویا آپ کے خیال میں صحاح ستہ کی اصطلاح بعد کی ایجاد ہے؟ باسم نے پوچھا۔

جی ہاں بہت بعد کی۔ بلکہ آج بھی جب اس عمل پر صدیاں گزر چکی ہیں ہمیں یہ پتا نہیں کہ یہ چھ کتابیں کون کون سی ہیں۔ کوئی ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کرتا ہے تو کوئی موطا کو۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ شیعوں کا دین اب ان کی کتب اربعہ کے تابع ہے اور سنّی اسلام صحاح ستہ سے غذا حاصل کرتا ہے۔ اگر دونوں فرقے کھلی آنکھوں سے اپنی کتابوں کا مطالعہ کریں اور وحی اور عقل کی روشنی میں ان کے تحلیل و تجزیہ کی ہمت کر سکیں تو دونوں فرقوں کو اپنے تراشیدہ اسلام کی عمارت منہدم ہوتی ہوئی محسوس ہوگی۔ لوگ جس چیز کو مدت سے دین سمجھ

بیٹھے ہیں، اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، تقدیسی تاریخ کا جبر بڑا سخت ہوتا ہے۔ اب اسی بات کو لیجئے، بخاری کے مطابق عمر نے نعوذ باللہ رسول اللہ کی شدید خواہش کے باوجود انہیں وصیت لکھوانے سے روک دیا، وہ حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ ابوبکر کی ذات سے فاطمہ کو ایسی تکلیف پہنچی کہ جیتے جی پھر انھوں نے ابوبکر سے بات نہ کی۔ سنّی جب ان واقعات کو پڑھتے ہیں تو ان کے دل میں شیخین کی بے داغ شبیہہ کیسے باقی رہ پاتی ہے۔ وہ ابوبکر اور عمر کے بے داغ اتباع رسولؐ کے بھی قائل ہیں اور دوسری طرف روایت کی کتابوں میں پائے جانے والے ان مجروح واقعات کو مسترد کرنے کی ہمت بھی نہیں جٹا پاتے، پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ایک تعذیب ذہنی اور انتشار فکری کے ساتھ جیتے رہیں۔

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سنّی کتابوں میں رسولؐ کی حکم عدولی اور بتول کو اذیت دینے والے جو واقعات درج ہیں وہ غلط ہیں؟

بالکل! یہ ان عظیم المرتبت اصحاب کی جلالت کے خلاف ہیں اور خود عہد رسولؐ کی کوئی اچھی تصویر پیش نہیں کرتے۔ وقت کا رسولؐ جس کے ابرو واشارے پر پوری امت جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی ہو بھلا اس کی خواہش کے آگے کسی عمر کے لیے یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ وہ رسولؐ کو وصیت لکھوانے سے روک دیں۔

مگر تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ان حضرات نے آنکھیں پھیر لیں۔

ارے بھئی میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تاریخ خواہ وہ روایات وآثار کی سطح پر ہو جسے محدثین نے مدون کیا ہے یا واقعات کی شکل میں جسے مورخین نے مرتب کیا ہے، ان کے سخت محاکمہ کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر رطب ویابس کی بھرمار ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کتنا زہر ہے اس بیانیہ میں کہ ابوبکر کی بیعت سے علی انکاری تھے، عمر ان کا گھر جلانے کے لیے آئے، رسول اللہ کے وصال کے بعد آپؐ کی بیٹی پر بڑا سخت وقت گزرا، وہ قبر رسولؐ پر اپنے باپ سے شکایت کے لیے گئیں، اس منظرنامے پر کس کا دل خون نہ ہوا جاتا ہوگا؟

مگر یہ تو امر واقعہ ہے؟ عبدالحمید نے جرح کی۔

یا اللہ میں کیسے سمجھاؤں، میں یہی تو کہہ رہا ہوں زہر ہے زہر یہ تاریخ نہیں، نری خرافات ہے، صد فیصد جھوٹ۔

کچھ تو حقیقت ہوگی، چلئے مبالغہ آمیزی کہہ لیجئے۔، محرم کی مجلسوں میں ہمارے ہاں یہ واقعات تو

بڑی کثرت سے سنائے جاتے ہیں، ہوسکتا ہے اس میں ہمارے ذاکرین کی معجز بیانیوں کو بھی دخل ہو لیکن کچھ تو حقیقت ضرور ہوگی ورنہ یہ واقعہ اتنا مشہور کیوں ہوتا۔

'میں بتاتا ہوں' کودرا نے مداخلت کی۔ بولے: سلیم بن قیس ھلالی کی ایک کتاب ہے جو اس روایت کا واحد ماخذ ہے، خود شیعہ علماء اسے ثقہ نہیں سمجھتے۔ پھر اس کتاب کے مصنف کا نام بھی بڑے مشتبہ انداز سے ہم تک پہنچا ہے۔ حضرت علی کے اصحاب میں ایک شخص تھا آبان، کہتے ہیں کہ سلیم نے مرتے وقت اسے اس کتاب کا مسودہ یہ کہہ کر حوالے کیا کہ یہ ایک امانت ہے۔ اس مجہول راوی اور منسوب الیہ مصنف کو ہٹا دیجیے تو اسلامی تاریخ سے اس مکذوبہ روایت کا انخلاء ہو جاتا ہے۔ کوئی اور دوسرا ماخذ نہیں ہے جہاں سے یہ گھر جلانے کی روایت ہم تک پہنچی ہو لیکن چونکہ ذاکرین کے لیے ان قصے کہانیوں میں بڑا مسالہ ہے وہ اس کے رقت آمیز بیانات سے سامعین کا دل اپنی مٹھی میں لیے رہتے ہیں، انھیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ اس طرح وہ کذب وافتراء کی اشاعت کو ہوا دے رہے ہیں۔

اور وہ فدک کے مسئلہ پر فاطمہ کی ناراضگی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے وہ تو بخاری میں موجود ہے نا۔

جی ہاں وہ بھی کم دلچسپ لطیفہ نہیں۔ فاطمہ کی ناراضگی کی یہ داستان عائشہ کے حوالے سے بیان ہوئی ہے، راوی شہاب زہری ہیں، ویسے تو بتول کے حامیوں میں عائشہ مطعون ہیں لیکن فاطمہ کی بے بسی کی اس مفروضہ داستان کو وہ عائشہ کے حوالے سے قبول کر لیتے ہیں۔ شہاب زہری کے علاوہ اس طرح کے واقعات کا کوئی اور راوی نہیں۔ سلیم بن قیس اور شہاب زہری کو ہٹا دیجیے تو یہ مکذوبہ روایتیں چشم زدن میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اسّی فیصد نفرتیں ان ہی دو اشخاص کی روایتوں کا شاخسانہ ہے۔ ان دو حضرات کو جن میں سے ایک مجہول اور دوسرا غیر ثقہ ہے، یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ہماری اجتماعی تاریخ کو یرغمال بنالیں۔

مگر اس طرح تاریخ آثار کو اگر یکسر مسترد کر دیا جائے تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا، اب دیکھئے اہل بیت پر ظلم کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا، حسین مظلوم کربلا میں شہید ہوئے، یہ سب تو زندہ جگمگاتی تاریخ کے روشن ابواب ہیں، عبدالحمید نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔

معاف کیجئے گا کودرا نے سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا، بولے، یہ جو آپ نے اہل بیت کی اصطلاح استعمال کی تو اسے بھی از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اہل بیت سے آپ کے نزدیک کون لوگ مراد

ہیں؟

اب اس پر بھی کلام کی گنجائش ہے؟

نہیں بتائیے تو سہی، کودرا نے جرح کی۔

بھلا پنجتن کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی آلائشات سے پاک کر رکھا ہے، عبدالحمید نے اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ وہ آیت ہے نا ویطھر کم تطھیرا والی۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا، باسم نے لقمہ دیا۔

جی ہاں پوری آیت پڑھیے، اس آیت میں پنجتن کا دور دور تک تذکرہ نہیں ہے۔

وقرن فی بیوتکن ......

نہیں، ابتدائے آیت سے۔

یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض و قلن قولا معروفا۔وقرن فی بیوتکن و لا تبرجن تبرج الجھلیۃ الاولی و اقمن الصلوۃ وآتین الذکوۃ واطعن اللہ و رسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا۔

اس آیت میں اور اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی خطاب نبی کی بیویوں سے ہے، انھیں بتایا جا رہا ہے کہ وہ عام عورتیں نہیں ہیں، انھیں اعلیٰ اخلاقی معیار کا مظاہرہ کرنا ہے ان کا گھر کوئی عام گھر نہیں یہاں خدا کی آیات نازل ہوتی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں متمکن رہیں، خدا چاہتا ہے کہ ان سے آلاَ شات کو دور کر دے۔ اب جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر قرآن مجید کی ان آیتوں کو پڑھے گا وہ اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لے گا۔

مگر یہ تو ہم اہل سنت کے ہاں بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ اہل بیت میں فاطمہ کے گھر والے بھی داخل ہیں، حدیث کساء کے مطابق، جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسولؐ نے علی، فاطمہ، حسن، حسین کو ایک چادر میں لے کر دعا فرمائی، اللھم ھولاء اھل بیتی وعترتی فاذھب عنھم الرجس وطھر ھم تطھیرا ۔ میرے خیال میں سنّی ہوں یا شیعہ دونوں ہی کے نزدیک اہل بیت سے مراد فاطمہ اور ان کی اولاد ہیں، باسم نے سنّی نقطۂ نظر کی وکالت کی۔

ارے بھئی میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ شیعہ، سنّی دونوں ہی روایتوں کے اسیر ہیں۔ وہ قرآن کو اس کے اصل رنگ وآہنگ میں پڑھنا ہی نہیں چاہتے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک سیدھی سی بات اس قدر متنازع بنی کہ اصل مفہوم بہت پیچھے رہ گیا، شیعہ ازواج نبیؐ کو اہل بیت میں شامل کرنے سے انکاری ہیں، سنّیوں نے اہل بیت کے تصور کو وسعت دے کر اس میں ازواج نبیؐ کے علاوہ آل فاطمہ کو شامل کر رکھا ہے، مسلم میں زید بن ارقم کی ایک روایت ہے کہ میں اپنے پیچھے ثقلین چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب اللہ اور عترت اہل بیت۔ زید بن ارقم سے جب پوچھا گیا کہ کیا آپؐ کی ازواج اہل بیت میں شامل ہیں، کہا ہاں مگر یہاں اس سے مراد وہ اہل بیت ہیں جن پر آپؐ کے بعد صدقہ حرام ہے جیسے آل علی، آل عقیل، آل جعفر اور آل عباس، اب دیکھئے ان روایتوں نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آگے چل کر ان ہی روایتوں کے طفیل اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان بتایا گیا بلکہ عین قرآنی مفہوم کے بالکل برعکس ابوسعید خدری سے آیت تطہیر کے ضمن میں یہ روایت نقل کی گئی کہ نزلت في خمسة: في رسول الله وعلي وفاطمه والحسن والحسين عليهم السلام۔ اب آپ ہی بتائیے کہ تاویل وآثار کے ان متحارب بیانات میں عام قاری کیا کرے، کودرا نے کربناک لہجہ میں کہا۔

مگر آل فاطمہ کی شمولیت پر تو علمائے اسلام کا اجماع ہے، شیعہ اور سنّی دونوں حلقوں میں اس بارے میں روایتوں کی اتنی کثرت اور شہرت ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔

میں بھی تو یہی عرض کر رہا ہوں کہ دونوں فرقے روایتوں کے اسیر ہیں، وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔ ان دونوں نے روایتوں کے بل بوتے پر قرآن مجید کی سیدھی سچی آیتوں میں وہ مفاہیم پیدا کیے ہیں کہ اصل مفہوم ہی معطل ہو کر رہ گیا۔ يحرفون الكلم عن مواضعه کے دونوں ہی مجرم ہیں، دونوں نے حسبِ توفیق اہل بیت کے قرآنی مفہوم میں تحریف کی اور پھر ایسی روایتوں کا انبار لگا دیا جس کے مطابق آل علی یا آل عباس کی ذریت کا احترام دین کا حصہ بن گیا، جو قرآن ان اكرمكم عندالله اتقاكم کا علمبردار تھا اس کے حاملین میں مزعومہ سیدزادوں کی بہار آ گئی۔

کودرا کی گفتگو میں اب آبشار کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی، ایسا لگتا تھا اب وہ رکنے والے نہیں۔ عبدالحمید حیرت زدہ تھے کہ پنجتن کو ہی اہل بیت سے باہر کر دیا گیا تو پھر دین اسلام میں کیا بچے گا؟ ادھر باسم اس خیال سے پریشان تھے کہ سیکڑوں سال کے اجماع کو اس طرح رد کرنا اہل علم کا شیوہ نہیں۔ وہ مزید اپنی بے چینی کو نہ چھپا سکے، بولے، معاف کیجئے گا اگر اس طرح ہم نے اجماع امت کو یکسر مسترد کر دیا تو پھر ہمارے پاس

کیا بچے گا؟ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔

بولے اسی کی تو ضرورت ہے، ہم قرآن مجید کو کیوں نہیں بولنے دیتے، اس کے بیان کو حجت کیوں نہیں مانتے؟ شیعہ سنّی تنازع کی ساری بنیادیں یہی روایتیں ہیں۔ فتنہ کے ایام میں ان تراشیدہ روایتوں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ ایک ایک محدث کو کئی کئی لاکھ روایتوں کو مسترد کرنا پڑا۔ جب ان لاکھوں روایتوں کے استرداد سے اسلام میں کوئی نقص واقع نہیں ہوا تو بچی کھچی روایتوں کو بھی اگر تقدیسی مقام سے ساقط کر دیا جائے اور ہم ایک بار پھر قدماء کے فہم تاویل و تاریخ پر قرآن کے روشن بیانات کو حکم بنا سکیں تو ہمارے لیے قصے کہانیوں کی مصنوعی فضا سے نکل کر وحی کی روشنی میں چلنا آسان ہو جائے گا۔

ایسا لگتا تھا کودرا کی باتوں سے عبدالحمید کچھ متوحش سے ہو گئے ہوں۔ بولے: آپ تو قم میں رہے ہیں، مومنین کے درمیان اٹھے بیٹھے ہیں، کتنی شدید محبت کرتے ہیں ہم مولا علی سے، حسین ہمارے لیے منتہائے عبودیت ہیں، حسین کے لیے گریہ کرنا وجہ نجات ہے: من انشد فی الحسین شعرا فتباکی فله الجنة۔ اب آپ اہل بیت کے خانے سے حسین ہی کو نکال دیں گے تو حسین مظلوم کے لیے رونے والی آنکھ آخر کہاں سے آئے گی؟ عبدالحمید نے کودرا کے سامنے اہل بیت کا مقدمہ رکھنے کی کوشش کی۔

'میرے بھائی! حسین کو رونے والی آنکھ اور سینہ کوبی کرنے والے ہاتھ کی ضرورت نہیں، انھیں تو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کے نانا کے دین کو اپنی اصل اساس پر پھر سے قائم کر دیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو ہم غمِ حسین منانے کے بجائے جشنِ حسین منانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ضرورت تو حسینی مشن کو آگے بڑھانے کی ہے۔ محض آہ و بکا سے کچھ ہونے والا نہیں۔ راویوں نے جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ تراشیدہ قصے کہانیوں اور اباطیل کا ایک لامتناہی ذخیرہ مرتب کر دیا ہے جس میں آنے والے وقتوں میں شعر و سخن کی زرخیزی اور ذاکرین کی شعلہ فشانی مسلسل اضافہ کرتی رہی ہے، یہ ایک ایسا دلدل ہے جس میں اگر آپ ایک بار پھنس گئے تو تمام خواہش کے باوجود اس سے نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔

چلیے سر دست یہ مانے لیتے ہیں کہ آیتوں کی تشریح و تاویل میں روایتوں نے گڑبڑی کر دی لیکن حسین مظلوم کی شہادت تو تاریخی واقعہ ہے اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے؟ یہ کہتے ہوئے عبدالحمید کچھ اس فاتحانہ شان سے مسکرائے جیسے مجمع سے نعرۂ حیدری بلند ہونے کو ہو۔

بولے: حسین مظلوم کی شہادت سے بھلا کسے انکار ہے، وہ اصلاحِ احوال کے لیے گھر سے نکلے،

سلیمان بن صرد جیسے صحابی کی دعوت پر کوفہ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔لیکن شہادتِ حسین کی تفصیلات جس انداز سے ہم تک پہنچیں ہیں اور جس کی بھیانک منظر کشی سے آج بھی جذبات میں ابال آجاتے ہیں اور جس پر مستزاد وہ روایتیں جو حسین کے لیے رونے اوران کا ماتم کرنے کو جزو دین بتاتی ہیں تو اس قبیل کی تمام روایتوں کی اصل مشکوک ہے۔

آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں! حسین کے چاہنے والوں نے ایک ایک لمحہ کو ریکارڈ کیا ہے،نسلاً بعد نسل اہل بیت اطہار پر جو گزرتی رہی اسے مورخین نے قلمبند کیا، بڑے دکھ اٹھائے ہیں ائمہ معصومین نے۔

دیکھئے اس بات سے کسے انکار ہے، حسین کی جرأت وعزیمت کو تو سبھی سلام کرتے ہیں لیکن میدانِ کربلا کے جو واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں، اور جو زبان زدعام ہیں، مثلاً تین روز سے پیاسا ہونا، مخالفین کی فوج کا لاکھوں میں ہونا، شمر کا حسین کے سینہ پر بیٹھ کر سرتن سے جدا کرنا، خواتینِ اہل بیت کی چادریں چھین لینا، یہ سب مبالغہ آمیز اور طبع زاد کہانیاں ہیں۔

لیجئے اب آپ تاریخ کے بھی انکاری ہیں، عبدالحمید نے احتجاج کیا۔

بولے، انکاری میں نہیں، تاریخی ماخذ ان باتوں کی توثیق نہیں کرتے۔ دیکھئے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ شہادتِ حسین کے ڈیڑھ، دوسو سال بعد تک تاریخ کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی۔ ابتدائے عہد کے واقعات قلمبند کرنے والے تمام ہی مورخین تیسری صدی ہجری کے اصحاب ہیں مثلاً کتاب المحبر کے مؤلف ابوجعفر حبیب (متوفی ۲۴۵ھ)، کتاب المعارف کے مؤلف مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ)، انساب الاشراف کے مصنف احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ)، اخبار الطّوال کے مصنف ابوحنیفہ الدینوری (متوفی ۲۸۲ھ)، تاریخ ابن واضح کے مولف ابوالعباس ابن واضح الیعقوبی (متوفی ۲۸۸ھ)، تاریخ الامم و الملوک کے مصنف ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) مروج الذہب اور تنبیہ الاشراف کے مصنف مسعودی (متوفی ۳۴۶ھ)۔ یہ تمام کتابیں اصل واقعہ کے دو یا تین سو سال بعد لکھی گئیں اوران مورخین کا ماخذ بھی کوفہ کے راویان اخبار تھے۔ طبری میں حضرت عثمان سے متعلق بیشتر روایتیں السری بن اسمٰعیل الکوفی سے مروی ہیں اور عہد معاویہ اور یزید سے متعلق روایتیں محمد بن السائب الکلبی الکوفی، ابومخنف اور ہشام الکلبی کی ہیں جنھیں امام ذہبی اور دیگر ائمہ رجال نے کذّاب بتایا ہے۔ طبری کی تاریخ سے اگر قال ابومخنف اور قال ابوہشام کی تکرار نکال دی جائے تو کربلا کی مبالغہ آمیز کہانی کا محل زمین پر آرہتا ہے۔ ابومخنف کا رسالہ جو اپنے عہد میں

قصہ گوراویوں کی گپ سمجھا جاتا تھا صدیوں کے نقل درنقل کے عمل نے اسے تاریخی ماخذ کا درجہ دے ڈالا ہے۔ ان حکایتوں پر اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آج قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شہادت حسین کا واقعہ کب، کس سال، کس مہینہ اور کہاں پیش آیا۔ کوئی کہتا ہے کربلا میں، کوئی نینوا کی نشاندہی کرتا ہے، کوئی محرم کا مہینہ بتاتا ہے تو کوئی صفر کا، بقول صاحب ناسخ التواریخ اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ یہ واقعہ ساٹھ ہجری (۶۰ھ) میں پیش آیا یا اکسٹھ (۶۱ھ) میں۔

جمہور کا کیا ماننا ہے؟ میرے خیال میں یوم عاشورہ پر تو سب کا اتفاق ہے، عبدالحمید نے جرح کی۔

بولے جمہور بے چارہ کیا کرے، تاریخ طبری میں ہر طرح کی باتیں ہیں، لوگوں نے سہولت کے لیے دس محرم کی تاریخ متعین کر لی ہے، ورنہ جس راوی پر واقعۂ کربلا کی پوری کہانی کا مدار ہے یعنی ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی تو خود ان کی ولادت اس حادثۂ فاجعہ کے کئی سال بعد ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کی بنیاد سنے سنائے واقعات پر ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ مقتلِ حسین کے بھی متعدد نسخے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں گویا مقتل کی کہانیوں کا مرتب بھی کوئی ایک شخص نہیں۔

خیر ابومخنف کو چھوڑ یئے۔ مقتل حسین تو ویسے بھی معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی لیکن ام سلمیٰ کی روایت کو تو مانیں گے نا آپ؟ عبدالحمید نے احتجاجاً کہا۔

حدیث کساء کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کودرا نے پوچھا۔ بولے، ام سلمیٰ تو خود باہر رہ گئیں اس چادر سے لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عائشہ باہر رہ گئیں اور ایک روایت جو آل عباس کے حامیوں نے بنائی اس میں رسول اللہ کو یہ دعا مانگتے دکھایا۔ یارب ھذا عمی و صنوابی و ھولا ء اھل بیتی....

نہیں، میں ام سلمیٰ کی اس روایت کا ذکر کر رہا تھا، وہ ہے نا جس میں انھوں نے کوئی خواب دیکھا کہ آپؐ کے سر اور ریش مبارک گرد آلود تھے، پوچھنے پر بتایا کہ میں مقتل حسین سے واپس آ رہا ہوں۔

جی ہاں ام سلمیٰ سے اس قسم کا ایک خواب روایت کی کتابوں میں منقول ہے بلکہ ان سے تو یہ قول بھی منسوب ہے کہ انھوں نے جنوں کو حسین پر ماتم کرتے اور ان کا نوحہ پڑھتے سنا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ حسین کی شہادت ساٹھ یا اکسٹھ (۶۱ھ) میں ہوئی اور ام سلمیٰ کا انتقال انسٹھ (۵۹ھ) میں ہی ہو چکا تھا۔

اچھا! واقعی؟ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا، عبدالحمید کچھ حیرتی سے تھے، بولے، پھر یہ باتیں ہمارے محققین کو نظر کیوں نہیں آتیں۔ ہم لوگ تو بچپن سے عزاء کی مجلسوں میں اس طرح کے بیانات سنتے آئے ہیں

کہ عین دوپہر کے وقت ابن عباس نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ کے ہاتھ میں شیشے کا ایک برتن تھا جو خون سے لبالب بھرا ہوا تھا، پوچھنے پر بتایا کہ هذا دم حسين و اصحابه یعنی یہ حسین اوران کے ساتھیوں کا خون ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قتل حسین پر آفتاب کو ایسا گہن لگا کہ کئی دنوں تک نظر نہ آیا، تاریکی پھیل گئی، تارے چمکنے لگے، آسمان سے خون کی ایسی بارش ہوئی کہ جس پتھر کو اٹھاؤ نیچے سے خون نکلتا تھا۔

جی ہاں اس پورے حادثہ کا یہی تو سب سے افسوسناک پہلو ہے، شہادت حسین کا حادثہ ہی کیا کم تھا اس پر مستزاد یہ کہ شہید مظلوم پر جھوٹے روایت سازوں اور قصہ گوراویوں نے جو حملہ کیا وہ یزیدی حملہ سے کہیں بڑا اور کاری وار تھا جس نے اصل واقعہ کی صورت شکل ہی مسخ کردی۔ جس دین کو بچانے کے لئے حسین نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا روایت سازوں کی اکاذیب اور محبان حسین کے غلو نے اس کی اصل صورت وشکل ہی میٹ کر رکھ دی۔ رہی سہی کسر ان ذاکرین نے پوری کردی جن کے محیر العقول فرمودات کا سلسلہ آج بھی رو کے نہیں رکتا۔ سیاسی مقاصد کی خاطر جھوٹی روایتیں اس کثرت سے وضع ہوئیں کہ اصل واقعہ سے طبع زاد فسانوں کو الگ کرنا مشکل ہوتا گیا۔ اندازہ کیجئے کہ بخاری کو چھ لاکھ روایتوں میں سے صرف دو ہزار سات سو اکسٹھ (۲۷۶۱) روایتیں ہی قابل اعتناء نظر آئیں اور مسلم نے تین لاکھ میں سے صرف چار ہزار حدیثوں کو ہی معتبر جانا۔ کتب حدیث میں تو پھر بھی قبول روایت کے لئے کچھ اصول متعین کئے گئے البتہ کتب تاریخ میں الٹی سیدھی ہر قسم کی روایتیں درج کردی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی نسلوں کے لئے رنگ آمیز اور وضعی روایتوں کے اس سدّ سکندری کو عبور کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔

عبدالحمید جو بڑی توجہ اور حیرت کے ساتھ کودرا کی گفتگو سن رہے تھے، اتنی آسانی سے کب ہار ماننے والے تھے۔ بولے: آپ کی بات میں گو کہ وزن ہے لیکن یہ ذاکرین حضرات تو ہمارے عہد کے لوگ ہیں، ہم ان کی ساری باتوں کو سچ بھی تسلیم نہیں کرتے لیکن مولا علی کی محبت تو پرانی ہے، وہ ان ذاکرین کی مرہون منت تو نہیں۔

بولے، ارے بھئی ذاکرین تو جب بھی تھے، ان کی شکلیں الگ الگ تھیں یہ جو آپ اس قسم کی باتیں سنتے ہیں کہ علی کی نماز کے لیے آفتاب لوٹ آیا اور جب حضرت علی نے وضو کر کے نماز پڑھ لی تو آفتاب غروب ہوگیا تو اس قسم کی باتیں کہنے والے یہ ذاکرین ہی تو تھے۔

مگر اس قسم کی باتیں تو شاید ثقہ علماء قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ باسم نے جرح کی۔

میں نے کہا: ثقہ علماء سے آپ کی کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کے نزدیک تو یہ معتبر ہے۔

'شاہ ولی اللہ محدث دہلوی'!

جی ہاں! شاہ صاحب نے آفتاب کے غروب ہوجانے کے بعد اس کے لوٹ آنے کا معجزہ بڑے اہتمام سے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ روایت مدینہ منورہ میں اپنے استاد شیخ ابراہیم بن حسن الکردی سے ۱۱۴۴ھ میں سماعت کی تھی۔

جی ہاں اہل روایت کے ہاں تو یہ بڑا مشہور واقعہ ہے جس سے وہ علی کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں۔

اور معین کاشانی نے اس واقعہ پر قطعہ بھی تو کہا ہے جسے قوال جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ کودرا نے مداخلت کی۔ بولے: کہا جاتا ہے کہ جب آفتاب لوٹ آیا تو حضرت علی نے اسے سلام کیا، سلام کے جواب میں آفتاب نے کہا کہ اے علی تم ہی اول ہو اور تم ہی آخر۔ کیا سحر ہے کاشانی کے آہنگ میں:

تاصورت پیوند جہاں بود علی بود تانقش زمین بود زمان بود علی بود
ہم اول و ہم آخر ہم ظاہر و ہم باطن ہم عابد و ہم معبود و ہم علی بود
عیسیٰ بوجود آمد وفی الحال سخن گفت آن نطق فصاحت کہ بدو بود علی بود
موسیٰ و عصا دید بیضا و نبوت درمصر بہ فرعون کہ بخمود علی بود
ہارون ولایت کہ پس از موسی عمران واللہ کہ علی بود علی بود علی بود

خیر کاشانی سے یہ باتیں عجب نہیں لیکن شاہ صاحب سے اس طرح کی ذاکر بیانیوں کی توقع نہیں کی جاتی، باسم نے پھر شاہ ولی اللہ کے دفاع کی کوشش کی۔

میں نے کہا: شاہ صاحب نے تو اور بھی بہت سی رطب ویابس نقل کر دی ہیں، لکھا ہے کہ جب فاطمہ کو پتا چلا کہ ان کی شادی حضرت علی سے ہوگی تو انھوں نے رسول اللہ سے شکوہ کیا کہ یا رسول الله زوجتنی من علی بن ابی طالب وھو فقیر لا مال له، اس کے جواب میں رسول اللہ نے فرمایا کہ اے فاطمہ! اللہ تعالیٰ نے اہل ارض میں سے دو لوگوں کو منتخب کیا ہے جس میں سے ایک تمہارا باپ اور دوسرا تمہارا شوہر ہے۔

'روایتوں میں تو یہ بھی آیا ہے کہ فاطمہ کی شادی بحکم خداوندی طئے پائی، بہت سے لوگوں نے رشتے دیئے، رسول اللہ خاموش رہے یہاں تک کہ علی کے رشتہ کو خدا کی منظوری مل گئی'، باسم نے کہا۔

اچھا تو یہ پس منظر ہے اس قوالی کا جو گذشتہ دنوں ٹی وی چینلوں پر بڑے زور وشور سے گائی جاتی رہی

ہے۔

اٹھو جبرئیل یہ کردو منادی علی کے ساتھ ہے زہرا کی شادی

عبدالحمید نے چہکتے ہوئے کہا، بولے اور بھی اسی طرح کے اشعار ہیں:

سبھی خوش ہیں خدائی بھی خدا بھی علی کے ساتھ ہے زہرا کی شادی
لڑکا ہے خدا کے گھر کا لڑکی ہے نبی کے گھر کی وہ ارض وسماء کا ملک یہ ملکہ بحروبر کی
نبی سارے چلے بن کر براتی علی کے ساتھ ہے زہرا کی شادی

میں نے کہا: 'جی ہاں ان قوالوں نے تو اللہ میاں سے رسول اللہ کا سمدھیانا کرادیا ہے، تخیل کی زرخیزی دیکھئے کیا کیا گل کھلاتی ہے۔

بولے: دین جب شعر ونغمہ کا قالب اختیار کر لے تو سمجھئے بندوق سے گولی نکل گئی۔ اب آپ کے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ کسی نظریئے کے زوال یا انحراف میں مقبول عام انسانی کلام، عوامی نغموں، اعلیٰ شاعری اور فنون لطیفہ کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر گروہی عصبیت اور نظری فرقہ بندی کو شعر ونغمہ کی رسد نہ ملے تو یہ سارا کاروبار ٹھپ ہوجائے، اہل قبلہ کے مختلف گروہ، واعظین کی رطب اللسانی، ذاکرین کی معجز بیانی دراصل شعر ونغمہ کے سبب ہی قائم ہیں، کودرا نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

'آپ نے درست فرمایا، نغموں میں بڑا سحر ہوتا ہے، خاص طور پر یہ نغمے اگر خوابیدہ تاریخ کو بیدار کرنے کا ہنر جانتے ہوں، وہ تاریخ جس میں جابجا تنازعات کی چنگاری دبی ہو، پھر ان چنگاریوں کو شعلوں میں بدلنے میں دیر نہیں لگتی'، باسم نے تائید کی، کہنے لگے: سال گذشتہ کی بات ہے عاشورہ کے موقع پر لبنان میں لاکھوں کا اژدہام تھا، ہر طرف هيهات من الذله کے بڑے بڑے بینر آویزاں تھے جس پر حسن نصر اللہ کی تصویر بنی تھی، گانے والا یا حبیبی یا علی، نبض قلبی یا علی کا لطمیہ گارہا تھا، ٹیلی وژن کے میگا اسکرین پر حسن نصر اللہ کی تصویر کے علاوہ حزب اللہ کی فوجی پریڈوں کی مختلف تصویریں دکھائی جارہی تھیں، اور اس بیک گراؤنڈ میں گانے والا گارہا تھا۔

فجعت ارض الطفوف بالحسين ابن علي
يا دموع العين طوفي اروي العطشى انزلي
يا حبيبي يا علي نبض قلبي يا علي

يـــا حبيبـــي يـــا عـــلـــي نبـــض قـــلبـــى يـــا عـــلـي

انــــه الشــمــر يـــا حيــدر الــعــن اثيــم اليــديــن

طـــال بيــديـــه الــمــنــحــر وحـــز راس الـحسيـن

يـــا حبيبـــى يـــا عـــلـــي نبـــض قـــلبـــى يـــا عـلـي

جذب کی ایک عجیب کیفیت تھی، نبض قلبی یا علی، نورعینی یا حسین کے الفاظ زبان پر تھے، ایسا لگتا تھا کہ اس نغمہ نے لاکھوں کے اس مجمع کو کلی طور پر اپنے کنٹرول میں لے رکھا ہوا اور پھر جب نغمہ گو نے یہ الفاظ کہے:

يـــا ابـــا الـــحســـن ادركـنـا بـالسهـم مـات الـرضيع

يـــا عـــلـــي فـــلا تتـــركـــنـــا راس الـحسيـن قـطيع

يـــا حبيبـــى يـــا عـــلـــي نبـــض قـلبـي يـــا عـلـي

يـــا عـــلـــى الـــعبـــاس زينـب تـنـعيـه فـى مـاجـرى

تـــصـــرخ بـــقـــلـــب مـــعـذب هـذا شبـل حيـدرى

يـــا حبيبـــى يـــا عـــلـــي نبـــض قـلبـي يـــا عـلـي

تو مجمع پر شدت گریہ کی ایک نا قابل بیان کیفیت طاری ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم صدیوں پیچھے تاریخ کے ان ایام میں جا پہنچے ہوں جہاں معرکہ کربلا برپا ہو، آل فاطمہ کو اپنے شیعوں کی امداد کی حاجت شدید ہو، کہنے والا کہہ رہا تھا:

ادرك قـلبـي يـــا امـــامـــى ادركـنـي يـــا ابـــا الـحسـن

هـــذا الـــحسيـــن امـــامـــى لا غســـل ولا كـــفـــن

ادرك قـلبـي يـــا امـــامـــى ادركـنـي يـــا ابـــا الـحسـن

هـــذا الـــحسيـــن امـــامـــى لا غســـل ولا كـــفـــن

يـــا حبيبـــى يـــا عـــلـــي نبـــض قـلبـي يـــا عـلـي

لاکھوں کا یہ مجمع ابن علی (حسن نصر اللہ) کے ابرو واشارے پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا۔ اس دوران ٹیلی وژن کی میگا اسکرین پر سیاہ عمامہ میں ملبوس حسن نصر اللہ کی مختلف تصویریں بدلتی رہیں، خامنئی ہوں یا حسن نصر اللہ ان کے سیاہ عمامہ سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کا تعلق حسین ابن علی کے خانوادے سے ہے اور یہ کہ آج بھی ابنائے علی حسینی مشن کی تکمیل کے لیے شب و روز سرگرم ہیں۔ شعر و نغمہ کی

اس سحر انگیزی میں شیعانِ حسین کو یہ پتا نہیں چلتا کہ اب ان کا مقابلہ نہ شمر سے ہے اور نہ ابن زیاد کے لشکر سے اور نہ ہی شام میں یزید کی حکومت باقی رہ گئی ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج صدیوں بعد حسینی مشن کے حقیقی دشمنوں کا تعین کرنے کے بجائے، جنھوں نے فی الواقع آج دنیا کی امامت پر قبضہ کر رکھا ہے، ہم فرضی دشمنوں کے خلاف اپنی تمام توانائیاں صرف کرتے رہیں۔

بولے: آپ درست فرما رہے ہیں، بندوق کی گولیوں اور ٹینکوں کی گھن گرج کو آپ کنٹرول کر سکتے ہیں، ان کے اثرات زمانی اور مکانی حدودِ اربعہ کے تابع ہوتے ہیں لیکن شعر و نغمہ کی سحر انگیزی پر آپ کا کنٹرول نہیں رہتا۔ ایک تلمیح پوری ایک تاریخ زندہ کر دیتی ہے، ایسی تاریخ جو زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ اب دیکھئے اس وقت شام میں کیا ہو رہا ہے۔ ایران، عراق اور عالم اسلام کے مختلف حصوں سے شیعہ نوجوانوں کے جتھے سیدہ زینب کے مزار کی حفاظت کے لیے دمشق کا رخ کر رہے ہیں۔ اس پوری مہم کو مہمیز کرنے میں ان سحر انگیز نغموں کا بڑا اہم رول ہے۔ کتنا سحر ہے ان نغموں میں! فارسی ویسے بھی نغموں کی زبان ہے، میں جب بھی عزاء کی مجلسوں میں بیٹھا دل قابو میں نہیں رہا، یہ کہتے ہوئے کودرانے ایک لمحہ کو سکوت اختیار کیا جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں، پھر خاص نغمہ سراؤں کے انداز میں کچھ اس طرح گویا ہوئے:

نخیزد آهی از عمق نهادی
که در آخر نگردد گردبادی
نریزد اشك مظلومی به دامن
مگر ویران کند کاخ فسادی
کلنا عباسك یا زینب
نوای نای مظلومان عالم
بلرزاند تن آل زیادی
سر انجام تبه کاران، تبا هیست
نه اخدودی به جا مانده، نه عادی
الا ای خیل خون آشام! در شام
نماند از شما حتی نمادی
نبردید از خرد، در شامه بویی
ندارید از خدا در یاد، یادی

شما را نسیت جذ شیطان، مریدی
به غیر از ابن ملجم ها، مرادی
کلنا عباسك یا زینب
لکم یا زمرة الارهاب تبّا
اساس البغی، رمزاً للعناد
ای جماعت تروریست! ننگ و نفرین بر شما
که پایه ی طغیان و نماد دشمنی هستید
کلنا عباسك یا زینب

نغموں کے سحر نے ہماری قوت فکر سلب کر لی ہے۔ اس وقت من حیث الامت ہم خود کو اکسٹھ ہجری (۶۱ھ) کے ان ایام میں پاتے ہیں جہاں زینب کے چاہنے والے ان کے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ پورا عالم اسلام لہولہان ہے، کشتوں کے پشتے لگ گئے ہیں، ہنستے بستے شہر کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کوئی پانچ ملین اہل قبلہ اس باہمی خانہ جنگی میں لقمۂ اجل بن چکے لیکن نغموں کی اس زبان نے ہمارے حواس کو اس قدر معطل کر رکھا ہے کہ کشت و خون کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لیتا، یہ کہتے ہوئے کودرا نمناک ہو گئے۔

پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ قتل و خون کا یہ سلسلہ کیسے رُکے گا؟ عبدالحمید نے پوچھا۔

یہ سن کر کودرا کے چہرے کا رنگ اچانک بدلنے لگا، وہ چند ثانیے خلاء میں گھورتے رہے پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنا تھیلا اٹھایا اور کندھے سے لٹکاتے ہوئے بے رخی سے بولے، اب کچھ نہیں ہوسکتا، یہ لوگ اسی طرح ایک دوسرے کو قتل کرتے رہیں گے، فاقتلوا انفسکم ذالکم خیر لکم۔ جھگڑے ان لوگوں کے درمیان سلجھائے جاتے ہیں جن کے زمانی اور مکانی حدود اربعہ ہوں، جو لوگ ماضی میں جا کر لڑنے کا ہنر سیکھ گئے ہوں انھیں آپ نہیں روک سکتے۔ آپ کا اختیار حال پر ہے، ماضی تو تراشیدہ تاریخ کے تابع ہے، جب تک آپ اس تاریخ سے پیچھا نہیں چھڑاتے آپ آزادانہ اور منصفانہ طور پر اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ماضی کے قصہ گوراویوں نے ہمارے مستقبل پر پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ تاریخ مسخ کر دی گئی اور قلم توڑ دیا گیا، اب کچھ نہیں ہوسکتا، کچھ بھی نہیں ...... یہ کہتے ہوئے کودرا نے مجلس پر ایک نگاہ ڈالی اور چل پڑے۔

کودرا کیا گئے گویا مجلس کی روح نکل گئی۔ واقعی آپ صحیح کہتے ہیں، پانی بہت گہرا ہے۔ باسم نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: صفّین اور نہروان کی جنگوں سے ہم آخر کیسے باہر آئیں گے؟

جی ہاں اب جنگ بندی کے لیے کوئی ترکیب ڈھونڈنی چاہیے، بہت ہو گیا۔ چودہ صدیاں کم نہیں ہوتیں، عبدالحمید نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا۔

اصلاح احوال کے لیے ان دونوں نوجوانوں کا اضطراب دیدنی تھا۔

مایوس نہ ہوں، حالات بدل سکتے ہیں، میں نے انھیں تسلی دی۔ میں نے کہا کسی انحراف کا صدیوں جاری رہنا اس بات کی ضمانت نہیں کہ اب اس شاکلے کا توڑ ناممکن نہیں۔ بس ایک بار ہمت کر کے اقدامی عمل کے آغاز کی ضرورت ہے۔ تراشیدہ تاریخ کا شاکلہ بھی جس نے ہمیں صدیوں سے اپنے شکنجہ میں لے رکھا ہے، ناقابل شکن نہیں۔

کیا ایسی کوئی کوشش پہلے بھی ہوئی ہے، عبدالحمید نے پوچھا۔

میں نے کہا: ہاں کیوں نہیں، البتہ اس سے پہلے ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کے پروپگنڈے کو بزور بازو فنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جو آپ تاریخ کی کتابوں میں اتلافِ کتب کے واقعات پڑھتے ہیں تو اس کے پیچھے بھی دراصل تراشیدہ تاریخ کو لگام دینے کا داعیہ ہی پایا جاتا تھا۔ قلعہ الموت کی اسماعیلی لائبریری ہو یا صاحب بن عباد کا اثنا عشری کتب خانہ یا سقوط بغداد کے وقت عباسی بغداد کے سنی کتب خانے، ان سبھوں کی تباہی میں متنازعہ اور مخالفانہ تاریخی کتب اور تاویلی ادب کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ ایک فریق نے دوسرے فریق کے تاریخی پروپگنڈے اور تعبیری التباسات کو تلف کرنے کی کوشش کی۔ انھیں ان تاریخی بیانیوں اور تعبیری التباسات کی زہرناکیوں کا پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ فکری شاکلے تلواروں کی ضرب سے نہیں ٹوٹتے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم من حیث الامہ اپنے اندر اس تاریخی سراب سے باہر آنے کا داعیہ رکھتے ہوں۔

آپ کو کیا لگتا ہے فی زمانہ یہ سب کچھ ممکن ہے؟ عبدالحمید نے پوچھا۔

جی ہاں بالکل! میں سمجھتا ہوں کہ تراشیدہ تاریخ کے مکمل اور فیصلہ کن استرداد کی اب تک کوئی باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ اب تک ہمارا انحصار پوری طرح راوی کے جرح وتعدیل پر رہا ہے، جو راوی ایک کے ہاں ثقہ ہے دوسرے کے نزدیک مجروح۔ مثال کے طور پر شیعہ راوی ابوبصیر کو لیجئے جس کی مذمت میں خود جعفرالصادق کے اقوال موجود ہیں۔ لیکن شیعہ علماء کے نزدیک یہ مذمتی بیانات قابل اعتناء نہیں کہ بقول ان کے ان کا اصل مقصد دراصل ابوبصیر کی شیعہ شناخت پر پردہ ڈالنا تھا تاکہ اسے حکومتی کارندوں کی چیرہ دستی سے بچایا جا سکے۔ پھر رجال کے لامتناہی جنگل میں ایک ایک راوی کے بارے میں متضاد بیانات سے ہمہ وقت اس

بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ آپ جسے چاہیں ثقہ قرار دیں اور جسے چاہیں کذب وافتراء سے متہم کردیں۔ صدیوں سے اس منہج تحقیق نے ہمیں ایک دائروی سفر کی تعذیب ذہنی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

کیا دونوں جگہ یہی کیفیت ہے؟ کیا شیعہ اور سنّی دونوں فرقے کے علماء اس منہج کے اسیر ہیں؟ باسم نے پوچھا۔

جی ہاں بڑی حد تک۔ نہج البلاغہ میں معاویہ کے نام حضرت علی کے ایک مکتوب کا تذکرہ ہے جس میں وہ اپنے دعویٰ خلافت پر دلیل لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان پر بیعت کی تھی ان ہی لوگوں نے اسی طرح سے ہماری خلافت پر بھی بیعت کی ہے۔ قیام خلافت کی یہ علوی دلیل شیعہ موقف کے خلاف ہے جو خلافت کو امر منصوص قرار دیتی ہے۔ اب شیعہ علماء کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں بچتی کہ نہج البلاغہ کی اس روایت کی تضعیف کا اہتمام کریں۔ اسی طرح بخاری اور مسلم میں دسیوں روایتیں ایسی ہیں جن سے خلافت کے سنّی موقف کا ابطال ہوتا ہے اور شیخین کی تصویر داغدار ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی فرقے بے لاگ محاکمہ اور آزادانہ غور وفکر کے بجائے تطبیق وتاویل سے کام لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مکذوبہ روایتوں اور تراشیدہ واقعات سے ان کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ دونوں فرقوں نے جن کتابوں کو مدت مدید سے اپنے سینوں سے لگا رکھا ہے وہ اللہ کی نازل کردہ نہیں، انسانوں کی لکھی ہوئی تالیفات ہیں، اگر انھیں سنی یا شیعی کتابوں کے بجائے اجتماعی علمی ورثہ کے طور پر دیکھا جا سکے اور ہم سنّی یا شیعی عالم کے بجائے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کے بے لاگ محاکمہ کے لیے آمادہ ہوں تو تعصب وعناد کے یہ نظری شاکلے ٹوٹ سکتے ہیں۔ پھر ہمارے لیے ممکن ہوگا کہ ان میں سے جو چیز عقل اور وحی کے قرین ہو اسے قبول کرلیں اور جو چیز اس کے خلاف ہو اسے یکسر مسترد کردیں۔

کافی کا وقفہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر شرکاء کانفرنس ہال میں واپس جا چکے تھے۔ میں نے عبدالحمید اور باسم سے اجازت لی۔ واپس کمرے میں آیا۔ خیال آیا کہ کانفرنس ہال میں اس وقت دلچسپ اور اہم موضوعات زیر بحث ہوں گے لیکن طبیعت کچھ مضطرب اور پریشان سی لگتی تھی، تازہ ہوا کے خیال سے کھڑکی کھولی اور وہیں صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ نہ جانے یہ کیسا اضطراب تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ مستقبل کی دنیا کے منظرنامے کو ماہرین کی زبانی تفصیل سے سنوں لیکن ذہن بار بار اپنی ملی خانہ جنگی کے مظاہر میں الجھ جاتا، کودرا کا وہ جملہ یاد آتا کہ جو لوگ ماضی میں واپس جا کر لڑنے کا فن سیکھ گئے ہوں انھیں آپ نہیں روک سکتے۔ آج پہلی بار اس

بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہم مسلمان اہل فکر کس طرح بیک وقت دو دنیاؤں میں جینے پر مجبور ہیں، ایک تحقیق واکتشاف کی جدید دنیا ہے جس میں پھر سے ہم اپنے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر نو میں ہمارا رول قائدانہ ہو لیکن دوسری طرف ہماری داخلی ملی زندگی پر نزاعی امور نے کچھ اس طرح قبضہ جمایا ہے کہ وہاں سیادت عالم کے کسی منصوبے کا گزر نہیں ہوتا۔ روایتی علماء کی مجلسیں اور دینی علوم کی دانش گاہیں اسی تراشیدہ تاریخ کو مزین کرنے اور نزاعی منہج تاویل کو صیقل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔

۱۸

جنت کے درزی

آج شام کی سیر سے لوٹتے ہوئے اس مختصر پگڈنڈی پر جانکلا جو کیمپنگ کے مقامات سے گزرتی ہوئی بورل کو جاتی ہے۔ مختلف چھوٹے چھوٹے خیموں کے درمیان ایک بڑا خیمہ لگ گیا تھا جس کے اطراف میں جابجا لبلیانہ یونیورسٹی کے مونوگرام جھنڈوں کی شکل میں آویزاں تھے۔ سامنے استقبالیہ کی میز پر ایک لڑکی تعارفی بروشر اور کتابچے ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ استقبالیہ کے سامنے دوسری طرف گول میز پر کچھ نوجوان بیٹھے تھے، سب اپنی اپنی دنیا میں غرق، کسی کے کان سے موبائل کا تار متصل تھا تو کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف۔ ابھی چند قدم ہی اوپر کی طرف چڑھا تھا کہ سامنے سے عبدالحمید آتے دکھائی دیئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے ارے آپ ادھر کہاں؟ اب آ گئے ہیں تو دو منٹ ہمارے خیمہ کو زینت بخشیں۔ آپ کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ اور ہاں! کشمیری قہوہ کو منع مت کیجئے گا۔

'اچھا اس کا یہاں بھی اہتمام ہے؟'

بولے: یہ محض ایک خیمہ نہیں، یہاں پوری دنیا آباد ہے۔

اندر خیمہ کے مرکزی لابی میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ عبدالحمید قہوہ کا تھرماس اور گلاس لے آئے، بولے ایک منٹ رکیے گا، یہ کہتے ہوئے وہ خیمہ کے عقبی حصہ میں گئے اور اپنا لیپ ٹاپ اٹھا لائے۔ کہنے لگے میں آپ کو ایک نغمہ سنانا چاہتا ہوں، میرے پسندیدہ نغموں میں سے ایک ہے، شاید آپ کو بھی پسند آئے، لیکن اب مجھ پر نغموں سے کہیں زیادہ اس کے بین السطور واضح ہو رہے ہیں، ایک عجیب احساس ہے جس سے پہلے میں اس قدر آشنا نہ تھا، یہ کہتے ہوئے عبدالحمید نے لیپ ٹاپ پر نغمہ کا بٹن آن کر دیا۔ گانے والا غالباً کوئی منقبت گا رہا تھا، جوش و جذبہ اور عقیدت و احترام سے سرشار۔ یا مہدی ی ی ی ی ی یا مہدی ی ی ی ی ی کی آواز

کچھ اس طرح بلند کرتا جیسے اسے یقین ہو کہ ظہور کی ساعت اب قریب آیا چاہتی ہے۔ نغمہ کا زیر و بم جب ذرا کم ہوا تو پتا چلا کہ گانے والا دراصل مشہور منقبت جب مہدی مولا آئیں گے گا رہا تھا۔

جب نور کا سورج چمکے گا کروٹ یہ زمانہ بدلے گا
سب چاند ستارے مہدی کی چوکھٹ کے دیئے بن جائیں گے
دیکھے گا زمانہ یہ منظر دربیت علی کا کھلتے ہی
دیوار حرم کے سب پتھر حیدر حیدر دہرائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے جب مولا مہدی آئیں گے
جو غاصب حق زہرا ہیں قبروں سے اٹھائے جائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے

کعبہ کو سجایا جائے گا بدلے گا زمانے کا منظر
تیاریٔ جشن عید غدیر اس طرح کریں گے وہ آکر
جنت کے پرانے درزی سے ملبوس نئے سلوائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے

کچھ ابن آدم ایسے ہیں آدم کے عمل پر ہیں برہم
مسجد کے آگے ہوتے ہوئے جو دیکھ نہیں سکتے ماتم
جب ماتم ہوگا کعبہ میں وہ جل جل کر مرجائیں
جب مولا مہدی آئیں گے

قائم کی عدالت میں ایک دن وہ پیش سبھی مجرم ہوں گے
ہردور میں منبر پر چڑھ کر جو بغض علیؑ میں بولتے تھے
ہے مجھ کو یقین مولا ان کی میثم سے زباں کھینچوائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے

دیکھے گا جہاں یوں اہل عزاء کا رتبہ بڑھایا جائے گا
خاتون قیامت کا روضہ جب پھر سے بنایا جائے گا

چن چن کر ماتمی حلقوں سے مزدور بلائے جائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے
حیدر کی ولایت کا دشمن توحید کا دشمن ہوتا ہے
دشمن ہیں ولایت کے جتنے وہ پہلے مارے جائیں گے
واللہ دھری رہ جائے گی ہر نسل امیہ کی سازش
جب مولا مہدی آئیں گے
کیا جند اللہ ، کیا النصرہ القاعدہ کیا، کیسی داعش
جب تیغ علیؑ کی چمکے گی سب مٹی میں مل جائیں گے
جب مولا مہدی آئیں گے

جی ہاں علی کے دشمنوں کی خیر نہیں، میں نے مسکراتے ہوئے کہا، لیکن عبدالحمید کسی اور ہی موڈ میں تھے۔ ان کی سنجیدگی میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔ بولے: چند اشعار ایک دوسری منقبت کی بھی سنئے، یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک دوسرا ویڈیو آن کیا، اللھم عجل لولیك الفرج کی ایک صدائے دلگیر بلند ہوئی، پس منظر میں نجف اور کربلا کے راستے میں واقع کوئی موکب نظر آیا جہاں منقبت خوانوں کا ایک گروہ بڑے ہی خشوع وخضوع کے ساتھ یہ نغمہ گا رہا تھا۔

حال غم سنائیں گے جب امام آئیں گے زخم دل دکھائیں گے جب امام آئیں گے
بام ودر سجائیں گے جب امام آئیں گے جشن ہم منائیں گے جب امام آئیں گے
زخم ہیں ابھی تازہ مکہ اور مدینہ کے شام وکوفہ کرب وبلا ہم بھلا نہیں سکتے
ایں سقیفہ تا ایں دم خیر سے نہیں پہنچے، جتنے دکھ اٹھائے ہیں ہم نے کلمہ گویوں سے
ایک اک چکائیں گے جب امام آئیں گے
شک ہے جن کو اللہ کے عدل اور عدالت پر، منصب نبوت پر، سیدہ کی عصمت پر
مرتضٰی کی احمد سے متصل نیابت پر، جن کو شک ہے بارہ پر، بارہویں کی غیبت پر
سب ہی مار کھائیں گے جب امام آئیں گے۔

عبدالحمید نے ویڈیو بند کیا، بولے، ویسے تو یہ ایک پرسوز منقبت ہے، قائم کی آمد کا کسے انتظار نہیں،

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے دائیں ہاتھ کو پیشانی تک لے گئے، ایسا لگا گویا فرطِ احترام وعقیدت میں کھڑے ہوا چاہتے ہوں، بولے: اللھم عجل لولیك الفرج، پھر چند ثانیہ خاموشی کے بعد کہنے لگے: 'اب جو میں عالم اسلام کے موجودہ تناظر میں ان نغموں کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کے بین السطور میں مسلکی جنگ کے شعلے پوشیدہ ہوں۔ کو درا صحیح کہہ رہے تھے، تاریخ کے مختلف بیانات نے ہمیں مخالف کیمپوں میں تقسیم کر دیا ہے، زینب کے عباس اور ان کے عمار شام، عراق، لبنان اور یمن میں اہل بیت کے دشمنوں سے سربکف ہیں'۔

جی ہاں آپ صحیح سمجھے، آنکھیں اگر کھلی ہوں اور دل ودماغ اگر مسلکی تعصب سے غبار آلود نہ ہوں تو اس حقیقت کے ادراک میں دیر نہیں لگتی کہ تاریخی بیانیوں نے ہماری قوت فکر وعمل کو شل کر دیا ہے، حال اسی زہریلی تراشیدہ تاریخ کا توسیعہ ہے جہاں ہم من حیث الامہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی خود کو میدانِ کربلا میں پاتے ہیں، اب چونکہ حسینیوں کا مقابلہ کلمہ گو یزیدیوں سے ہے اس لیے حق وباطل کی تمام کشمکش ایک داخلی مناقشہ، محاربہ بلکہ کہہ لیجئے مقاتلہ بن کر رہ جاتی ہے، باہر کے دشمن اور خاص طور پر وہ اقوام جنھوں نے ہماری داخلی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر منصب امامت پر شب خوں مارا ہے، ان کی طرف ہماری توجہ بھی نہیں جاتی۔

یہ منقبت، یہ نوحے اور یہ نغمے خوابیدہ تاریخ کو اس طرح بیدار کر سکتے ہیں مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ ایک بار ہاشم سسٹرز کی ایک منقبت سنتے ہوئے جب میں اس شعر پر پہنچا:

کچھ لوگ مرے جاتے ہیں اس رنج ومحن میں　　　اس گھر کا جو دروازہ ہے مسجد کے صحن میں

تو ایک لمحہ کو یہ ضرور لگا کہ بات ذرا دوسری طرف چلی گئی ہے لیکن پھر اس خیال سے کہ یہ بذلہ سنجی اور خوشگوار چھیڑ چھاڑ کا سا انداز ہے، میں نے اس کا نوٹس نہ لیا لیکن آج کل جو نوحے قبولیتِ عام حاصل کر رہے ہیں، ان میں مخالفین کے لیے دھار کچھ زیادہ تیز محسوس ہوتی ہے، عبدالحمید نے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔

شام اور عراق کی موجودہ رزم آرائیوں میں شعر ونغمہ کو دونوں ہی فرقے اپنے حق میں استعمال کر رہے ہیں، ابھی پچھلے دنوں حزب اللہ نے بیروت میں اپنی فتح پر ایک نغمہ جاری کیا تھا۔

احسم نصرك في بيروت

دیکھتے دیکھتے اس مسلکی رجز یہ نے سوشل میڈیا میں اتنی دھوم مچائی کہ جلد ہی سنّی حلقوں سے اسی وزن اور بحر میں اسی گھن گرج کے ساتھ کئی ایک جوابی رجز یے جاری ہوئے، جس میں سے یہ خاص طور پر مشہور ہوا۔

احفر قبرك في بيرود　　احناء اللی بالدم نجود
حلمك نصرك في بيرود　　اوهامك يا حزب الله
اعدنا لكم الاكفان　　بايدی رجال القلمون
ياحزب الشيطان كفانا　　لن نتراجع مهما يكون

دونوں فرقے ایک دوسرے کونیست ونابود کردینا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے شعر ونغمہ کی لگائی ہوئی اس جنگ میں کود پڑے۔

اچھا یہ بھی ہوا؟

جی ہاں! فضل شاکر کا نام شاید آپ نے سنا ہو۔ لبنان کے معروف پاپ اسٹار۔ ان کی سنّی حمیت کچھ اس طرح جاگی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے فن کو سنّی اسلام کی خدمت پر لگایا بلکہ شیخ العسیر کے ساتھ بندوق لے کر اہل تشیع کی مخالفت میں نکل پڑے۔

اچھا تو پاپ اسٹار بھی نغموں کے سحر میں کھو گیا؟ عبدالحمید نے حیرت کا اظہار کیا۔

جی ہاں! نغمہ کی جراحت سے تو مغنّی بھی نہیں بچ پاتے۔

مگر یہ نغمے، یہ نوحے، یہ منقبت اور یہ لطمیے آپ کو جگائے بھی تو رکھتے ہیں، ان کے بغیر طبیعت کچھ بجھی بجھی سی رہتی ہے، آپ نے وہ منقبت سنی ہوگی:

علی علی اکبر علی علی　　شبه پیمبر علی علی
ای جانم
تازه جوانم مرا تو جانم در جانی
ای جانم
با اشك سر دم مر تو دردم درمانی
ای جانم
ای گل حیدر ای گل حیدر علی علی
شبه پیمبر علی علی شبه پیمبر علی علی
ای جانم
ای علی اکبر سرو صنوبر رعنایی
ای جانم

بر دو لبانم همی بخوانم لا لابی

ای جانم

عبدالحمید کو خالص فارسی لہجہ میں نغمہ زن دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا: کیا آپ فارسی زبان سے واقف ہیں؟

بولے: جی ہاں تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں۔

کہاں پڑھی آپ نے فارسی؟

باضابطہ طور پر تو نہیں پڑھی، بس گھر کا ماحول ہے۔ یہ سب مجتہد گھرانے میں پیدا ہونے کی برکات ہیں۔

تو کیا آپ کے والد صاحب کوئی مذہبی عالم ہیں؟

بولے: جی ہاں شاید آپ نے ان کا نام بھی سنا ہو۔

کیا نام ہے ان کا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: مولانا حسن فولادی۔

حسن فولادی کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ ان کا سفید عمامہ اور چشمہ سے جھانکتی ہوئیں بارعب آنکھیں دفعتاً میری نگاہوں میں گھوم گئیں۔

اچھا تو آپ حسن فولادی کے صاحبزادے ہیں، ماشاء اللہ، میں نے عبدالحمید کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ارے بھئی آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا، اب تو سارا تناظر ہی بدل گیا، کہاں ہیں وہ آج کل؟ ان کی صحت کیسی ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے، آج کل یوروپ کے دورے پر آئے ہوئے ہیں، سفر کے اختتام پر ان شاء اللہ لبلیانہ تشریف لائیں گے۔

بہت خوب! ان سے میرا اسلام کہئے گا۔

ضرور! ان شاء اللہ، میں آپ کا سلام والد صاحب تک پہنچاؤں گا۔ عبدالحمید کے لب ولہجہ میں اب نیازمندی سے کہیں زیادہ فرزندگی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے ان سے رخصت لی اور ان ہی پگڈنڈیوں پر چڑھتا ہوا کاسل کے مرکزی دروازے تک آ پہنچا۔ موسم خوشگوار تھا سوچا کیوں نہ چند لمحے پتھر کی سلوں سے ٹیک لگا کر تازہ

دم ہولیا جائے۔ سوچنے لگا یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کوئی دس سال بعد مشیت نے حسن فولادی کے صاحبزادے سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ لیکن کتنا فرق ہے باپ اور بیٹے کے مزاج میں۔ عبدالحمید کے مزاج میں نوجوانی میں بھی ایک ٹھہراؤ سا ہے۔ مجتہد گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود جستجو کی پیاس بجھی نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شعر و نغمہ کی جراحت پر مطلع ہیں، فکرمند ہیں، اور کہاں شیخ حسن فولادی جن پر ہر لحہ مخالف کے قلعہ کو زمیں بوس کرنے کی فکر سوار رہتی۔ مجھے لندن میں واقع آیت اللہ سیستانی کے دفتر کا وہ منظر یاد آیا۔ شیعہ اور سنّی علماء کی مشترکہ مجلس تھی۔ بات ماتم کے مروجہ مظاہر اور رسوم پر چل نکلی، کسی نے کہا کہ یہاں لندن میں زنجیری ماتم کے عوامی مظاہر سے اسلام کی کچھ اچھی ترجمانی نہیں ہوتی، علماء کو اس سلسلے میں روک تھام کی کوشش کرنی چاہیے۔ بس پھر کیا تھا شیخ فولادی فی الفور حرکت میں آ گئے، بولے: آپ نے کسی عالم کو کبھی زنجیری ماتم کرتے دیکھا ہے؟

مگر آپ لوگ علی الاعلان اس کی مذمت بھی تو نہیں کرتے، پاس بیٹھے ایک سنّی نوجوان نے اعتراض وارد کیا۔

بس پھر کیا تھا شیخ حسن کو مشتعل کرنے کے لیے اتنا کافی تھا، کہنے لگے حسین مظلوم کا غم ہی کچھ ایسا ہے ویسے وہ لوگ اس سانحہ کی شدت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جو اس پراسس کا حصہ نہ ہوں، بھئی ان چیزوں کا تعلق مومنین کی داخلی کیفیت سے ہے۔

مگر ہم بھی تو حسین کے ماننے والوں میں سے ہیں، اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، ایک سنّی عالم نے مداخلت کی۔

بولے، ارے وہ لوگ حسین کا درد کیا جانیں جن کی نہ نماز درست ہو، نہ روزہ، جنھیں نبوی وضو سے خدا واسطے کا بیر ہو وہ بھلا دین کے غایت واہداف پر کیا مطلع ہوں گے۔

کیا مطلب؟ سنّی عالم نے وضاحت چاہی۔

بولے، آپ اہل سنت کے علماء نے وضو کا طریقہ خود ایجاد کیا، آپ لوگوں نے ایسی نمازیں ایجاد کیں جنھیں رسولؐ نے باجماعت پڑھنے سے منع کیا، آپ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانتے کب ہیں جو آپ کو حسین مظلوم کا درد سمجھ میں آئے، یہ کہتے ہوئے شیخ فولادی نے مجلس پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی۔ ان کا اندازہ صحیح تھا، لوگ اب ان کی طرف پوری طرح متوجہ حسن سماعت پر مجبور تھے۔ شیخ حذیفی، جو اب تک

موبائیل پر کوئی پیغام ٹائپ کرنے میں مصروف تھے، انھیں بھی جستجو ہوئی کہ دیکھئے آگے کیا آتا ہے۔ بولے اب آپ ہی بتائیے کہ جو لوگ جان بوجھ کر خدا اور اس کے رسولؐ کے بتائے گئے طریقہ پر وضو نہ کریں تو کیا ان کی نماز ہوگی؟ کیوں حضرت آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے شیخ حذیفی کو متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

بالکل نہیں، شیخ حذیفی نے جواب دیا۔

پھر اہل سنت کے علماء اپنے عوام کو وضو کا نبوی طریقہ کیوں نہیں بتاتے؟

آپ ہی بتائیں، آپ کس نبوی طریقہ کی بات کر رہے ہیں؟ شیخ حذیفی نے وضاحت چاہی۔

بولے: میں کیا بتاؤں، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے۔ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الیٰ المرافق وامسحوا برءوسکم وارجلکم الیٰ الکعبین۔ یعنی فیہا غسلتان ومسحتان یعنی وضو میں دو غسل اور دو مسح ہیں۔

دیکھئے اس مسئلہ پر اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین فقہی اختلاف ہے، شیخ حذیفی نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

'ارے بھئی کوئی فقہی اختلاف نہیں، بلکہ علمائے اہل سنت کی ہٹ دھرمی ہے، ورنہ اتنی سیدھی سی بات میں اختلاف کی گنجائش کہاں۔

'دیکھئے انتشار ضمیر کا مسئلہ ہے'، شیخ حذیفی نے وضاحت کی۔ ہم لوگ ارجلکم کا عطف فاغسلوا پر ڈالتے ہیں۔ واؤ کے عطف سے اختلاف واقع ہو گیا ہے اور چونکہ پاؤں میں گندگی لگنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس کے دھونے کو لازم خیال کرتے ہیں۔

مگر آپ کے لازم خیال کرنے سے کوئی چیز کیسے لازم ہو جائے گی، کیا اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ پاؤں میں گندگی لگنے کا احتمال زیادہ ہے؟ اچھا یہ بتائیے آپ نے انتشار ضمیر کی بات کی۔ عربی گرامر کے مطابق ضمیر کے لیے الاقرب فالاقرب بہتر ہے یا دور جانا۔

علمائے نحاۃ تو اقرب ہی کے قائل ہیں۔

پھر آپ لوگ پیر دھونے پر اصرار کیوں کرتے ہیں۔

دیکھئے حدیث وآثار میں بھی تو دیکھا جائے گا۔ شیخ حذیفی نے اپنے ہاتھ سے میدان نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

'اچھا! حدیث وآثار کی بات کرتے ہیں آپ لوگ' ؟ شیخ فولادی فاتحانہ انداز سے مسکرائے۔ بولے: حدیثوں میں تو آپ اور بھی پھنس جائیں گے، یہاں تو واؤ کے عطف کو آگے پیچھے بھی کر لیتے ہیں وہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔ ابن ماجہ تو سنّی حدیث کی کتاب ہے نا! اس میں لکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انمالاتتم صلوۃ لا حدحتی یسبغ الوضو کماامرۂ اللہ تعالیٰ یغسل و جھہ ویدیھہ الیٰ المرفقین ویسمح راسہ ور جلیہ الیٰ الکعبین ،یعنی تم میں سے کسی کی نماز نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس طرح وضو نہ کرے جیسا کہ اللہ نے وضو کا حکم دیا ہے کہ چہرہ اور ہاتھوں کو کہنی تک دھوئے اور سر اور ٹخنوں تک پیر پر مسح کرے۔ بتائیے کیا کہتے ہیں آپ، اب یہاں تو انتشار ضمیر کا مسئلہ نہیں؟ شیخ فولادی مسکرائے، اہل مجلس پر فاتحانہ نگاہ ڈالی پھر بولے، چلئے میں آپ کو ابوداؤد سے بھی ایک حدیث سناتا ہوں تاکہ ضمیر کے ہیر پھیر کی گنجائش ختم ہی ہو جائے۔ ارے بھئی ضمیر تو ہے نا آپ لوگوں کے پاس؟ تو سنئے ابوداؤد میں کیا لکھا ہے: انما لاتتم صلوٰ تکم حتی یسبغ الوضو کماامراللہ عزوجل فیغسل وجھہ وید یہ الی المرفقین ویمسح براسہ ورجلیہ الی الکعبین ،اور یہی روایت نسائی میں بھی آئی ہے، یہ تینوں کتابیں تو آپ ہی لوگوں کے مذہب کی ہیں نا پھر آپ حضرات اپنے عوام کو کیوں نہیں بتاتے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وضو کا حکم دیا ہے اس میں دو غسل اور دو مسح ہے، پیر کا دھونا حکم خدائی کے خلاف ہے۔

چلئے یہ تو وضو کی بات ہوئی، نماز کے بارے میں آپ کیا فرما رہے تھے؟ مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

شیخ فولادی کے چہرے پر ایک بار پھر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری، فرمایا، وہاں بھی انتشارِ بے ضمیر اں کا مسئلہ ہے، ان لوگوں نے دین میں ایسی ایسی بدعتیں ایجاد کیں کہ خدا کی پناہ۔

بدعتیں؟ کمال کرتے ہیں، آپ ماتم کو تو بدعت نہیں کہتے ،اس نوجوان نے اعتراض وارد کیا۔

بولے: وہ لوگ بھلا ماتم پر کیا اعتراض کریں گے جنھوں نے دین میں خودساختہ عبادتیں ایجاد کیں۔

جی ہاں تراویح کو کہیں گے نا آپ میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں، مگر پہلے آپ ماتم کا تو جواب دیں، شیخ حذیفی نے کہا۔

دیکھئے حسین پر گریہ کرنے کے لیے تو ائمہ اہل بیت کی روایتیں ہیں۔

روایتیں تو تراویح کے جواز پر بھی ہیں۔

نہیں ہیں نا یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ خود سنّی کتابوں سے تراویح کا وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ بخاری میں تو اس کے بطلان پر روایتیں موجود ہیں اور سخت وعید ہے، منع کیا ہے جناب رسول اللہ نے تراویح پڑھنے سے، نافلہ کو جماعت سے ادا کرنے پر سختی سے ممانعت کی ہے، مگر آپ لوگ رسولؐ کا حکم مانتے ہی کب ہیں، آپ لوگوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسے سنت مؤکدہ بنا رکھا ہے، صریح بدعت کو سنت کہنا کہاں کا انصاف ہے، بھئی کچھ تو خدا کا خوف کرو۔

آپ کے نزدیک بدعت کی تعریف کیا ہے؟ شیخ حذیفی نے پوچھا۔

وہی جو آپ کے ہاں ہے، چلیئے میں آپ کو ابن تیمیہ کے حوالے سے بتاتا ہوں، انھوں نے الاستقامہ میں بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:فمن دان دیناً لم یا مراللہ و رسولہ بہ فھو مبتدع اوراس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے:(ام لھم شرکاء شرعوا لھم من الدّین مالم یاذن بہ اللہ، شوریٰ ۲۱) یعنی جن لوگوں نے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جس کا خدا اوراس کے رسول نے حکم نہ دیا ہوتو گویا انھوں نے خدا کے علاوہ کسی اور کو بھی شریک بنالیا ہے اور اسے ہی بدعت کہتے ہیں۔ دیکھئے بڑی سخت تعریف کردی ہے ابن تیمیہ نے، یہ کہتے ہوئے شیخ فولادی مسکرائے، بولے: اب آپ لوگوں کے لیے راستہ مزید تنگ ہوگیا ہے، اب بتایئے تراویح کی نماز ایجاد کرنے والے مبتدع (بدعتی) ہوئے یا نہیں؟ پھر وہ خدا کے غضب کے مستحق ہیں یا رحمت کے؟

مگر تراویح تو رسول اللہ سے ثابت ہے، پاس بیٹھے ہوئے نوجوان نے اصرار کیا۔

ثابت ہے؟ شیخ فولادی مسکرائے، بولے:' ارے بھئی یہی تو اہل سنت کے علماء کا پروپیگنڈہ ہے، تراویح کا لفظ نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، آج تک یہ بھی متعین نہیں ہوسکا ہے کہ اس میں کتنی رکعتیں ہیں، کوئی آٹھ کہتا ہے، کوئی بیس اور کوئی چھتیس۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔

چھتیس تو میں نے نہیں سنی۔ ہاں آٹھ اور بیس میں ضرور اختلاف ہے۔ اس نوجوان نے وضاحت کی۔

بولے: اختلاف تو اور بھی بہت سے ہیں۔ سفیان ثوری اور ابوحنیفہ بیس رکعت کے قائل ہیں، امام مالک اہل مدینہ کو چھتیس رکعت پڑھتا دیکھتے ہیں، موطا میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں لوگ تیئیس رکعت تراویح پڑھتے تھے، مروزی نے قیام اللیل کے ذیل میں لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں صلوۃ

التراویح میں تیس مرتبہ سلام پھیرتے تھے، پھر تو ساٹھ رکعتیں ہوئیں لیکن عمر بن عبدالعزیز اس میں شریک نہیں ہوتے۔

مگر عمر بن العزیز تو خدا ترس خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔

بولے: یہی تو لطیفہ ہے۔ تراویح تو عمر بن خطاب نے بھی کبھی نہیں پڑھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بیس رکعت تراویح پر لوگوں کو جمع کر دیا۔ نہ عمر نے پڑھی، نہ عثمان نے، نہ علی نے۔ ابوبکر کے زمانے میں تو خیر سے یہ بدعت جاری ہی نہیں ہوئی تھی۔

عمر نے بھی تو اسے بدعت قرار دیا مگر بدعت حسنہ، اس بہانے لوگ رمضان میں کم از کم ایک بار قرآن ختم کر لیتے ہیں، شیخ حذیفی نے سنّی نقطۂ نظر کے دفاع کی کوشش کی۔

بولے: نیک عمل خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر دین میں اضافہ ہے تو بدعت ہی کہلائے گا۔ یہ بھی محض سنّی پروپیگنڈہ ہے کہ نماز میں ختم قرآن کرنا سنت ہے، احناف کی مشہور کتاب الاختیار لتعلیل المختار میں لکھا ہے کہ قرآن ایک بار تراویح میں ختم کرنا سنت ہے، لیکن یہ دعویٰ سراسر باطل ہے، آپ کوئی حدیث کوئی اثر پیش نہیں کر سکتے، خود سنّی کتابوں میں کثرت سے یہ بات لکھی ہے کہ قرآن کو تراویح میں ختم کرنا سنت نہیں، جب تراویح ہی سنت نہیں تو اس میں ختم قرآن کے سنت ہونے کا سوال کب پیدا ہوتا ہے۔ مدوّنہ الکبریٰ لمالک بن انس میں صاف لکھا ہے کہ ليس ختم القرآن في رمضان بسنة للقيام قرطبی نے جامع الاحکام میں اور قرطوشی نے کتاب الحوادث والبدع میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب تو سنّی حوالے ہیں نا! یہ کہتے ہوئے شیخ فولادی نے مجلس پر ایک نگاہ ڈالی پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ خود اہل سنت کی کتابوں میں تراویح کے بطلان پر اتنی شہادتیں موجود ہیں کہ اگر اہل سنت کے علماء کھلی آنکھوں سے اسے پڑھیں تو ان پر اپنے موقف کا سقم واضح ہو جائے۔

ارے بھئی یہ بات تو شیعہ روایتوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ تناقص اور تناقض کہاں نہیں؟

جی ہاں! مگر ایک کا سقم دوسرے کے سقم کو جواز فراہم نہیں کر سکتا۔ آپ کے ہاں تو اونچی کتابوں میں لکھا ہے، بخاری میں عائشہ سے روایت ہے کہ آپؐ راتوں میں خواہ وہ رمضان کی رات ہو یا عام رات کبھی بھی گیارہ رکعت سے زیادہ نفل نمازیں نہیں پڑھتے تھے۔ بخاری اور مسلم میں تو زید بن ثابت سے ایک تفصیلی

روایت بھی موجود ہے کہ کس طرح رمضان کی ایک رات مسجد نبوی کے اس حصہ میں جسے رسول اللہ نے اپنی نفل نمازوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، وہاں انھیں نماز پڑھتا دیکھ کر کچھ لوگ ان کے پیچھے شریک نماز ہو گئے، جب دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا تو رسول اللہ نے اس عمل کو ناپسند فرمایا اور تیسری رات گھر سے باہر نہ آئے (فلم یخرج الیھم) یہاں تک کہ لوگوں نے شور مچایا اور بعض لوگوں نے تو دروازۂ رسولؐ پر کنکریاں تک پھینکیں (فرفع اصواتھم و حصبوا الباب) ۔آپؐ غصہ کی حالت میں باہر نکلے (فخرج الیھم مغبضا) اور فرمایا کہ تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہیں آتے (مازال بکم صنیعکم) مجھے اندیشہ ہے مبادا تم پر فرض نہ ہو جائے، سو مناسب ہے کہ تم لوگ یہ نماز اپنے اپنے گھروں میں پڑھو۔ اب بخاری کو اصح کتاب بعد کتاب اللہ ماننے والے بتائیں کہ صلوٰۃ نافلہ کے باجماعت ادا کرنے کے جس شوق کی رسول اللہ نے خود سرکوبی کی ہو، اسے گھروں میں پڑھنے کا حکم دیا ہو، پھر ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ امر رسولؐ کے خلاف صلوٰۃ نافلہ کی جماعت پر اصرار کریں اور اسے باعث نجات سمجھیں، ارے بھئی یہ تو خدا کے غضب کو دعوت دینے والا رویہ ہے۔

چلیئے مان لیتے ہیں، تراویح ایجادِ بندہ ہے، بدعت ہے، گمرہی ہے۔ اب عزاداری اور ماتم کے بارے میں بھی اپنے فرموداتِ عالیہ سے نوازیئے، شیخ حذیفی نے بحث کا میدان سے ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

بولے: سید الشہداء کے ماتم پر اعتراض ہے آپ کو، اہل بیت کے مصائب کا تذکرہ آپ کو شاق گزرتا ہے؟ شیخ فولادی نے پلٹ کر وار کرنے کی کوشش کی۔

ہرگز نہیں، میرا سوال صرف یہ ہے کہ تراویح اگر بدعت ہے اور آپ حضرات دین میں کسی نئی بات کو برداشت کرنے کے لیے واقعی تیار نہیں تو پھر عزاداری کی رسمیں، محرم کے جلوس، ماتم، سینہ کوبی، سوز خوانی، شبیہوں اور علم کا برآمد کرنا، ذوالجناح کی تکریم، یہ سب کیا ہے؟ اکثر شیعہ علماء انھیں بدعت کے بجائے مستحب عمل قرار دیتے ہیں، کیا آپ حضرات کو قرآن مجید کی آیت نظر نہیں آتی فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء اللہ غیر مشرکین بہ یعنی بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے پرہیز کرو، صرف خدا کو معبود جانو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو۔

اچھا تو آپ اسے بت پرستی قرار دے رہے ہیں، مشرکین کے بتوں اور عباس کے علم میں آپ کوئی فرق نہیں سمجھتے؟ شیخ فولادی نے پھر حملہ کیا۔ کہنے لگے کون غیور مسلمان ہوگا جس کا دل حسین مظلوم کی شہادت پر

مغموم نہ ہو۔ اپنے شہداء کی یاد میں آنسو بہانا ایک فطری عمل ہے، انسانی ہمدردی اور محبت کا تقاضا ہے۔

'اس سے انکار نہیں لیکن قرآن نے ایسے مواقع کے لیے بھی ہدایات دی ہیں'، شیخ حذیفی نے بتایا کہ احد کے میدان میں رسول اللہ کے چچا حمزہ سمیت ستّر اصحاب شہید ہوئے۔ اس موقع پر اللہ نے آپ کو صبر کی تلقین کی، فاصبر وماصبرك الّا بالله ولا تحزن عليهم، آج بھی جب ہمارا کوئی عزیز رخصت ہو جاتا ہے تو ہم انا لله وانا اليه راجعون کہتے اور رضائے الٰہی پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے کہ ہمیں و بشر الصابرين کے قرآنی وعدے پر پختہ یقین ہے۔ کیا آپ حضرات کو واقعی اس بات کا احساس نہیں کہ آپ لوگوں نے غم حسین کے نام پر دین میں ایسی بدعتوں کو رواج دیا جس نے آنے والے دنوں میں اسلام کی تصویر ہی بدل کر رکھ دی؟ عزاداری کی مجلس، محرم اور چہلم کے جلوس، شبیہیں اور تعزیئے اور نہ جانے کیا کیا، ائمہ کے قبروں کی زیارتیں، نجف سے کربلا تک لاکھوں کا ہجوم اور غلو کا یہ عالم کہ مرقد حسین کی زیارت کے لیے، لوگ پیدل سفر کرنا باعث ثواب سمجھیں، کوئی زمین پر رینگتے ہوئے کاکروچ کی طرح جانے کو زیادہ باعث خیر و برکت سمجھے، اگر یہی اسلام کی تصویر ہے تو یہ حسین کے نانا کا دین تو نہیں۔ اسلام کی ابتدائی تین صدیوں تک کسی ایسے دین کا کوئی سراغ نہیں ملتا پھر اتنے صریح انحرافات کو آپ لوگوں نے مستحبات کے پردے میں کیسے چھپایا ہوا ہے، آپ لوگ اس صورتحال پر زبان کیوں نہیں کھولتے؟

شیخ فولادی اس اچانک حملے کے لئے شاید تیار نہ تھے۔ مدافعانہ لہجے میں بولے: 'دیکھئے بعض چیزیں عوامی جوش وجذبہ کے زیر اثر غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں، انھیں علماء روکتے ہیں۔ مگر جاہل عوام نہ مانیں تو کیا کریں۔ ہر جاہل کے عمل کو شیعیت تو نہیں کہہ سکتے۔

اگر روکتے تو پھر کیا بات تھی۔ روکنے والے تو نکّو بن جاتے ہیں۔ آیت اللہ عظمیٰ محسن الامین نے زنجیر زنی کو روکنے کی کوشش کی، اس کے خلاف فتویٰ دیا، پوری شیعہ قوم، کیا عوام اور کیا خواص، سب کے سب ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے انھیں ناصبی کہا، کسی نے مقصّر گردانا اور کسی نے وہابی اور بطری ہونے کی پھبتی کسی۔ شیعہ دنیا میں لعنت الله علىٰ الامين کے نعرے لگنے لگے۔

بولے: دیکھئے شیخ محسن الامین نے جو زبان استعمال کی وہ بڑی جارحانہ تھی، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ ماتم کا پورا انسٹیٹیوشن (institution) ہی گمرہی پر مبنی ہے۔ آپ بے اعتدالیوں پر تنقید ضرور کیجئے لیکن فی نفسہ ماتم پر نہیں، ماتم کی تو شرعی بنیاد ہے۔

شرعی بنیاد؟ شیخ حذیفی نے حیرت کا اظہار کیا، پوچھا: 'یہ جو میں نے آپ کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں، رسولؐ کا اسوہ پیش کیا، یہ سب مروجہ ماتم کے بطلان کے لیے کافی نہیں؟'

بولے: دیکھئے ہر چیز قرآن مجید میں نہیں ہے۔ حدیث و آثار میں بھی دیکھا جائے گا اور ہمارے ہاں تو ائمہ اطہار کے اقوال بھی حجت ہیں۔

'عجیب! تو ذرا شرعی دلائل پر ہی مطلع فرما دیں'۔ یہ سنتے ہی شیخ فولادی کے چہرے پر مسکراہٹ لوٹ آئی، انھوں نے پہلو بدلتے ہوئے اگلی گفتگو کے لیے خود کو تیار کیا جیسے فریق مخالف کو اپنے علمی پالے (turf) میں لے آئے ہوں۔

بولے: پہلی دلیل تو یہ ہے کہ اویس قرنی کو جب یہ معلوم ہوا کہ احد کی جنگ میں رسول اللہ کے دو دندانِ مبارک شہید ہو گئے ہیں تو وہ اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ انھوں نے اس غم میں اپنے سارے دانت توڑ لیے۔ دوسری دلیل حضرت زینب کے اس اثر سے ہے کہ جب کربلا سے کوچ کرتے ہوئے آپ نے نیزے پر حسین کا سر دیکھا تو انھیں یہ امر شاق گزرا، انھوں نے اپنی پیشانی کو ہودج میں لگی کیل پر دے مارا جس سے ان کی پیشانی سے خون بہنے لگا اور تیسری دلیل قاطع یہ ہے، جیسا کہ زیارت ناحیہ میں لکھا ہے کہ بقول امام مہدی وہ اس واقعہ پر خون کے آنسو روئیں گے۔

اچھا تو یہی ہیں آپ کے ادلّہ شرعیہ۔ تو ان کے جواب بھی سنتے جائیے، اسے کہتے ہیں بھان متی نے کنبہ جوڑا کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا۔ واہ رے دلیل شرعی۔ اب ان دلائل شرعیہ کی حقیقت بھی سن ہی لیں۔ اویس قرنی کا یہ واقعہ امام حلبی کی سیرت الحلبیہ میں اور فریدالدین عطار کی تذکرۃ الاولیاء میں نقل ہوا ہے۔ یہ دونوں سنّی علماء ہیں، صوفی منش لوگ۔ انھیں تو خود اہل سنت بھی مورخ تسلیم نہیں کرتے۔ مگر آپ اتنی دور کیوں جاتے ہیں، آپ کے لیے تو شیخ الصدوق کا حوالہ ہی کافی ہونا چاہیے۔ انھوں نے معانی الاخبار میں لکھا ہے کہ امام باقر سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ کا کوئی دانت شہید ہوا تھا تو انھوں نے فرمایا: 'بخدا ہرگز نہیں، اللہ نے ہمیشہ آپؐ کی محافظت کی'۔ طبرسی نے بھی آبان بن عثمان کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ احد میں نہ رسول اللہ کا دانت شہید ہوا اور نہ ہی آپؐ اپنی حفاظت کے لیے کسی غار میں چھپے۔ اب آیئے سیدہ زینب کے سر سے خون بہنے کی حقیقت کا جائزہ لیتے ہیں، جس سے آپ حضرات تطبیر پر دلیل لاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات جان لیجئے کہ شیعہ محدثین کے نزدیک یہ روایت مرسل ہے۔ شیخ عباس القمی، جو مفاتیح الجنان

کے مولف بھی ہیں، انھوں نے منتھیٰ الاعمال میں صاف لکھ دیا ہے کہ یہ روایت قابل اعتناء نہیں۔ اب رہی امام مہدی کے خون کے آنسو رونے کی بات، تو میرے بھائی زبان کی اتنی شد بد تو آپ بھی رکھتے ہیں کہ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے جو شدت اظہار گریہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ ہے آپ کے دلائل شرعیہ کی حقیقت۔ کاش کہ آپ کو پتا ہوتا کہ دین محمدی کو دین حسینی بنا کر آپ لوگوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

شیخ فولادی شاید اس آخری جملے پر تلملا اٹھے۔ بولے: ارے ابھی آپ نے تو ائمہ اطہار کے اقوال سنے ہی نہیں۔

'ائمہ اطہار کے اقوال آپ مجھ سے سنیں'۔ نہج البلاغہ میں امام علی فرماتے ہیں کہ 'اہل بیت رسولؐ کی طرف دیکھو، ان کی رہنمائی میں چلو کہ وہ تمھیں گمراہ نہ ہونے دیں گے، اگر وہ بیٹھ جائیں تو تم بھی بیٹھ جاؤ، وہ کھڑے ہوں تو تم بھی کھڑے ہو جاؤ ان سے آگے نہ نکلو اور نہ ہی پیچھے چھوٹ جانے والوں میں اپنا شمار کراؤ کہ ایسا کرنا باعث خسران ہے'۔

اچھا تو اب آپ ہمیں نہج البلاغہ بھی پڑھائیں گے؟

ہاں کیوں نہیں، علی پر صرف اہل تشیع کی اجارہ داری نہیں۔ ہم تو آپ کو اہل بیت اطہار کا راستہ دکھا رہے ہیں، آپ وہی کریں جو ائمہ اہل بیت اطہار نے کیا، نہ ان سے ایک قدم آگے بڑھیں اور نہ ایک انچ پیچھے ہٹیں۔ ساٹھ ہجری (۶۰ھ) سے دوسو ساٹھ ہجری (۲۶۰ھ) یعنی بارہویں امام کے غیاب تک، اس دوسو سال کے عرصے میں نو ائمہ اہل بیت زندہ رہے، ان میں سے کسی کو بھی زنجیر زنی، سوز خوانی، جلوس، شبیہ، علم اور ان جیسی دیگر رسومات کے لئے متہم نہیں کیا جا سکتا۔

بارہویں امام کے ذکر پر شیخ فولادی نے عقیدت و احترام سے اپنا دایاں ہاتھ عمامہ تک بلند کیا گویا امام کی آمد پر کھڑے ہونے والے ہوں پھر فرمایا عجل الله تعالیٰ فرجه الشريف سلام الله عليه وروحی له الفداء ایک لمحہ صدر دروازے کی طرف دیکھتے رہے، جیسے قائم کی آمد کے منتظر ہوں۔ پھر کہنے لگے: دیکھئے عزاداری کا ایک سماجی پہلو بھی ہے۔ ہم نے صدیوں سے حسین کے غم کو تازہ رکھا ہے تاکہ اگلی نسلوں کو وہ پیغام منتقل کیا جا سکے جس کے لیے سید الشہداء نے اپنی اور اپنے اہل بیت کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ہر سال عزاء داری کے جلسے جلوسوں میں حسین کے ماننے والے ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا عہد کرتے ہیں۔ ان ہی جلسے جلوسوں اور نوحہ و ماتم کے سبب شہادت حسین کا غم آج بھی تازہ تازہ سا لگتا ہے، یہ فی نفسہ ایک ایسا عمل

ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی۔

عجیب! ایک بدعت کو، جس پر کتاب وسنت اور ائمہ اطہار کے عمل سے دلیل نہیں لاسکتے، آپ نے کتنی خوبصورتی سے حسنِ کارکردگی کا تمغہ عطا کردیا۔ بدعت مستحب عمل قرار پایا۔ پھر اہل سنت کو آپ کیوں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ انھوں نے تراویح کے نام سے ایک نئی نماز ایجاد کی۔ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ اس طرح رمضان مبارک میں ختمِ قرآن کی ایک شاندار روایت قائم ہوگئی ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کرسکتی۔

شیخ حذیفی کی یہ دلیل سن کر شیخ فولادی کچھ جز بز سے ہوئے۔ انھیں ایسا لگا جیسے حساب کتاب برابر ہوگیا ہو۔ بولے: خیر چھوڑیئے ان باتوں کو بارك الله فيك۔

کتنا استحضار تھا ان کے علم میں، سب سے بڑی بات یہ کہ مناقشہ کو حد اعتدال سے گزرنے نہ دیتے، مباحثہ کی حدت کو کبھی اپنی بذلہ سنجی اور کبھی بظاہر شکست سے ٹھنڈا کر لینے کا فن انھیں خوب آتا تھا اور پھر قائم کے تذکرے پر فرط احترام میں عمامہ تک ہاتھ لے جانا، گویا فرطِ ادب میں بس کھڑے ہوا چاہتے ہوں، ان سب باتوں نے ان کی شخصیت میں مقناطیسی کشش پیدا کردی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں شیخ فولادی کی مشایعت میں کسی اور مجلس میں جانکلتا میری یادوں کے سلسلے کو السلام علیکم کی آواز نے یکسر منقطع کردیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ سوٹ میں ملبوس، کانوں تک مفلر لگائے، ہاتھ میں ایک سنہری چھڑی لئے، سامنے سے شیخ سلیمان تشریف لا رہے ہیں۔ کہنے لگے آج فرصت پا کر سیر کے لیے نکلا تھا، شرکاء کا ڈنر آج پتوئی کے ثقافتی مرکز میں ہے، ابھی تو خیر بہت وقت ہے مناسب خیال کریں تو کافی کا ایک پیالہ ہوجائے۔

۱۹

جامِ جمشید

باغات کی دوسری جانب، کاسل کی مرکزی شاہراہ سے متصل قہوہ خانہ پر آج سناٹا سا تھا۔ برآمدے میں پھولوں کی کیاریوں کے بیچ کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے درختوں کی اوٹ سے شام کی دھوپ کچھ اس طرح چھن کر آرہی تھی کہ افق کی تابانی کا اندازہ لگانا مشکل ہورہا تھا۔ دو چار رسمی جملوں کے بعد ہی شیخ سلیمان اصل موضوع پر آ گئے۔ بولے: اس دن طوفان کی رات میں گفتگو ادھوری رہ گئی تھی۔ میں ابھی بھی اس مسئلہ کو حل نہیں کر پایا ہوں کہ Post-Quranic Revelation کے سلسلے میں ہمارا موقف کا ملا استرداد کا ہونا چاہیے یا مکالمہ اور مفاہمہ کا۔ آج کل لبلیانہ میں بہائی مبلغین خاصے سرگرم ہیں، اُدھر سکھ مت جیسے مذاہب ہیں جن کی گرنتھوں میں اسلامی اثرات اور مسلم صوفی بابا فرید کی گونج سنائی دیتی ہے، انھیں کلمۂ سواء کی بنیاد پر آن بورڈ (on board) کیسے کیا جائے؟

میں نے کہا: کلمہ سواء تو اگلا مرحلہ ہے ابھی تو یہی طے نہیں ہو پا رہا ہے کہ بیتِ اسلامی کی دوبارہ تعمیر کیسے کی جائے۔ جب تک ہم خود ایک منظّم اور متحد امت نہیں بنتے دوسروں کو کلمہ سواء پر مجتمع ہونے کی دعوت کس طرح دے سکتے ہیں؟

بولے: 'یہ پہلا کام تو بہت مشکل ہے، اس نے مجھے وطن سے ہزاروں میل دور جلا وطنی کی زندگی جینے پر مجبور کیا ہے۔ جبل النصیری کے وہ علاقے جہاں میرا بچپن گزرا، رجال الدین کی وہ مجلسیں جہاں میرے شعور کو پر لگے، لاذقیہ کا وہ علاقہ جہاں میری چلت پھرت رہی اور بیروت کے وہ قہوہ خانے جہاں میری فکر نے جلا پایا، بڑا رومانس وابستہ ہے ان علاقوں سے لیکن اب میرے لیے وہاں جانا نئے خطرات کو دعوت دینا ہے'۔ شیخ سلیمان کا کرب ان کی باتوں سے نمایاں تھا۔

میں نے عرض کیا: 'آپ رجال الدین کے خانوادے سے ہیں، شام کی موجودہ صورتحال میں علوی۔سنّی منافرت کو کم کرنے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں'۔

بولے: معاملہ اتنا آسان نہیں، علوی اپنے خول سے نکلنا تو چاہتے ہیں لیکن ان کے لیے یہ طئے کرنا بڑا مشکل ہے کہ وہ سنّی اکثریت کے ساتھ جائیں یا اثناعشری شیعیت کے قالب میں پناہ لیں۔ انھیں دونوں طرف سے کھینچا جا رہا ہے، سنّی انھیں سنّی بنانا چاہتے ہیں اور شیعہ ایران اپنی علاقائی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں اپنے دام میں لانا چاہتا ہے۔ کبھی سنّی حلقہ سے فتویٰ آتا ہے کہ علوی مسلمان ہیں اور کبھی اثناءعشری شیعہ ہمارے ایمان کی توثیق کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ تو بڑے مزے کی بات ہے، میں نے مسکراتے ہوئے کہا، جس کے ایمان کی شیعہ اور سنّی دونوں مل کر شہادت دیں اس کا ایمان تو یقیناً پایہ کا ہوگا۔

بولے ہمارے قبائل کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے، آج ہر شخص ہمیں مسلمان قرار دے رہا ہے لیکن ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی استعمار کی آمد سے پہلے تو ہمیں خود کو علویون کہنے کی اجازت تک نہ تھی، عثمانی سلطنت کے دور میں، یعنی چار سو بارہ سال تک ہمیں خود کو علوی کہنے کا حق نہ تھا، ہمیں نصیری سے متہم کیا جاتا۔ ۱۹۳۶ء میں شام کی آزادی کے وقت علوی قبائل اور ان کے مذہبی شیوخ نے اپنے مسلمان ہونے پر اصرار کیا جس کی توثیق سنّی مفتیِ فلسطین حاجی امین الحسینی نے اپنے فتویٰ کے ذریعہ کردی، اُدھر شیعہ حلقوں میں یہ فکر شروع ہوئی کہ ہمیں اثناءعشری شیعہ بنایا جائے۔ ۱۹۴۸ء میں کچھ علوی طلباء نجف کے حوضہ میں داخل ہوئے، ۱۹۵۶ء میں آیت اللہ محمد حسین بروجردی کی کوششوں سے ہمارے نوجوانوں کو اثناءعشری شیعہ عالم بنانے کی کوشش کی گئی۔ دوسری طرف ۱۹۵۶ء میں از ہر کے بعض شیوخ بھی ہمارے علاقے میں پہنچے اور ہمارے بعض طلباء سنّی اسلام کی دانش گاہ میں بھی تعلیم و تربیت کے لیے داخل کئے گئے۔ اس کھینچا تانی میں علویوں کے لیے فیصلہ مشکل ہو گیا کہ ان کا سیاسی اور مذہبی مفاد کس جماعت سے وابستگی میں ہے۔

اب یہ مہم کس مرحلہ میں ہے؟ میں نے شیخ سلیمان سے جاننا چاہا۔

بولے: اب تو سب کچھ شدت پسندوں کے ہاتھ میں ہے، لوگ اس وقت کسی عقلی فیصلہ کے موڈ میں نہیں۔ انھیں ایک طرف سنّی آبادی سے خوف آتا ہے تو دوسری طرف وہ شیعہ ایران کو اپنی آرزوؤں کا محور و مرکز بھی نہیں سمجھتے۔ ایک تیسرا آپشن بھی ہوسکتا ہے جس پر میں مدت سے کام کر رہا ہوں، گو کہ ابھی تک اس کی

قبولیت کے آثار پیدا نہیں ہوئے ہیں۔

وہ آپشن کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے یہی کہ علوی قبائل صدیوں سے جس نفسیاتی خول میں جیتے ہیں اس سے باہر آئیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے امت کے مرکزی اسٹیج پر اپنا رول تلاش کریں۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے، پھر بات آگے کیوں نہیں بڑھتی؟

بولے، کیسے بڑھے، یہ تیسرا آپشن ہی تو غائب ہے، کوئی علویوں کو شیعہ بنانا چاہتا ہے تو کوئی سنّی لیکن مسلمان کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ رجال الدین سے میرا اختلاف اسی بات پر تو ہے کہ وہ ان دو آپشنز کو اسٹریٹجک آپشن کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہماری تاریخ میں ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے لیکن کسی نظری اصلاح کو وہ اس لیے خطرہ تصور کرتے ہیں، انھیں اندیشہ ہے کہ قدماء کی کتابیں اور روایتی تاویلات سے دور ہو کر وہ اپنا تشخص کھودیں گے۔ البتہ پچھلے پندرہ بیس سالوں میں علوی اہل فکر، خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں اس نقطۂ نظر کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ ہم شیعہ یا سنّی گروہوں میں ضم ہونے کے بجائے صرف قرآن مجید کو اپنے نظری محور و مرکز کے طور پر پیش کریں۔ لیکن اس طرح کے لوگ شام سے باہر دور دراز کے علاقوں میں بیٹھے ہیں اور انھیں رجال الدین کی تائید حاصل نہیں ہے۔

مگر آپ نے یہ مشکل راہ کیوں اختیار کی؟ جس قوم کی شیعہ سنّی دونوں حلقے مدارات کے لیے آمادہ ہوں اسے تو اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔

بولے، اب تک ہماری روایتی قیادت اسی اسٹریٹجی پر کاربند رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نظری پراگندگی میں کمی کے بجائے مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ بیروت میں قیام کے دوران اور پھر قاہرہ میں اہل علم سے استفادہ کرتے ہوئے میرے ذہن پر یہی فکر سوار رہی۔ میرا احساس تھا کہ فی زمانہ علوی فرقے نے فوج اور حکومت کا سہارا پاکر سیاسی اور سماجی منظرنامے پر اپنی سبقت بنالی ہے، اگر ان کی نظری اور مذہبی زندگی میں بھی تطہیر و اصلاح کا عمل چل نکلے تو وہ فرقہ وارانہ مخاصمت کے نفسیاتی حصار سے بھی باہر آجائیں گے۔ میں ان کے لیے ایک بہتر راستے کی تلاش میں مسلسل سرگرم رہا۔

پھر آپ کے لیے تو ان دو میں سے کسی ایک کا انتخاب آسان ہونا چاہیے تھا، خاص طور پر اثناءعشری شیعیت آپ کے پرانے نظری قالب سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔

جی ہاں، ابتداء میں، میرا بھی یہی خیال تھا، بیروت اور قاہرہ میں قیام کے دوران میں دونوں حلقوں کے اکابر علماء سے ملتا رہا، میں نے دونوں حلقوں کی اساسی کتابیں بالاستیاب پڑھیں، میں نے جتنا غور کیا مجھے اس امر کا یقین ہوتا گیا کہ علویوں کو ان میں سے کسی بھی فرقے میں داخل کرنا ان پر زیادتی ہوگی، گویا آسمان سے گرے کھجور پر اٹکے۔

کیا مطلب؟ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ حق دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں۔

بولے، افسوس کہ حقیقت یہی کچھ ہے۔

میں نے پوچھا کہ علی کا حوالہ اثناءعشری شیعوں اور علویوں دونوں کے ہاں نقطۂ اتصال ہے، آپ نے راستے کی تلاش میں اس دروازے کو کیوں نہ کھٹکھٹایا۔

بولے، کھٹکھٹایا ہی نہیں بس یہ سمجھئے کہ اندر جا کر واپس آیا ہوں، علویوں کے ہاں علی الوہیت کے حامل ہیں۔ اولاً میں نے سوچا کہ اثناءعشری شیعیت میں اس غلو سے نجات مل جائے گی لیکن جب گہرائی سے شیعہ مصادر کا مطالعہ کیا تو بعض پریشان کن باتیں سامنے آئیں۔

اچھا! وہ کیا؟

دیکھئے سب سے خطرناک بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے امام کے مدارج و مراتب کو متعین کرنے میں اس قدر غلو کیا ہے کہ انھیں نبی کا ہم پلّہ قرار دے ڈالا ہے۔ انبیاء کی طرح ان کے ائمہ پر بھی فرشتے آتے ہیں۔ اس طرح امامت کے پردے میں انھوں نے خاتمیت کی مہر توڑ دی ہے۔ شیخ مفید کہتے ہیں کہ ائمہ کو الہام ہوتا ہے، ان پر فرشتے آتے ہیں، وہ منصوص من اللہ ہیں، وہ ہر اعتبار سے پیغمبر کی مانند ہیں، بس ہم انھیں پیغمبر کہہ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اثناعشری شیعیت میں ائمہ کے اقوال اسی طرح حجت بن گئے ہیں جس طرح رسول اللہ کے اقوالِ ثابتہ یا قرآن مجید کی آیات۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل تشیع کی دینی زندگی اسی طرح اقوال ائمہ کے گرد گھومتی ہے جس طرح سنّیوں کے فقہاء اقوالِ بزرگاں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

'اہل سنت کے نزدیک تو آپ اقوال بزرگان کو مسترد بھی کر سکتے ہیں، ان کے ائمہ اربعہ چونکہ الہام سے متصف نہیں ہوتے اس لیے ہر حال میں ان کی پیروی لازم نہیں'۔

میرے اس جواب پر شیخ سلیمان مسکرائے، بولے آپ شاید سنّی موقف کا دفاع کر رہے ہیں، امر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اوّل تو خالص سنّیت کا کوئی وجود نہیں، اہل تشیع کے عقائد، پنجتن کی فضیلت کی باتیں اور

فاطمی اہل بیت کا تراشیدہ تصور، یہ سب سنّیت کا اس طرح حصہ بن چکا ہے کہ اسے آپ علیحدہ نہیں کر سکتے۔ بخاری میں رسول اللہ کی حدیث خواہ کچھ بھی کہتی ہو سنّی اسے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ قرار دیں گے مگر عمل ابوحنیفہ کے قول پر ہی کریں گے۔ جس طرح بارہ اماموں نے شیعیت کی مذہبی مشین کو متحرک کر رکھا ہے اسی طرح چار سنّی اماموں کے بغیر اہل سنت کی مذہبی زندگی ایک انچ آگے نہیں بڑھتی۔

میرے خیال میں یہ موازنہ درست نہیں، یہ ائمہ فقہاء ہیں، وہ ائمہ منصوص۔

بولے، نام جو بھی رکھیں سنّی اور شیعہ دونوں ہی کی مذہبی زندگی پر ان کے ائمہ کا پہرہ انتہائی سخت ہے، ایک انھیں منصوص گردانتا ہے اور دوسرا بو جوہ انھیں منصوص کہہ نہیں سکتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اسلام ہو یا سنّی اسلام یہ دونوں ہی اپنی اصل سے انحراف کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ ان کی بنیاد وحی کے بجائے تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

متفقہ اور ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر! مثال کے طور پر سنی اسلام کو لیجئے جو ابتداً عباسی شیعیت کے طور پر وجود میں آیا، جس کی اٹھان الرضا من آل محمد کے نعرے پر ہوئی۔ سنّی اسلام میں خلفائے اربعہ کا تصور متوکل کے عہد میں منقح ہوا، فقہائے اربعہ کی مسندیں ملک الظاہر بیبرس کے اجتہاد کے نتیجے میں قائم ہوئیں، چار علیحدہ فقہی مصلّوں کے قیام کی توثیق اشرالملوک چرا کسہ نے کی، حدیث کی بیشتر سنّی کتابیں تیسری چوتھی صدی میں مرتب ہوئیں اور ان کے بارے میں صحاح ستہ کا تقدیسی تصور پانچویں صدی کے اواخر میں ابن طاہر القیصر انی نے وضع کیا۔ کچھ یہی حال اثنا عشری شیعیت اور اسلام کے دوسرے فرقوں کا بھی ہے۔

مگر اہل تشیع کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ان کا اسلام انہیں براہ راست عترت اہل بیت سے ملا ہے، ان کے ہاں بارہ اماموں کا ایک تاریخی تسلسل ہے۔

بولے: اثنا عشری شیعیت بھی خالصتاً تاریخ کی پیداوار ہے۔ دور کیوں جایئے، شیعہ مصادر اٹھا کر دیکھئے۔ حسن عسکری کی موت سے پہلے بارہ اماموں کا کوئی تصور نہ تھا۔ نوبختی کی کتاب فرق الشیعہ اور قمّی کی کتاب المقالات و الفرق، یہ دونوں کتابیں بارہویں امام کی غیبت کے کوئی پچیس سال بعد لکھی گئی ہیں لیکن ان میں غیبت کبریٰ اور صغریٰ کا کوئی تصور نہیں ملتا ہے اور نہ ہی اس بات کا کوئی عندیہ ملتا ہے کہ ائمہ کی تعداد بارہ کے بعد آگے نہیں بڑھے گی۔ بارہ اماموں کا تعین آگے چل کر کلینی (متوفی ۳۲۹ھ)، ابن بابویہ

(متوفی ۳۸۱ھ) اور شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ) کی فراہم کردہ روایتوں کے ذریعے ہوسکا جنہیں ان حضرات نے لوگوں سے سن کر جمع کیا تھا۔ ابتداً یہ سمجھا جاتا تھا کہ بارہویں امام جلد ہی پردۂ خفا سے باہر آئیں گے پھر جب یہ مرحلہ طویل ہوا تو غیبت صغری اور غیبت کبری کا عقیدہ وضع ہوا۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ روایتوں میں مہدی کے حوالے سے شہر سامرا کا تذکرہ ملتا ہے جو ان کی جائے پیدائش بھی ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ بغداد اور سامرا عہد عباسی میں بسائے گئے، جعفر الصادق سے پہلے کے ائمہ تو ان ناموں سے بھی واقف نہ تھے۔

میں نے کہا: جی ہاں اس طرح کے مسائل تو سنّی روایتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اچھا؟ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے بتایا کہ سنّی مآخذ میں مجدد سے متعلق ایک مشہور روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی ہر صدی کے سرے پر اس امت میں سے کسی شخص کو مبعوث کرے گا جو اس دین کی تجدید کرے گا (من یجدد لھا دینھا)۔ اس حدیث کی بنیاد پر علما نے اپنے اپنے پسندیدہ مجدّدین کی فہرستیں مرتب کر رکھی ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ صدی ہجری کا تصور عہدِ رسول میں موجود ہی نہ تھا۔ ہجری کیلنڈر کا اجراء تو عہدِ عمر میں ہوا۔

پھر سنّی علماء اس طرح کی روایتوں کی کیا توجیہ پیش کرتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا۔

وہی جو شیعہ علماء کرتے ہیں۔

یعنی؟

یعنی سکوتِ مقدس۔ اس بارے میں دونوں کا اتفاق ہے کہ جو چیز عقل اور وحی کی میزان پر پوری نہ اترے اس کے علی الا علان استرداد کے بجائے اس پر خاموشی اختیار کر لی جائے یا خوبصورت سی کوئی ایسی فاتر العقل توجیہہ جس سے اپنے فرقے کی بنیاد بچی رہے۔

جی ہاں! آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں بھی طویل غور وفکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ علویوں کے لئے سنّی یا اثنا عشری خیمے میں واپسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ دونوں ہی فرقے آراء الرجال کے اسیر ہیں وحی کی تجلی سے دونوں کا ہی رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔

پھر آپ کے پاس کیا آپشن بچ جاتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ دونوں ہی تراشیدہ شناختوں سے بچا جائے مگر یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ماضی میں جن لوگوں نے ان دونوں شناخت سے بچنے کی کوشش وہ ایک تیسری شناخت کی تخلیق کا سبب

بن گئے۔

کیامطلب؟ میں نے وضاحت چاہی۔

بولے، دیکھئے مسئلہ کاحل تو یہ ہے کہ شیعی اور سنّی شناخت کوڈی کنسٹرکٹ کیا جائے، وحی اور عقل کی روشنی میں ان فرقوں کے نمووارتقاء کا بے لاگ محاکمہ کیا جائے۔لیکن یہ کام چونکہ آسان نہیں اس لیے تجدید واصلاح کی ایک نئی آواز نئے فرقے کی تشکیل کا سبب بن جاتی ہے۔قجر ایران میں بابی تحریک اور برطانوی ہند میں قادیانی دعوت اسی قبیل کی کاوشیں ہیں جو مسئلہ کوحل کرنے کے بجائے اسکی پیچیدگی میں مزید اضافہ کا سبب بن گئیں۔

مگران فرقوں کوتو ہم دائرۂ اسلام سے باہر سمجھتے ہیں۔

سمجھتے رہیں، ہمارے یا آپ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ ان فرمودات یافتوؤں سے مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔اور پھر آپ کسی کونکال کیسے سکتے ہیں دائرۂ اسلام سے؟

کیوں نہیں قادیانی مسئلہ پر تو عالم اسلام کا اجماع ہے، پاکستان کی قومی اسمبلی نے اسے اکثریت سے پاس کیا ہے۔

میری اس دلیل پر شیخ سلیمان مسکرائے۔'ارے بھئی کسی ملک کی قومی اسمبلی کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ کسی کے کفر یا اسلام کا فیصلہ کرے،اور پھر قومی اسمبلی کے جوارا کین ہوتے ہیں،اس میں اکثریت ایسے سیاسی لوگوں کی ہوتی ہے جنھیں دین اوراس کے غایات واہداف کا کچھ پتا نہیں ہوتا'۔

مگراس بارے میں تو رابطہ عالم اسلامی اور دوسرے علماء کے فتاوے بھی موجود ہیں، ساؤتھ افریقہ میں بھی یہ مسئلہ کورٹ میں زیرسماعت رہا ہے۔

بولے:'ارے بھئی یہ سب سیاست کی باتیں ہیں، میں تو خودنصیری علوی فرقہ سے آیا ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ مقامی سیاست کس طرح دین کے نام پر آپ کے گرد گھیرا تنگ کردیتی ہے۔نصیری، دروز، اہل حق کے کفر پر تو مدت سے سنّی اور شیعہ علماء کا اتفاق چلا آتا ہے لیکن جب بھی سیاست کی کوئی نئی بساط بچھتی ہے، سنّی اور شیعہ دونوں علماء ہمارے ایمان کی شہادت پیش کرنے لگتے ہیں۔

مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب آپ کے نزدیک شیعہ اور سنّی شناخت قابل اعتناء نہیں، آپ انھیں ڈی کنسٹرکٹ کرنے کے خواہاں ہیں تو بہائی اور قادیانی جیسے منحرف سلسلوں کے لیے آپ کے ہاں

نرم گوشہ کیوں پایا جاتا ہے۔

اسے نرمی نہیں، نصح و خیر خواہی کہیے، دیکھئے اس تکفیری رویہ نے صدیوں سے اس امت کو تقسیم در تقسیم کی لعنت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک گروہ دوسرے کے نزدیک کافر ہے، دشمنِ اسلام ہے اور اس سبب واجب القتل بھی۔ حالانکہ یہ سب اسی مشن کا حصہ ہیں جس کی ابتداء محمد رسول اللہ نے کی تھی۔ متّبعینِ محمد کا یہ قافلہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سمتوں میں جا نکلا۔ کوئی شیعہ کہلایا تو کوئی سنّی، کوئی اباضی کہلایا تو کوئی اسماعیلی، کوئی نصیری کہلایا تو کوئی دروزی۔ کسی نے بہائی شناخت اختیار کی تو کسی نے قادیانی۔ اب اگر اس امت کی دوبارہ شیرازہ بندی کرنی ہے تو لازم ہوگا کہ اہلِ قبلہ کے تمام ہی گروہ ایک دوسرے کو ضال و مضل کہنے کے بجائے اپنے اپنے انحرافات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ ہم یہ نہ بھولیں کہ ہماری اصل ایک ہی ہے۔ خدا کی کتاب اور رسول کی ذات ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔

پھر ہونا کیا چاہیے، آپ کے پاس کیا منصوبہ ہے؟ میں نے شیخ سلیمان کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے کیا دیکھتے ہیں کہ علی کودرا ہماری جانب چلے آ رہے ہیں۔ آج ان کے ہاتھ میں ململجے تھیلے کے بجائے ایک خوبصورت چرمی بیگ ہے، دوسرے ہاتھ میں انھوں نے ایک ٹیب(tab) تھام رکھا ہے، چہرہ پر بشاشت سے اندازہ ہوتا تھا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر آئے ہوں۔

ماشاءاللہ شیخ الطائفہ بھی یہاں موجود ہیں، انھوں نے علیک سلیک کے بعد شیخ سلیمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

خیریت ہے؟ کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے میں نے پوچھا۔

بولے، ارے بھئی پورے دس دنوں کے بعد میرا گمشدہ سامانِ سفر آج مجھے ملا ہے، آج دوپہر ائیر لائنز والے پہنچا گئے ہیں۔

اچھا تو آپ کا سامان کہیں گم ہو گیا تھا؟ پھر تو آپ بڑی مصیبت میں رہے ہوں گے۔

بولے کچھ زیادہ نہیں، اب یہ پتا چلا کہ آپ سامان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں، یہ خواہ مخواہ کی آلائش آپ نے لگا رکھی ہے۔ البتہ اس دوران اس tab کی کمی بہت محسوس ہوتی رہی، کودرا نے کہا۔

جی ہاں آپ تو ٹیب(tab) ہی کی وجہ سے جنگل سے واپس آئے ہیں کہ ادھر سگنل نہیں ملتا۔

جی ہاں کیا بتاؤں، ادھر سگنل نہیں ملتا اور ادھر دل نہیں ملتا۔ دیکھنے میں تو ایک چھوٹا سا ڈیوائس ہے

لیکن ایک معجزہ سے کم نہیں، خیر چھوڑیئے ان باتوں کو آپ لوگ اپنی گفتگو جاری رکھیں، شیخ سلیمان بڑے گہرے آدمی ہیں۔

اچھا تو آپ لوگ ایک دوسرے سے پہلے سے واقف ہیں؟

میرے اس سوال پر کودرا مسکرائے، بولے مدت سے نہیں، ازل سے۔ ہمارے علمی سفر میں ایک طرح کی مماثلت ہے، شیخ سلیمان شیعہ غلاۃ کے حلقہ سے نکلے اور میرا بچپن سنّی نقشبندی اسلام کے ماحول میں گزرا۔ البتہ عزت بیگووچ کی شاگردی کا شرف ہم دونوں کو حاصل ہے۔

ماشاءاللہ یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے پھر تو شاید آپ کو اس منصوبہ سے بھی اتفاق ہو جو امت کی تعمیر نو کے سلسلے میں شیخ سلیمان نے تشکیل دیا ہے اور جس پر وہ ایک عرصہ سے کار بند ہیں۔ یہ سن کر کودرا کے چہرے کا رنگ اچانک متغیر ہونے لگا، بولے: شیعہ سنّی مفاہمت کی بات کر رہے ہیں نا آپ؟

ایں خیال است محال است جنوں،

یہ لوگ ہمیں کبھی نہیں اٹھنے دیں گے، سنّی اپنی سنیت کو خیر باد نہیں کہہ سکتے اور شیعہ اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکتے، دیدو نے کیا کچھ نہیں کیا، وہ یہی تو چاہتے تھے کہ یوروپ کے عین قلب میں بوسینا کی شکل میں خالص اسلام کی ایک شمع روشن ہو لیکن انھیں اس مقصد کے لیے دوبلین کی مسلم آبادی اور پچاس سے زائد مسلم ملکوں سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ دنیا بھر سے جو لوگ وہاں مالی یا عسکری مدد لے کر پہنچے وہ اسے یا تو سنّی اسلام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے یا شیعہ اسلام کی ریاست۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا کا خواب گہنا گیا۔

'سلیمان! کتنے عظیم تھے دیدو۔ اللہ نے انھیں کیسا قلبِ خاشع عطا کیا تھا۔ فرقہ پرست مسلم حکمرانوں اور تنگ نظر علماء نے ان کی قدر نہ جانی'، یہ کہتے ہوئے کودرا روہانسے ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ دیدو کے ذکر پر شیخ سلیمان کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے کو سنبھالا، بولے: کودرا تب سے اب تک حالات خاصے بدل گئے ہیں، یہ جو آپ کے ہاتھ میں معلومات کا سمندر ہے جسے آپ جام جمشید کی طرح لئے پھرتے ہیں، انٹرنیٹ کی اس نئی دنیا نے افہام وتفہیم کے نئے امکانات روشن کیے ہیں، اب نہ تو حکمرانوں کے بس میں ہے کہ وہ کسی علمی مناقشہ پر پہرہ بٹھا سکیں اور نہ ہی فرقہ پرست علماء کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی مکالمے کو اپنی قیل وقال سے روند ڈالیں۔ وہ دن گئے جب فرقے اپنی متنازع کتابیں چھپائے رکھتے، ایک واقعی مکالمہ اور محاکمہ کی دنیا تو اب وجود میں آئی ہے۔ دیدو اگر آج زندہ

ہوتے تو انھیں اس آلہ سے بڑی مدد ملتی۔ دنیا کو معلوم ہوتا کہ بوسنیا کی چھوٹی سی ریاست میں وہ متحدہ اسلام کی شمع کس طرح روشن کرنا چاہتے تھے۔

کودرا کی زبان سے نکلا: سلیمان! شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں، اللہ دیدو پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

کودرا کی مخالفت میں اب پہلی سی شدت نہ تھی، بولے، ایک دوسرا پہلو بھی تو ہے، تشویشناک پہلو، دونوں طرف کے فرقہ باز مولوی جو ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں، اب یوٹیوب پر شب و روز برسر پیکار ہیں، نفرتوں کے کاروبار میں مسلسل شدت آرہی ہے، ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن، کفر و گمرہی کے فتوے اور محاربے کی دعوت میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

جی ہاں یہ ایک بڑا چیلنج ہے مگر مسئلہ کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ نئی نسل ان یکطرفہ بیانات پر یقین کرنے کے بجائے از خود حقائق سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے جب سے میں نے باہمی مفاہمہ کی مہم چلائی ہے عرب و عجم، روم و امریکہ میں نوجوانوں کی قابل ذکر تعداد فرقہ وارانہ تنگ نظری کو ترک کرنے اور باہمی منافرت کی فضا سے باہر آنے کے لیے بیتاب نظر آتی ہے۔ حکومتیں پریشان ہیں، علماء کے روایتی حلقے متوحش ہیں کہ معلومات کی اس شاہراہ پر نئی نسل ان کی ایماء کے بغیر بڑھتی چلی جاتی ہے، برف پگھل رہی ہے، اس پروسس کو روکنا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔

سورج غروب ہونے کو تھا، بورل کے آسمان پر سرمئی بادلوں نے سنہری قبا پہن لی تھی، دور درختوں کے پیچھے دریائے ڈراوا کے اس پار سنہری کرنوں کی ناقابل بیان لہریں موجزن تھیں، بورل میں غروب آفتاب کا لطف یا تو پائیں باغ سے مشاہدے میں نظر میں آتا ہے یا پھر میرے کمرے کی اس کھڑکی سے جو اس جانب کھلتی ہے۔ کوئی بیس پچیس منٹ حظ کی ایک ناقابل بیان کیفیت سے آپ دوچار رہتے ہیں۔ میں نے علی کودرا اور شیخ سلیمان کو الوداع کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ خیال آیا کل شام ڈھلے روانگی ہے کیا پتا کہ غروب آفتاب کا یہ دلفریب منظر پھر دیکھنے کو ملے نہ ملے۔

آج بستر میں لیٹتے ہوئے ایک بار پھر عبدالوہاب آفندی یاد آئے۔ وہ متنازع کتابیں جو سقوط بغداد کے وقت دریائے دجلہ میں نابود نہ ہوسکیں اور جنھیں قلعۂ الموت میں عطا ملک جوینی کی مداخلت بھی ضائع نہ کرسکی اور وہ گمراہ کن کتابیں جنھیں صاحب بن عباد کے کتب خانے پر غزنوی کا حملہ بھی تباہ نہ کرسکا۔ یہ زہریلا

مواد کس طرح صدیوں سے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو مہمیز کرتا رہا ہے۔ آفندی کہتے ہیں کہ گمراہ کن بیانات ایک بار ضبط تحریر میں آ جائیں تو پھر وہ پیچھا نہیں چھوڑتے، صدیوں تعاقب میں لگے رہتے ہیں۔ ابتدائی عہد کے مسلمان اس رمز سے واقف تھے اور شاید اسی لیے وہ روایات و آثار کو ضبط تحریر میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ اب تو تاریخی بیان ہی نہیں علماء و ذاکرین کی معجز بیانیاں بھی بڑی تیزی کے ساتھ یوٹیوب ویڈیوز میں محفوظ ہوتی جا رہی ہیں۔ پتا نہیں آگے کیا ہونے کو ہے۔ سلیمان تو بڑے پر امید ہیں کہ نئی نسل معلومات کے اس لامتناہی سمندر سے بالآخر گہر ریزے جمع کر لے گی۔ اگر واقعی ایسا ہو سکا تو اہل سنت کے نوجوان تمام شیعہ مخالف پروپیگنڈوں کے باوجود اس امر پر آگاہ ہو جائیں گے کہ اہل تشیع بھی اسی نبوی مشن کا حصہ ہیں جن کے ہاں اہل بیت کی محبت میں قدرے شدت پائی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ کا نیا ٹول انھیں بآسانی اس بات پر آگاہ کر سکے گا کہ روایت کی تمام سنّی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ شیعہ موقف کی حدیثیں موجود ہیں بلکہ شیعہ راویوں پر اعتماد کیے بغیر سنّی محدثین کی گاڑی آگے نہیں بڑھتی۔ کوئی ایسی سنیت جو شیعہ مداخلت سے ماوراء ہو اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف اس بات کا بھی واضح امکان ہے کہ اہل تشیع کے نوجوان اس حقیقت کا ادراک کر سکیں کہ کتب اربعہ، نہج البلاغۃ اور تفسیر و تعبیر کے شیعی لٹریچر میں حضرت علی اور دوسرے ائمہ، خاص طور پر امام باقر اور امام جعفر سے کثرت سے ایسے اقوال منقول ہیں جو شیخین کی عدالت اور کبار صحابہ سے حضرت علی کے خوشگوار تعلقات اور ان حضرات کی ہاشمی و اموی خاندانوں میں باہمی رشتہ داریوں پر شواہد فراہم کرتی ہیں۔

۲۰

Never Again!

صبح ناشتہ کی میز پر فالح مل گئے۔ بولے آج آرٹ ایگزبیشن کا افتتاح ہے، انتظامی معاملات میں کچھ ایسا پھنسا کہ بس کچھ دیر پہلے فارغ ہوا ہوں۔ مشرق وسطیٰ سے بعض نامور مصوروں کی شرکت ہو رہی ہے، نمائش کا مرکزی موضوع احتجاجی آرٹ ہے۔ میری پینٹنگ کے بعض نمونے بھی نمائش میں رکھے گئے ہیں۔ ضرور تشریف لائیے گا۔

وقت مقررہ پر نمائش گاہ پہنچا۔ مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ فالح کی ان پینٹنگ کو دیکھوں جن کے بارے میں انہیں شکایت ہے کہ ان میں مسکراہٹ طلوع ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ استقبالیہ پر مارلن مل گئیں۔ آج کچھ زیادہ مصروف دکھائی دے رہی تھیں، انھوں نے گلے میں کیمرہ حمائل کر رکھا تھا، ایک ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ اور دوسرے میں قلم تھاما ہوا تھا۔ ان کے اردگرد تین چار لڑکیاں تھیں جنھیں وہ بعض انتظامی معاملات سمجھا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے آوازہ بلند کیا۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگیں، معاف کیجئے گا اس نمائش کے اہتمام میں کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ آیئے میں آپ کو نمائش دکھاتی ہوں، کہاں سے شروع کروں؟

میں نے کہا بوسنیائی آرٹ کے نمونے جہاں رکھے ہوں، پہلے ادھر چلیں۔

بولیں: ہاں ہاں، وہاں تو میری بھی کچھ پینٹنگز آویزاں ہیں۔

آپ مصوری بھی کرتی ہیں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

بولیں، جی ہاں بوسنیائی رفیوجی کیمپوں میں میری پینٹنگ کی ابتداء ہوئی، پھر یہ شوق مسلسل جلا پاتا رہا۔ کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں رنگوں سے اظہار اضطراب کا کام لیتی ہوں، میری تصویریں فنی اعتبار سے شاید اتنی بلند نہ ہوں لیکن سولوشن اورینٹڈ (solution oriented) ہوتی ہیں۔

نمائش کے بوسنیائی حصہ میں فالح موجود تھے۔ یکے بعد دیگرے کوئی آدھی درجن تصویریں صرف مسکراہٹوں کی تھیں، معصوم طفلانہ چہرے جن پر مسکراہٹ کمہلا گئی ہو۔ ایک پینٹنگ میں چاہ زنخداں بھی دکھایا گیا تھا لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ وہ رومانی مسکراہٹ سے پیدا ہونے والا گڑھا نہیں بلکہ بندوق کی گولی کا نشان ہو، ناقابل مندمل نشان۔ میں نے فالح سے پوچھا، کہ آپ بجھی ہوئی مسکراہٹ، کمہلائے چہرے، نامراد خواب عمداً پینٹ کرتے ہیں یا مسکراہٹ کی گرفت میں نہ آنے کے سبب ایسا ہوتا ہے؟

بولے: ایک کرب ہے شاید جس پر قابو پانے میں میں اب تک ناکام ہوں، ابتداً سب کچھ ٹھیک چلتا ہے۔ لیکن نہ جانے کب، کس لمحہ کوئی غیر مرئی قوت برش کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی ہے، پھر میرا اختیار نہیں رہتا۔

بوسنیائی نمائش سے متصل شامی فنکاروں کی کچھ پینٹنگس آویزاں تھیں۔ تمّام عزام کی ایک پینٹنگ میں گولیوں سے چھلنی اور دھماکوں سے مجروح ایک عمارت دکھائی گئی تھی؛ ایک بلند وبالا عمارت بیرونی دیوار کے جابجا ڈھے جانے سے اپنے مکینوں کو پرائیویسی اور تحفظ فراہم کرنے سے عاجز تھی۔ سارہ شمع کی ایک تصویر میں زنجیروں سے لٹکے ہوئے حالت تعذیب میں ایک ایسے نیم برہنہ نوجوان کو دکھایا گیا تھا جو ان سخت ترین لمحات میں بھی اپنے ہاتھوں کو بلند کئے ہوئے نئے انقلاب کی دعوت دینے پر مصر تھا۔ ایک دوسرے آرٹسٹ کی تصویر میں، جس کے نام کا آخری حصہ غالباً مراد تھا، ایک ایسی مسخ شدہ دوشیزہ کی تصویر دکھائی گئی تھی جسے دعا کے لیے ہاتھ میسر نہ تھے۔ یہ سب تازہ ترین فن پارے تھے جو شام کی موجودہ خانہ جنگی کے خلاف بطور احتجاج وجود میں آئے تھے۔

دوسری جانب بلا دشام کے ان معصوم بچوں کی پینٹنگس آویزاں تھیں جو اب لبنان اور ترکی کے مہاجر کیمپوں میں محرومی اور بے بسی کے دن گزارنے پر مجبور ہیں۔ ایک تصویر میں داعش کا سیاہ جھنڈا آویزاں تھا، پس منظر میں ایک طفل معصوم دیوار پر لکھی اس تحریر کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا، جس کا اشارہ غالباً داعش کی طرف تھا: 'لوگو! میری کتاب کو بے روح اور سپاٹ لفظوں کے مجموعے کے طور پر مت پڑھو --- تمہارا خدا'۔ ایک تصویر میں ایک بوسیدہ چہار دیواری پر تحریر تھا: اجاك الدور يا دكتور، یعنی ڈاکٹر اب تمہاری باری ہے۔

بسا اوقات الفاظ میں بارود بھرے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسی ایک جملہ نے ملک شام کی ٹھہری پرسکون زندگی کو ایک ایسے تغیر اور حادثہ سے دوچار کر دیا جس نے دیکھتے دیکھتے ملک کی تصویر ہی بدل کر رکھ دی۔

'آپ کو معلوم ہے اس جملہ کا خالق کون ہے؟ چودہ سال کا ایک لڑکا جس نے فروری ۲۰۱۱ء کے وسط میں اسکول کی دیوار پر یہ جملہ لکھ دیا تھا۔ دوسرے دن اس دیوار کو دیکھنے کے لیے ایک خلقت امڈ پڑی۔ میں چند ماہ پہلے اس لڑکے سے ویانا میں مل کر آئی ہوں'، مارلن نے بتایا۔

نائف ابازید کی بات کر رہی ہیں آپ؟ میں نے پوچھا۔

جی ہاں، بڑا معصوم سا لڑکا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ بقول اس کے: دوستوں نے کہا لکھ دو، میں نے لکھ دیا، مجھے کیا پتا کہ اس جملہ سے اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہوگا کہ ملک تہہ وبلا ہو جائے گا، چار لاکھ لوگ لقمۂ اجل بن جائیں گے۔

مگر اس میں ایسی کیا بات تھی؟ اور یہ ڈاکٹر کون ہے؟ فالح نے پوچھا۔

تمہیں نہیں معلوم! بشار الاسد صدر بننے سے پہلے آنکھوں کے ڈاکٹر تھے۔ سیاست میں تو یہ اتفاقی طور پر آئے۔ اگر ان کے بڑے بھائی کی موت نہ ہوتی تو شاید انہیں والد کی جانشینی کا موقع نہ ملتا۔

اچھا پھر تو بڑا خطرناک جملہ لکھ دیا تھا لکھنے والے نے، فالح نے کہا۔

جی ہاں! خاص طور پر عرب بہار یہ کے ان ایام میں جب تونس میں بن علی کی حکومت گر چکی تھی، مصر میں انقلاب کے نعروں نے مبارک کی مستحکم حکومت کی بساط لپیٹ دی تھی، اس پر آشوب ماحول میں کسی چودہ سالہ طالب علم کا یہ لکھنا کہ 'ڈاکٹر! اب تمہاری باری ہے'، ایک نعرہ انقلاب سے کم نہ تھا۔ بشار حکومت ہی کیا اس وقت تمام ہی عرب حکمرانوں پر لرزہ طاری تھا۔ اس پر مستزاد اسکولی طلباء کی اس معصومانہ شرارت کو سیکوریٹی اہلکاروں نے اپنے احمقانہ فعل سے ایک انقلابی تحریک میں تبدیل کر دیا۔

اچھا وہ کیسے؟

کہتے ہیں کہ نائف ابازید سے تفتیش کے نتیجہ میں ۲۳ طلباء کو گرفتار کیا گیا، ایک ماہ تک انھیں عقوبت گاہوں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب ان بچوں کے والدین سیکوریٹی افسر عاطف نجیب کے پاس اپنی فریاد لے کر گئے تو اس کا کہنا تھا کہ ان بچوں کو اب بھول جاؤ، نئے بچے پیدا کرو۔ اور اگر تم لوگ اس پر قدرت نہیں رکھتے تو جاؤ اپنی بیویوں کو ہمارے پاس بھیج دو، ہم انہیں حاملہ کر دیں گے۔ کہتے ہیں کہ نجیب کے اس جملہ نے درعا کے چھوٹے سے شہر میں آگ لگا دی۔ مظاہرے ہوئے، گولیاں چلیں، لاشیں گرتی رہیں، جنازوں کے جلوس میں شدت آتی گئی، لوگوں کے دلوں سے خوف نکل چکا تھا۔ مظاہرہ، موت اور پھر مظاہرہ کے اس سلسلے کو

روکا نہ جاسکا۔

ایک دوسری مصوری میں پتھر کی ایک لوح پر یہ لکھا دکھایا گیا تھا: 'النصیریة العلویة کفار زنادقة مرتدون باجماعِ علماء الأمة الجهاد والقتال ضد النصیریة والشیعة الروافض فرض عین علیٰ جمیع المسلمین'۔ لوح کے نیچے امریکہ اور اسرائیل کے قومی نشانات ثبت تھے جس سے شاید یہ تاثر دینا مقصود ہو کہ امت کی باہمی خانہ جنگی کا یہ منصوبہ دراصل دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

بائیں جانب ایک دوسری مصوری میں حضرت زنیب کے مزار کے خلاف مدرسہ بیت الثورہ کو برسرِ پیکار دکھایا گیا تھا۔ تصویر میں بیت الثورہ کی بمباریوں سے زینبیہ کے مینارے منہدم ہو چکے تھے جس کی مدافعت میں چھوٹے چھوٹے فوجی دستے اپنی پیشانیوں پر یا زینب کی پٹیاں لگائے حرم زینب کی طرف بڑھتے دکھائے گئے تھے۔ ٹوٹے مینارے سے ذرا دور شہداء کے تابوت پر لبیک یا زینب کے سبز بینر پڑے تھے۔

ایک دوسری تصویر میں ایک بہت بڑے کینوس پر دمشق کی مسجد اموی کے پس منظر میں آگ اور خون کا منظر تھا جس نے سینا گاؤگ اور چرچ ٹاور کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ شاید یہ ملک شام کے اس تکثیری معاشرے کا نوحہ تھا جس میں مدت سے عیسائی، یہودی، مسلمان اور دوسری اقوام اب تک ہنسی خوشی رہتے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دمشق اور حلب دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہیں، مسجد اموی مسجد میں تبدیل ہونے سے پہلے ایک کیتھیڈرل تھی۔ یہاں آج بھی John the Baptist کا سر مدفون ہے۔ عیسائی معبد بننے سے پہلے اس جگہ ایک رومی طرز کا معبد تھا جسے جوپیٹر کا مندر کہتے تھے اور اس سے بھی پہلے یہاں حداد کا مندر تھا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دمشق عیسائی اکثریت کا شہر تھا، پھر نزاری شیعہ اور کروسیڈرس کا سل اس کی شناخت بن گئے۔ صلاح الدین ایوبی اور ممالیک کے زمانے میں یہاں اہل سنت کی بالا دستی قائم ہوئی جسے عثمانی ترکوں نے چار سو سال تک برقرار رکھا۔ فی زمانہ شام کی آبادی پینسٹھ فیصد سنّی، دس بارہ فیصد علوی، دس فیصد کرد اور بقیہ دروز، اسماعیلی، اثناءعشری شیعوں اور ترکمان وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مصور نے دراصل مسجد اموی کے اس تکثیری ماضی اور بلادشام کی اس بوقلمونی کا نوحہ لکھنے کی کوشش کی تھی۔

ایک طفلانہ پینٹنگ جو فن سے کہیں زیادہ پروپیگنڈے کا درجہ رکھتی تھی، ایک ساتویں جماعت کے طالب علم نے بنائی تھی۔ ایک عمامہ بند عالم کے ہاتھ میں دستی لاؤڈ اسپیکر تھما یا گیا تھا جس میں وہ پکار رہے تھے: 'حيّ علیٰ الفتنه! اقتلو الشیعة والعلویین الروافض، تسقط ایران المجوسیة الصفویة، یسقط

النظام العلوی النصیری، یسقط حزب الله'۔ طالب علموں کی مصوری میں پیغام کہیں واضح تھا، بڑے فنکاروں نے اس کرب پر اپنے فن کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ ایک آئل پینٹنگ میں دو تین ایسے نفوس دکھائے گئے تھے جن کے سر پلاسٹک بیگ سے ڈھکے تھے؛ سپاٹ انسانی چہرے، خیال سے عاری اور کسی بھی قسم کے تاثر سے محروم۔ نیچے لکھا تھا: فرحانین اور پھر دو تین سوالیہ نشان لگا دیئے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ عالم عرب کے اکثر ملکوں میں عرصہ سے نظام جبر کے تحت رہنے کے سبب لوگ اپنے دل کی بات کہنے پر قادر نہیں ہوتے۔ اگر آپ کسی عرب سے اس کی خیریت پوچھیں گے تو وہ فی الفور یہی جواب دے گا کہ سب ٹھیک ہے، ملک بھی ترقی کر رہا ہے، لوگ بھی خوش ہیں، بڑے عظیم ہیں ان کے حکمراں۔ کسی نئے ملک میں عرب شہری کو یہ یقین کرنے میں سال دو سال لگ جاتے ہیں کہ اب وہ اپنے ملک سے باہر ہے، دل کی بات زبان پر لا سکتا ہے اور اتنے عرصہ کے بعد بھی وہ دل کی بات زبان پر لانے سے پہلے احتیاطاً ادھر اُدھر دیکھے گا پھر دبی زبان میں کلام کرے گا، زور سے بولنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

ہر پینٹنگ اپنی جگہ ایک نوحۂ دلگیر تھی۔ ایک شفاف کینوس پر انسانی ہیولے کو اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ چہرے کے نیچے جسم کا حصہ تحلیل ہوتا نظر آتا تھا؛ جبڑے مسخ ہو کر خون اور گوشت کے ریزوں کی شکل میں زمین پر گرتے دکھائے گئے تھے۔ چند لمحے اس مسلسل مسخ ہوتے ہوئے نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اذیت آپ کے وجود میں سرایت کر رہی ہو۔ تعذیب کی اتنی بھیانک اور اتنی پر اثر تصویر کشی کے نمونے مجھے اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے گو کہ مجھے مختلف ہالوکاسٹ میوزیم میں جانے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ وہاں بالعموم دروازے پر لکھا ہوتا ہے Never Again۔ ملک شام سے آنے والی اذیت کی دلگرفتہ داستانیں انسانی تاریخ کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ رہی ہیں، ہر روز ایک نئے طریقۂ تعذیب کی خبر آتی ہے۔ لیکن یہاں Never Again کا کوئی سائن نظر نہیں آتا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اسلام کی مرکزی سرزمین پر مخالفین کے لیے تعذیب کے جو طریقے رائج ہیں ان کے مقابلے میں موت ایک بہت چھوٹی سی سزا معلوم ہوتی ہے۔ موت ہے بھی بڑی خوبصورت سی چیز، اس کے حسن پر قدرت نے پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ عقوبت گاہوں میں پھنسے ہوئے انسانوں کو اگر اس کی اصل حقیقت کا اندازہ ہو جائے تو وہ زندگی کا حوصلہ کھو دیں۔

حلب پر بمباری اور اس کی تباہی کی ڈرون تصویریں تو میں نے پہلے بھی دیکھیں تھیں، ایسا لگتا تھا

جیسے ہزاروں سال قبل مسیح کا کوئی شہر ہو، ویران اور بے آباد خرابہ۔ آج اسی منظر کو تمام عزام کی ایک پینٹنگ میں منعکس دیکھ کر بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ان خرابوں سے صرف وحشت ہی ہویدا نہ تھی بلکہ مستقبل کی ساری امید دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

شامی حصہ سے نکل کر ہم لوگ مرکزی لابی میں پہنچے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا تھا، مارلن کا اصرار تھا کہ روانگی سے پہلے میں اس کی بعض پینٹنگس کو ضرور دیکھوں۔ معاصر آرٹ کے حصہ میں کینوس پر ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ لکھا تھا: 'شجر زقّوم'۔ ایک بڑے تناور درخت کے نیچے چند ٹیڑھے میڑھے انسانی ہیولے کچھ اس طرح پریشاں حال پڑے تھے جیسے ابھی ابھی درخت سے ٹوٹ کر گرے ہوں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اب بھی اس درخت کی مختلف شاخوں سے بہت سے انسانی نفوس لٹکے ہوئے ہیں۔ اپنے لباس اور چہرے بشرے سے یہ سب مذہبی شخصیات معلوم ہوتی تھیں، کسی کے سر پر عمامہ تھا تو کسی کے سر پر عربی غوترہ۔ درخت کے دونوں طرف مختلف انسانی گروہوں کو جنگ وجدل میں مصروف دکھایا گیا تھا۔ بات کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یورپ کی تیس سالہ مذہبی جنگ کے تناظر میں عالم اسلام کی موجودہ کشمکش پر کوئی تبصرہ ہو۔

'یہ آپ نے اللہ والوں کو درخت کی شاخوں سے کیوں لٹکایا ہوا ہے؟' میں نے مارلن سے احتجاج کیا۔

بولی: دراصل جے کیلو (Jacques Callot) کی مشہور زمانہ پینٹنگ کو میں نے ایک نیا تناظر فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیلو کی تصویر میں مذہبی تنازعوں کے نتیجے میں عام لوگوں کو درختوں سے لٹکایا دکھایا گیا ہے جب کہ ہماری مصوری میں مذہبی تنازعات کو ہوا دینے والے لوگ اس انجام کو پہنچے ہیں۔

یہ تو بڑا ریڈیکل سولوشن ہے، انسانی زندگی اتنی سادہ اور آسان نہیں۔

بولی: کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ یورپ جس مذہبی جنگ میں سترہویں صدی میں مبتلا تھا اور جس میں یورپ کی ایک تہائی آبادی لقمۂ اجل بن گئی، آج عالم اسلام کچھ اسی کیفیت سے دوچار ہے، عالم اسلام کو بھی آج پیس آف ویسٹ فالیا (Peace of Westphalia) کی ضرورت ہے، یعنی فرقہ پرست، تنگ نظر اور خون خرابہ کو ہوا دینے والی دنیادار مشائخیت سے نجات۔

مارلن! ویسٹ فالیا بھی تو ایک اسطورہ ہے۔ اور جن مشائخ کو آپ درخت پر لٹکانا چاہتی ہیں وہ بھی ایک اسطوری طرز فکر کے شکار ہیں، تعذیب خواہ اہل مذاہب کی طرف سے ہو یا ریاستی مشنری کی طرف سے، ہر

حال میں یکساں قابل مذمت ہے۔

مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ بین المسلکی منافرت کے بیج کون بوتا ہے؟ کیتھولک چرچ اور پروٹسٹنٹ فرقہ کے مختلف دھڑوں نے مذہب کا سہارا لے کر ہی تو اہل یورپ کو تیس سال تک مسلسل کشت وخون میں مبتلا رکھا۔ آپ ان کے جرم کی سنگینی کو کیسے کم کر سکتے ہیں۔

ارے بھئی! معاملہ کسی کو مجرم قرار دینے کا نہیں بلکہ کشت وخون کو روکنے کے لیے ایک مؤثر اسٹریٹجی کی تشکیل کا ہے۔ صحت مند مکالمہ کے لیے ضروری ہے کہ فریقِ مخالف کے نقطۂ نظر کو ہمدردانہ طور پر سمجھا جائے۔ سترہویں صدی کے یورپ میں اگر کیتھولک علماء پروٹسٹنٹ فرقہ کو قابل گردن زدنی سمجھتے تھے تو اس کی وجہ ان کا مذہبی طرز فکر تھا، آج بھی اگر مسلمانوں کے مختلف دھڑے ایک دوسرے کے خون کو مباح سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا منحرف مذہبی نقطۂ نظر ہے۔

پھر آپ کے نزدیک اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ فالح جو بڑی دلچسپی سے ہماری گفتگو سن رہے تھے، انھوں نے پوچھا۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ شیعہ اور سنّی دونوں فرقے جن تراشیدہ تاریخی واقعات کے اسیر ہیں ان کے سحر سے دونوں کو نجات دلایا جائے۔ سانحۂ قتل عثمان سے امت پر جس شبِ تاریک کی ابتداء ہوئی تھی شہادتِ حسین نے اس کی سیاہی میں مزید اضافہ کر دیا۔ رہی سہی کسر تاریخی بیانیوں نے پوری کر دی۔ تاریخ وتعبیر کی کتابوں میں گمراہ کن بیانات اس طرح سمو دیئے گئے گویا یہ مذہبی کتابیں نہ ہوں بارود بھرے ہوئے خودکش اسلحے ہوں۔ جب تک دونوں فرقے زہریلے بیانات کو اپنے مذہبی ڈسکورس سے خارج نہیں کرتے اور جب تک خدا کی منزل کتاب متبعینِ محمدؐ کے لیے واحد حوالہ نہیں بنتی، میرے عزیز! میں نے فالح کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا 'تمہاری مصوّری میں فطری مسکراہٹ واپس نہیں آسکتی'۔